ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
عتیق الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں غلامی کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی اور تحقیق سے کی گئی ہے قیمت ہے

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام

اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہر آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متصوفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے قیمت عہ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں کے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریریں جنھیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے مع بسوط مقدمہ از مترجم قیمت ہے

اسلام کا اقتصادی نظام

ہماری زبان میں پہلی عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کرکے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے۔ طبع ثانی میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں۔ ان اضافوں کے بعد کتاب کی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب ۱۹۴۲ء کے سیٹ میں بھی دی گئی ہے۔ قیمت ہے

۱۹۴۰ء

نبی عربی صلعم

تاریخ ملت کا حصۂ اول جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرت سرورِ کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق، جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں اور قرآن پاک کا صحیح منشا معلوم کرنے کیلئے شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ احادیث کی تدوین کس طرح اور کب ہوئی، یہ کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ قیمت عہ

غلامانِ اسلام

بچھتر سے زیادہ ان صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہاء، و محدثین اور اربابِ کشف و کرامات کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل کے بیان پر پہلی عظیم الشان کتاب، جس کے پڑھنے سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ قیمت صہ

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کی روشنی میں اصولِ اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواعِ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے ضابطہ ہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح کی گئی ہے۔ قیمت صہ

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی۔ قرول باغ

برہان

جلد سیزدہم　　　　　　　　　　شمارہ (۱)

رجب ۱۳۶۳ھ مطابق جولائی ۱۹۴۴ء

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں دینیات کو فنون (Arts.) اور سائنس کی طرح ایک مستقل فیکلٹی کی صورت دیدی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اس کے نصاب اور اس سے متعلق دوسرے امور پر غور و غوض کرنے اور ان کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی بنادی گئی ہے جس میں ہندوستان کے بعض نامور علماء بھی شامل ہیں۔ اگرچہ یونیورسٹی کو یہ کام اب سے بہت عرصہ پہلے کرنا چاہیئے تھا۔ تاہم کوئی اچھا کام جب کبھی ہو جائے بہرحال اچھا ہی ہے۔

باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں سرسید نے عربی زبان اور علوم مشرقیہ کی سخت مخالفت کی تھی۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے گزٹ میں کئی پرزور مقالات لکھے تھے جن کے جواب میں مولانا شبلی نے قلم اٹھایا اور الندوہ میں سرسید کی تحریروں کا مدلل و مسکت جواب دیا۔ لیکن سرسید جس پالیسی کے حامی تھے آخر کار وہی غالب ہو کر رہی موصوف انگریزی حکومت، انگریزی تہذیب و تمدن اور مغربی علوم و فنون کا اس درجہ مرعوب تھے کہ ان کی نظر میں مسلمانوں کی نجات کا واحد راستہ یہی تھا کہ مسلمان جس طرح بھی ہو انگریز نہیں تو انگریز نما بن جائیں اور ان کا دل و دماغ افرنجیت کے سانچہ میں اس طرح ڈھل جائے کہ انھیں "صاحب" کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور ان کی ہی طرح رہنے سہنے میں نہ صرف یہ کہ عار محسوس نہ ہو بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے آقایانِ سفید فام کی نقالی کو اپنے لئے سرمایۂ فخر و مباہات سمجھیں۔

ممکن ہے سرسید نے یہ نظریہ سچ مچ مسلمانوں کی خیر خواہی کی نیت سے قائم کیا ہو۔ لیکن اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ سرسید کی اس غلط پالیسی نے مسلمانوں کو صدیوں پیچھے پھینکدیا۔ حکومت سے محروم ہونے اور ناگفتہ بہ حالات میں طوقِ غلامی کے گلے میں پڑجانے کے باعث مسلمانوں کے دلوں پر جو زخم تھے اور جن کی ہلکی ہلکی ٹیس ان میں خودی کے جذبہ و احساس کے حفظ و بقا کی ضامن تھی وہ رفتہ رفتہ مندمل ہونے لگے اور آخر کار وہ وقت آیا

کہ مسلمان سرکاری عہدوں اور دفتری ملازمتوں کے طلسم فریب میں مبتلا ہو کر اپنے اصل مقام کو بالکل فراموش کر بیٹھا۔ مسلمانوں کی اشک شوئی کے لئے سرسید نے عربی اور فارسی کی بھی کرسیاں رکھیں لیکن یہ سب کچھ محض دکھاوے کے لئے تھا اور رہا تھا ورنہ مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے بانی کا اولین مقصد یہی تھا کہ مسلمان انگریزی بولیں۔ انگریزی پڑھیں۔ انگریزوں سے سوشل تعلقات پیدا کریں۔ ان کی طرح رہیں سہیں اور دفتری ملازمتوں پہ زیادہ سے زیادہ قبضہ کرلیں۔ اور بس!

حضور کا ارشاد ہے "الحق یعلو ولا یُعلیٰ" سچ خود بخود بلند ہوتا ہے بلند کیا نہیں جاتا۔ انگریزی تعلیم کی ابھی ایک نسل ہی ہوئی تھی کہ خود سرسید کے شاگردوں اور ان کے مخصوص صحبت یافتہ لوگوں میں ایسے دیندار مسلمان پیدا ہوگئے جنھیں سرسید کی تعلیمی پالیسی کی غلطی مہر نیمروز کی طرح آشکارا ہوگئی اور انھوں نے بین طور پر اسے محسوس کرلیا کہ ان کے استاد نے مسلمان نوجوان کے لئے انگریزی تعلیم کا جو راستہ تجویز کیا ہے وہ ان کی قومیت، مذہبیت اور اسلامی ذہنیت کے لئے بیحد خطرناک ہے۔ اس سے ان کے دماغ مسموم، اعضا مفلوج اور دل ناکارہ و پست ہمت ہو کر رہ جائیں گے۔ ان حضرات نے اس زہر کا تریاق مہیا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً سرگرم مساعی کیں لیکن جہاں اکثریت دوسرے طبقہ کی ہو وہاں ان بیچاروں کی کون سنتا پھر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ جب کبھی ہو سکا اور جس قدر بھی ہو سکا یہ اصلاحی آواز بلند کرتے رہے۔

اس طبقہ کی انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ جہاں کا طالب علم کبھی اردو زبان میں گفتگو کرنے اور اردو کتاب کے پڑھنے کو اپنی توہین سمجھتا تھا وہاں اب اردو کا کامیاب شعبہ قائم ہے اور اردو کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو میں ایم۔ اے بھی ہے اور پی۔ ایچ ڈی بھی۔ جس مسلم درسگاہ کا طالب علم نماز روزہ کا مذاق اڑانے میں بیباک اور جری تھا اب اس کے در ودیوار عودالی الاسلام Back to Islam کے نعروں سے گونج رہے ہیں اور جس کے طلباء کو کانٹ، شوپنہار اور برگسے کے خیالات و آراء کے سمجھ لینے پر فخر و غرور تھا اب انھیں غزالی و رازی کا فلسفہ پڑھنے کا شوق ہو رہا ہے۔ جو طالب علم کل تک صرف دوسروں کی تاریخ کے پڑھ لینے کو اپنا سرمایۂ کمال سمجھتا تھا اب اس میں خود اپنی تاریخ کے اوراقِ پارینہ کے مطالعہ کا ذوق پیدا ہو رہا ہے اور یہی کا نتیجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفہ دونوں کو مستقل

مضمون کی حیثیت سے شریکِ نصاب کرلیا گیا ہے۔ پھر صاحب کی تقلید میں یہاں تعطیل بجائے جمعہ کے اتوار کو ہوتی تھی۔ اس کی بھی اصلاح کی گئی اور اب یہاں تعطیل جمعہ کو ہی ہوتی ہے۔

انھیں اصلاحی مساعی کا اک ثمرِ خوش گوار ہے کہ اب یہاں دینیات کو ایک فیکلٹی کی شکل میں قائم کیا جارہا ہے ہم اس اقدام پران حضرات کو مبارکباد دیتے ہیں جن کی کوششوں اور جن کے اشتراکِ عمل سے ایسا ہوسکا ہے لیکن ان حضرات کو باور کرنا چاہئے کہ ابھی ان کی منزلِ مقصود بہت دور ہے۔ ان چند تغیرات اور اصلاحی ترمیمات سے مسلمانوں کی صحیح قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوجاتا۔ آپ صورت بدلنے کے لئے تو سب کچھ کررہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان نوجوان کا دل بدلنے اور اسے عقیدہ اور عمل دونوں حیثیتوں سے سچا مسلمان بنانے کے لئے بھی آپ نے کچھ کیا ہے؟

تعلیم سے زیادہ ضروری اور مقدم واہم صحیح تربیت اور دماغی پرورش ہے۔ ورنہ جہاں تک محض تعلیم کا تعلق ہے آپ کو غیر مسلموں میں بھی ایسے افراد ملیں گے جو نہ صرف عربی زبان وادب کے فاضل ہیں بلکہ اسلامی فقہ اور دینیات میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور یہ ذہنی تربیت اور صحیح دماغی نشوونما پیدا ہوتی ہے صحیح ماحول سے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا ماحول اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ خود اساتذہ اور حکام یونیورسٹی عملاً اسلامی تہذیب وتمدن۔ اور اسلامی روایاتِ مذہبی واخلاقی کے پیکر نہ ہوں۔ یاد رکھئے! ہماری قومی تعلیم کا صحیح نمونہ صرف وہی مسلمان نوجوان ہوسکتا ہے جو ایک طرف کیمسٹری۔ طبعیات۔ عملی سائنس پولٹیکل ہسٹری، ریاضیات، اقتصادیات وغیرہ مغربی علوم میں کسی سے کم نہ ہو اور دوسری جانب اس کا دل اور دماغ۔ اس کا رجحانِ طبعی اور اندازِ فکر سلفِ صالحین کی طرح پکا اور سچا مسلمان ہو۔ ایک طرف وہ لیبورٹری میں بیٹھکر کیمسٹری کی مشکل گتھیاں سلجھائے اور دوسری جانب وہ مسجد میں عام مسلمانوں کے دوش بدوش خدائے واحد کی بارگاہ میں سراپا خشوع ونیاز بنا کھڑا ہو۔ مسلمانوں نے پہلے اسی طرح "خرقہ وسجادہ" کے ساتھ "شمشیر وسنان" کو جمع کرکے دنیا کو فتح کیا تھا اور اب بھی وہ اسی طرح اپنے مستقبل کو عہدِ ماضی کا آئینہ دار بناسکتے ہیں۔

نظریۂ موت اور قرآن

از مولانا سید ابوالنظر رضوی

(۵)

اب صرف دو چیزیں ایسی باقی رہ جاتی ہیں جن پر مجھے کچھ اور بھی کہنا چاہیے۔ ایک یہ کہ عالمِ برزخ کہاں ہے دوسرے یہ کہ اس کی زندگی خواب سے کہاں تک مشابہ ہے اور کہاں تک نہیں۔

اگر مجھے تو یہ پر مجبور نہ کیا جائے تو مجھے کہدینا چاہیے کہ ہر عالم اس ہی عالمِ مادی کی پست و بلند فضاؤں میں پایا جاتا ہے۔ خواہ ہم وہاں ارضی قانونِ حیات کے تحت زندگی نہ گذار سکیں تو یوں یہ چیز یاد رکھیے کہ میں فضا کی وسعتوں کے چاروں طرف کوئی دائرہ نہیں بنا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ فضا کی وسعت بلندی اور گہرائی کہاں تک ہے۔ مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ خدا کا تختِ جلال آسمان و زمین ہے۔ کرسیہ السموات والارض اس سے اوپر کوئی دنیا نہیں ہو سکتی۔

سائنس فضا کی جو حد و دبتاتی ہے وہ انسانی پرواز کا منتقطہ ہے۔ فضا کی سرحد نہیں۔ بہر حال کوئی حد کیوں نہ ہو، حد ایک ہی ہوگی اور وجود و ہستی کا ایک ہی دائرہ۔ وجود کی کوئی نوع اس سے باہر نہیں ہو سکتی۔ ہماری مادی فضا ہی کو دیکھ لیجیے جس کی وسعت بھی محدود ہے جو ہمارے علم و اطلاع سے بھی باہر نہیں اور جس کا تقاضہ اپنے مقامِ وجود پر قبضہ رکھتے ہوئے دوسرے وجود کو داخلہ کی اجازت نہ دینا ہے۔ کیا وہ ذراتِ ریگ، فولادی ذرات، ہوا، ایتھر انحرافی خطوط کے تحت گوناگوں شعاعوں، برقی لہروں، آوازوں، خیالات کی موجوں، حرکات و اعمال کی تصویروں غرضکہ حقائق سے لبریز نہیں اور کیا کوئی وجود دوسرے وجود کو فنا کر سکتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے کچھ اس طرح جگہ پیدا کی گئی ہے کہ دوسرے عالم کے لئے

بھی گنجائش میں کمی نہ ہو سکی۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس ہی فضائی دائرہ یا اس سے بالاتر دوائر میں دوسری مستقل یا غیر مستقل کائناتی زندگیاں نہیں ہو سکتیں۔ عالم برزخ کہاں ہے؟ عالمِ مثال کے ایک گوشہ میں۔ عالمِ مثال کہاں ہے اس ہی دنیا کی سرحدات میں۔ عالمِ مثال مستقل قوانین رکھتے ہوئے بھی زیادہ تر عکوس و ظلال ہی جذب کرتا ہے۔ لیکن برزخ کے لئے نتائج کی اشکال اور عرفی تعبیرات مقدر کر دی گئیں دونوں میں ایک نوع کی مغائرت ہے اور ایک قسم کی یگانگت۔ اگر کوئی نقطۂ اتحاد نہ ہوتا تو صوفیا، تخیلی قوتوں کو نشوونما دیتے ہوئے دیگر مکاشفات کے ساتھ ہی کشفِ قبور کا فنی مظاہرہ نہ کر سکتے تھے۔

دراصل انسانی فطرت کا اقتضا یہ ہی ہے کہ زندگی کے انقلابات کے لئے ایک ہی عالم، ایک ہی فضا اور ایک ہی دائرہ ہونا چاہئے۔ سائنٹفک ریسرچ، روحانیین کے مشاہدات اور مذہب کے دعاوی بھی نشاۃ ثانیہ سے پہلے ہر عالم کو نشاۃِ اولیٰ ہی سے وابستہ کرتے ہیں۔

فلاسفہ اور ہندو جوگیوں کو ایک ہی دائرہ میں گوناگوں انقلاباتِ حیات کے مشاہدہ نے تناسخ کے فریبِ تخیل میں پھنسا دیا۔ اس حد تک ان کا اولین تاثر غلط نہیں کہ تنزلات کی آغوش میں وجود بھی ایک ہی ہے اور دائرہ بھی ایک ہی۔ لیکن ثانوی تاثرات میں جب پہلے تاثرات کی طرح ہی حقیقی اور سچے تھے انھوں نے ٹھوکر کھائی۔ زندگی کے حقائق اولی اور ثانوی مدارج رکھتے ہیں، ہر غذا اور دوا کا بھی ایک فعل اولی ہوتا ہے ایک فعل ثانوی اور ہر عمل ہر خیال کا بھی ایک فوری نتیجہ ہوتا ہے اور کچھ دوررس نتائج جو اس کا فعلِ ثانوی ہے۔ یہ ہی رنگ ہر چیز کا ہے۔ گویا کہ سارے وجود ہی کو "مثانی"[1] کی بولتی ہوئی تصویر کہنا چاہئے۔

---

[1] علم مثانی کو قرآن نے خصوصیاتِ نبوی میں بھی شمار کیا ہے "ولقد اٰتینٰک سبعًا من المثانی" اور متشابہات کی صفت بھی "مثانی" ہی بتلائی گئی تھی۔ کتابًا متشابھًا مثانی۔ لیکن تعجب ہے کہ آج تک مفسرین نہ اس کے صحیح معنی متعین کر سکے نہ آخری اور متفقہ فیصلہ تک ہی رسائی ہو سکی۔ میں اس موضوع پر ایک مستقل مضمون لکھ رہا ہوں جس میں متشابہات کا مفہوم ان کی افادیت پر بحث کرتے ہوئے "مثانی" پر بھی گفتگو کی جائے گی یہاں "مثانی" پر اتنا ہی کہنے کا حق تھا جتنا کہ آپ مطالعہ کر چکے ہوں گے لیکن ان معانی کو قرآنی مفہوم نہ خیال کیجئے۔ (ابوالنظر رضوی)

اسلام اس حقیقت کا ترجمان تھا اس لئے مجدد صاحبؒ اور شاہ صاحب اپنی تصانیف میں بیان کر سکے۔ غیر مسلم روحانیین شمعِ راہ اور رہنما رکھتے تھے۔ راستہ سے بھٹک گئے۔ زندگی کا آغاز و انجام ایک ہی دائرۂ حیات کی گردش کے نام ہیں۔ سمت بدل سکتی ہے دائرہ کا مرکز نہیں بدل سکتا یعنی برزخ اس ہی کائنات کا ایک معنوی عالم ہونا چاہیئے۔

دوسری بات جس پر مجھے کچھ عرض کرنا چاہیئے برزخ اور خواب کی مماثلت اور عدم مماثلت ہے شاید آپ نے زندگی کے اس پہلو پر غور کیا ہوگا کہ اگرچہ لذت و غم احساس ہی کا مظاہرہ ہے لیکن حواس اثر پذیر ہونے کے لئے نمود و نمائش اور اشکال کے محتاج ہیں اور شکلیں تین طرح پیدا ہوتی ہے۔ نتیجہ میں عمل سے مکمل ربط رکھتے ہوئے جیسے محنت سے سرمایہ اور عیش، یا عکس و ظل سے یا محض تمثیل کے رنگ میں۔ عکس کا برزخ میں سوال ہی کیا؟ چیز ہی کونسی ہے جس کا فوٹو اتارا جائے تمثیلی اشکال، عمل کا مظاہرہ نہیں کہلائی جا سکتیں۔ مثال، ذہنی صفات کے ایک لیے ذہنی تصور کا نام ہے جو تجربات کی بنیاد پر کسی چیز سے منسوب کر دیا گیا ہو۔ اب شکل سازی کے لئے عرفی تعبیرات ہی رہ گئیں اور وہ ہی ہماری زندگی کا قانون کہلائی جا سکتی ہیں۔ ہم جب کبھی کسی کو محنت و کارکردگی پر آمادہ کریں گے تو ان ہی تعبیرات کا نقشہ کھینچا جائے گا۔ عمل کا قدرتی نتیجہ عرفی تعبیرات کے سوا کچھ نہیں اگرچہ یہ تعبیرات بھی مثالی شکل کے سوا کچھ نہ ہوں۔ جیسے صفراوی بخار میں دردِ سر اور آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے دیکھنا۔ بیداری میں بھی عیش، بہترین کوٹھی، چمن، خدمت گاروں، حسین عورتوں اور شوخ و شنگ منچلوں ہی کے روپ میں نمایاں ہوتا ہے اور خواب میں بھی۔ لذت و غم کی ہزارہا اشکال بیداری میں بھی پیدا ہوتی ہیں اور خواب میں بھی۔ یہ ہی وہ مماثلت ہے جس نے عرفی تعبیرات اور وہمی تماثیل کے ڈانڈے ملا دئے۔ اگر آپ عرفی تعبیرات کے ذریعہ سمجھانا چاہیں تب بھی درست ہوگا اور اگر عمل و نتیجہ کے قدرتی ربط کو زندہ رکھتے ہوئے خواب سے سمجھانے کی کوشش کریں جو عرفی تعبیرات ہی کا سطحی تشابہ رکھنے والا ایک مختصر سا نمونہ ہے۔ تب بھی وہ غلط نہ ہوگا بلکہ سمجھانے کے لئے بہت مناسب۔

قرآن نے بھی ایک طرف مظاہرۂ اعمال کا دعویٰ کیا اور دوسری طرف اسے موت کی نیند سے وابستہ. جو لازمی طور پر خواب نہ سہی. خواب کی قسم ضرور ہو جائے گا۔ اور برزخ کی یہ ہی حقیقی نوعیت بھی تھی۔ تمثیل کی آپ کتنی ہی اقسام بنا لیجئے بہر حال اس سے گریز ممکن نہیں۔ انسان تمثیلی فطرت پر ہی پیدا کیا گیا تھا۔ اور آج بھی اس ہی فطرت کا تقاضہ پورا کرتے ہوئے ہر چیز کو تمثیلی رنگ میں سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

شعر و ادب، تجارت، تاریخ، سیاست، مذہب اور تمدن و معیشت وغیرہ غرضکہ زندگی کے کسی پہلو میں اُسے تمثیلی اشکال کے بغیر متاثر نہیں کیا جا سکتا. تفصیل کے لئے مستقل موضوعِ بحث کی ضرورت ہو گی۔ بلکہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ شعراء کے دواوین، ترقی پسند، اور رجعت پسند ادیبوں کے افسانے، تجارتی پروپیگنڈا، مصور تاریخیں، تمدنی فلم سازیاں، بت گری، تعزیہ پرستی، مقبرے یہ سب کیا ہیں۔ جذبات اور خیالات کی تمثیل اور فوٹوگرافی۔ ایک حد تک فطرت کا مطالبہ پورا کرنے کے لئے اسلامی نظام نے بھی اجازت دی تھی لیکن حدود سے تجاوز کرنے والے طبائع قید و بند سے آزاد ہو گئے۔ آج علمی ارتقا اس نقطہ سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ جو تمثیلی فطرت پر نفسیاتی، شعوری، اخلاقی اور معاشی فطرت کو غلبہ دے سکیگا۔ لیکن پھر بھی زندگی کے کسی گوشہ میں تمثیلی فطرت کو نمایاں ہونے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ ہاں سمت تبدیل کی جا سکتی ہے۔ آپ سنیما میں عریانی کے بجائے اخلاقی کیرکٹر پیش کر سکتے ہیں تمثیل نگاری، مصوری اور فلم سازی کو دفن نہیں کر سکتے۔ اس ہی تمثیلی فطرت اور تمثیلی قانونِ حیات نے نتائج عمل کے لئے تمثیل سازی کا نفاذ کیا تھا۔ جس کی بہترین نمائش گاہ کا نام عالم برزخ ہے ورنہ بیداری و خواب کی دنیا بھی تمثیلات اور اشکال ہی سے معمور تھی۔ برزخ اپنی تعبیرات میں خواب کی تمثیل سازی سے کہاں تک ہم آہنگ ہے اور کہاں تک نہیں اسے بھی سن لیجئے۔

حسب ذیل پہلو دونوں کے یکساں ہیں۔

(۱) خواب کا لذت والم جس طرح بیرونی دنیا سے وابستہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے ہی دائرہ تخیل کی

پیغام" (قاضیون ۲۱: ۱۳) کو قبول کرکے بنی اسرائیل کے پاس آئے تو بنی اسرائیل نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ان کی خوب خاطر مدارات کی اور ان سے بڑی ہمدردی ظاہر کی کہ ناحق آپس کی لڑائی میں اتنا کشت و خون ہوا۔ اب سب سے پہلے بنی اسرائیل کو یہ فکر پڑی کہ بنی بنیمین کی ساری عورتیں تو ہم نے مار ڈالیں اب ان کے لئے بیویاں کہاں سے مہیا کریں تاکہ ان کی نسل منقطع نہ ہو۔ آخر کار یہ تدبیر سمجھ میں آئی کہ جب بنی بنیمین پر لشکر کشی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور سارے بنی اسرائیل کے فرقے ایک جگہ ان سے جنگ کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے تو اس وقت ایک قبیلہ یبیس جلعاد نامی لڑنے کے لئے نہ آیا تھا پس یہ جرم کافی تھا۔ لہذا یہ کام کیا جائے کہ اس پر فوج کشی کرکے جتنی کنواری لڑکیاں ان کی مل سکیں پکڑ لائیں اور لاکر بنی بنیمین کی خدمت میں پیش کردیں تاکہ بیچارے بنیمینوں کے کچھ تو آنسو پچھیں اور وہ سمجھیں کہ واقعی ہمارے بھائی ہمارے حقیقی اور سچے ہمدرد ہیں کہ ہمارے لئے بیویاں فراہم کردیں ۔۔۔ (بنی اسرائیل نے اپنی بیٹیاں انھیں اس لئے نہ دیں کہ انھوں نے قسم کھائی تھی کہ "ہم اپنی بیٹیاں جورو کرنے کو انھیں نہیں دیں گے۔" قاضیون ۲۱: ۷)

چنانچہ بنی اسرائیل نے فوراً بارہ ہزار بہادروں کا ایک لشکر جرار تیار کیا اور انھیں یہ حکم دیکر روانہ کردیا کہ "یبیس جلعاد کے باشندوں کو جاکے عورتوں اور بچوں سمیت قتل کرو اور یہ وہ کام ہے جس کا تم کو کرنا ضرور ہے کہ سارے مردوں اور ان عورتوں کو جو مرد سے ہمبستر ہوئی ہوں ہلاک کردینا" (قاضیون ۲۱: ۱۰)

چنانچہ غازیانِ نامدار کا یہ لشکر جرار بے خبر اور غافل یبیس جلعاد کے باشندوں پر جا پڑا۔ ان میں انھیں کُل چار سو کنواری عورتیں جو مرد سے ناواقف تھیں ملیں (قاضیون ۲۱: ۱۲) انھیں وہ غازی پکڑ لائے اور لاکر بنی بنیمین کے سپرد کردیا۔ (قاضیون ۲۱: ۱۴) لیکن مشکل اب بھی آسان نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ کنواریاں ان لوگوں کے لئے کافی نہ تھیں اور ضرورت اور باقی رہ گئی (قاضیون ۲۱: ۱۴) چنانچہ بوڑھے بوڑھے بزرگ آدمی پھر جمع ہوئے اور سوچنے لگے کہ اس مشکل کا حل کیا اختیار کیا جائے؟ آخر کار ایک لاجواب ترکیب ان کی سمجھ میں آئی اور وہ یہ تھی کہ سیلا میں کے مقام پر جو ایک مذہبی میلہ لگتا ہے اور عورتیں اور مرد خداوند کی عید منانے کے لئے جمع ہوتے ہیں وہاں بنی بنیمین انگوری باغوں کے درمیان گھات میں

بیٹھ جائیں اور سیلا میں کی بیٹیوں پر اچانک حملہ کر کے جو عورت جس شخص کو پسند آئے وہ اسے بلا تامل اپنی بیوی بنالے اور اپنے ملک کو لے جائے۔ (قاضیون ۲۱: ۲۰-۲۱) جب ان عورتوں کے باپ بھائی ہمارے پاس فریاد لائیں گے تو ہم کہہ دیں گے کہ بھئی جانے دو۔ ان پر ہماری خاطر مہربانی کرو۔ (قاضیون ۲۱: ۲۲) آخر کسی نہ کسی کو تم اپنی بیٹی دیتے ہی اور پھر جہیز اور سامان بہت کچھ ساتھ دینا پڑتا۔ شکر کرو سستے ہی چھوٹ گئے۔ بنی بنیمین کو اس کار خیر میں کیا تامل ہو سکتا تھا چنانچہ انھوں نے اپنے بھائیوں کے کہنے پر عمل کیا اور نہایت انصاف کے ساتھ اپنے شمار کے موافق ان میں سے جو ناچتی نکلی تھیں جنھیں پکڑ لیا تھا ایک ایک نے اپنے لئے جورو لی (قاضیون ۲۱-۲۳) اور فائز المرام خوش خوش اپنی تباہ شدہ بستیوں کو روانہ ہوگئے اور ان کی مرمت کر کے ان میں بس گئے (قاضیون ۲۱: ۲۳) اور اس طرح اس قضیہ نامرضیہ کا بڑی خوش اسلوبی سے خاتمہ ہوگیا۔

دیکھا آپ نے "حسن سلوک" اور "رواداری" کی کتنی حیرت انگیز مثالیں بنی اسرائیل کی تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

بنی اسرائیل کا جو سلوک اپنوں اور غیروں سے تھا اس عجیب و غریب حکایت کے بعد اسکی اور مثالیں دینے کی اگرچہ قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن اب ذکر چلا ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ ان کے لئے حکم تھا کہ "جب تو اپنے ہمسائے کے تاکستان میں داخل ہو تو جتنے انگور چاہے اپنی خوشی سے کھا"۔ (استثنا ۲۳: ۲۴) یعنی دوسرے کے مال پر دست تصرف دراز کرنے کے لئے مالک کی مرضی اور اجازت کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جتنا چاہو کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ۔ کتنی محبت، ہمدردی اور رواداری کی تعلیم ہے۔

اس سے اگلی آیت میں جو حکم دیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ پر لطف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "جب تو اپنے ہمسائے کے کھیت میں داخل ہو تو اپنے ہاتھ سے (جتنی چاہے) بالیں توڑ لے مگر کھیت کو ہنسوے سے مت کاٹ" (استثنا ۲۳: ۲۵) دیکھئے کس قدر رعایت ہے کہ چاہے ہاتھ سے توڑ توڑ کر تمام کھیت کا ستیاناس کر دے مگر اتنا احسان کھیت والے پر ضرور کر کہ درانتی سے کھیت کا صفایا نہ کر۔ آپ ہی انصاف سے فرمائیے کہ اس سے زیادہ مہربانی اپنے بھائی اور ہمسائے کے ساتھ اور کیا ہو سکتی ہے اور

یہ مہربانی ایسی عظیم الشان ہے کہ کھیت والے جس قدر بھی شکریہ ادا کریں تھوڑا ہے۔

ناظرین! ذرا انصافاً غور فرمائیں کہ یہ دونوں حکم کس قدر فساد انگیز ہیں۔ اگر آج دنیا میں یہودیوں کی حکومت قائم ہو جائے اور ان کی شریعت کے مطابق احکامات جاری ہوں تو ملک کس قدر فتنہ و فساد لڑائی جھگڑے اور قتل و غارت کا آماجگاہ بن جائے۔

یہودی کس قدر ذلت کے ساتھ دوسری قوموں کو دیکھتے تھے؟

یہودی اپنے آپ کو جتنا معزز، جس قدر محترم اور جیسا قابل تکریم سمجھتے تھے اور دوسری قوموں کو جتنا ذلیل جس قدر کمینہ اور جیسا قابل نفرت سمجھتے تھے اس کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے کتاب استثنا کے چودھویں باب کی اکیسویں آیت پڑھئے۔ لکھا ہے۔

"جو حیوان آپ سے مر جائے تم اسے مت کھائیو، تو اسے کسی پردیسی کو جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو دیجیو تاکہ وہ اسے کھائے یا کسی اجنبی کے ہاتھ بیچ ڈالیو۔ کیونکہ تو خداوند اپنے خدا کی مقدس قوم ہے۔"

یعنی اپنے لئے مردار اس لئے حرام کیا گیا کہ خود کو خدا کی مقدس قوم سمجھا، ہاں پردیسیوں اور اجنبیوں کو کھلانے اور ان کے ہاتھ اس مردار کو بیچ ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہودی دوسری قوموں سے کہاں تک رواداری برت سکتے تھے اور انھوں نے کتنی رواداری دوسروں سے برتی ہوگی۔ یہودی خدا کی دوسری مخلوق کے مقابلے میں اپنے آپ کو جس قدر اعلیٰ سمجھتے تھے اس کو قرآن مجید نے انہی کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے۔ نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ۔ آیت ۱۸) ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

خدا کے یہ "بیٹے" اور "پیارے" خدا کی دوسری غریب مخلوق کو کس ذلت اور حقارت سے دیکھتے تھے اس کے لئے یہ بیان کر دینا کافی ہوگا کہ ان کو دوسری قوموں سے پانی لیکر پینا بھی گوارا نہ تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی ناپاک تھیں اور ان کا پانی بھی ناپاک تھا۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰؑ نے ایک سفر کے دوران میں

راستہ کے ایک کنوئیں پر پیاس کی حالت میں ایک سامری عورت سے پانی مانگا تو اس عورت نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ "تو یہودی ہو کر مجھ سامری عورت سے پانی کیوں مانگتا ہے کیونکہ یہودی سامریوں سے کسی طرح کا برتاؤ نہیں رکھتے۔" (یوحنا ۴:۹)

عیسائیوں کا سلوک غیروں کے ساتھ

یہ تو پڑھا آپ نے یہودیوں کا برتاؤ دوسروں کے ساتھ۔ اب عیسائیوں کو لیجئے۔ چونکہ عیسائیوں کی کوئی علیحدہ شریعت نہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں بھی وہ تمام احکامات قابل تسلیم ہیں جو یہودی شریعت میں رائج ہیں۔ اس بات کا ثبوت کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی شریعت ایک ہی ہے اور عیسائی اسی شریعت پر کاربند ہیں جو موسیٰؑ لائے تھے۔ انجیل کا وہ فقرہ ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلیگا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔" (متی ۵: ۱۷-۱۸)

اس فقرہ سے صاف ثابت ہے کہ عیسویت یہودی شریعت اور موسوی کتاب کے تابع فرمان ہے، تاہم انجیل میں دوسری قوموں کے متعلق اتنے سخت اور شدید الفاظ موجود ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ یہ شہزادہ امن کے منہ کے کلمات ہوں گے چنانچہ ایک جگہ انجیل میں صاف اور واضح طور پر دوسری قوموں کو کتوں سے تشبیہ دی گئی ہے (انجیل متی ۱۵: ۲۶) اور ایک اور مقام پر انھیں سور کہا گیا ہے۔ (متی ۷: ۶)

قدیم ایرانیوں میں رواداری کی حیثیت

روما کی طرح ایران میں بھی ایک قدیم اور زبردست سلطنت قائم تھی جو ہر طرح شہنشاہی روما کی ہمسر حریف تھی، اس سلطنت میں سب سے زیادہ عادل، رحمدل اور منصف مزاج شہنشاہ نوشیرواں گذرا ہے جو نوشیرواں عادل کے نام سے دنیا میں شہرت رکھتا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی عظیم الشان سلطنت

میں بھی اعلیٰ اقوام کا برتاؤ پست اقوام کے ساتھ روادارانہ نہیں تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب ایک موقع پر نوشیرواں کو روپے کی ضرورت پڑی تو ایک موچی نے چالیس لاکھ درم بادشاہ کو اس شرط پر قرض دینے منظور کئے کہ میرے بیٹے کو جو پڑھا لکھا اور مہذب ہے بادشاہ کوئی اعلیٰ عہدہ عطا فرمادے۔ نوشیرواں نے یہ شرط سنکر خفگی کے ساتھ روپیہ لینے سے انکار کردیا اور کہا کہ جب موچیوں کے لڑکے سلطنت کے عہدہ دار ہوں گے تو کیا شرفا اور معززین کی اولاد ان کی جوتیاں سیدھی کرے گی۔ نہیں مجھے یہ بات ہرگز منظور نہیں کہ موچی کا لڑکا ایک خاندانی معزز آدمی کے برابر بیٹھے۔ (نوشیرواں نامہ ص ۳۰)

اسلام اور دوسری اقوام

غرض یہ تھی دنیا کی حالت جب اسلام کا روشن اور چمکدار سورج سرزمین عرب سے طلوع ہوا جسے دیکھتے ہی جہالت و تعصب کی تمام تاریکی آنِ واحد میں کافور ہوگئی۔ اسلام نے دنیا کو کیا حقوق دیئے؟ اور کس درجہ دوسری قوموں سے فیاضانہ اور رواداراںہ برتاؤ کی تلقین کی؟ یہی اس مضمون کا موضوع ہے اور اسی پر اب ہم تفصیلی نظر ڈالتے ہیں۔

اسلام نے جو حقوق انسان پر قائم کئے ہیں وہ تین طرح کے ہیں۔ حقوق اللہ۔ حقوق النفس اور حقوق العباد۔ آخری شق میں وہ موضوع آتا ہے جس پر ہمیں بحث کرنی ہے۔ یعنی "اسلام میں غیر مسلموں سے رواداری کی تعلیم" اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا تعلیم ہے جو اسلام نے غیر مسلموں کے متعلق ہمیں دی ہے اور جس پر کاربند ہونا ہر مسلمان کا اولین فرض ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام نے ہر قوم اور مذہب سے زیادہ اپنے پیرووں کو غیر مسلموں سے رواداری اور حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ ثبوت میں ہم پہلے تعلیم کو پیش کریں گے اور بعد ازاں بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طرزِ عمل اور اسوہ حسنہ کو۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

ا۔ اسلام کی تعلیم غیر مسلموں کے متعلق

ا۔ مساوات کی تعلیم

اس باب میں سب سے اول اسلام نے جو تعلیم دی وہ قوموں اور نسلوں کا امتیاز اور

قبیلوں اور فرقوں کا فرق مٹانا تھا۔ سب سے پہلے اسلام نے اعلیٰ ذات کے فخر اور نسلی غرور کا قلع قمع کیا اور بآواز بلند اعلان کیا کہ کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ خدا کی ساری مخلوق برابر ہے۔ کیونکہ سب آدمؑ کی اولاد ہیں۔ بنی آدم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو خدا کا سب سے زیادہ فرمانبردار ہو (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ) اس فرمانِ خداوندی کا نازل ہونا تھا کہ قریش کے معزز سردار ملک حبش کے موٹے ہونٹ والے سیاہ رنگ کے حبشی سے بھی درجے میں نیچے ہو گئے اور فارسی النسل غلام اہل بیت نبوی میں شمار ہونے لگے۔ اسی مقدس تعلیم کا اثر تھا کہ ایک غریب اور بے مایہ حبشیؓ کے انتقال پر کسریٰ اور قیصر کی پرشوکت سلطنتوں کے مالک اور دنیائے اسلام کے زبردست شہنشاہ نے آبدیدہ ہو کر کہا ؎

اٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا　　اٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبر

یہ دنیا میں سب سے پہلی مثال تھی کہ اسلام نے اس زور اور اس شان کے ساتھ نسلی فخر و غرور کا خاتمہ کیا۔ اور تمام دنیا کے لوگوں کو اپنا بھائی اور اپنے جیسا انسان سمجھنے کی تلقین کی۔ نسلی منافرت کو دور کیا اور ایک دوسرے سے حسن سلوک کی تعلیم دی۔ رواداری کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہم دوسری قوموں کے افراد کو اپنے ہی جیسا انسان سمجھیں کیونکہ صرف اسی وقت ہم ان سے رواداری اور حسنِ سلوک کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے دوسروں کو ذلیل حقیر اور کم درجہ کا انسان سمجھا تو پھر محال ہے کہ ہم ان کے ساتھ کسی قسم کا سلوک یا رواداری برت سکیں۔ اپنوں سے سلوک و احسان کرنا ہر کوئی سکھاتا ہے مگر یہ صرف اسلام ہی تھا جس نے دنیا میں سب سے اول عالمگیر اخوت اور عالمگیر ہمدردی کی تعلیم دی۔ دیکھئے حکیم مشرقؒ نے اسلام کی اس رواداری کی تعلیم کو کن الفاظ میں بیان کیا ہے کہتا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند　　کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضو ہا را نماند قرار

یہ اسلام ہی ہے جس نے کسی قوم اور کسی نسلِ انسانی کو ذلیل اور حقیر نہیں ٹھیرایا۔ قرآن نے ساری دنیا کو مخاطب کر کے کہا (خلقکم من نفسٍ واحدۃ) اور اس طرح ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا۔ ہاں انسانی عزت کی بنیاد صرف نیکی اور خدائی فرمانبرداری پر رکھی۔ اسلام نے جو خدا پیش کیا وہ صرف بنو ہاشم

یا قریش کا خدا نہ تھا بلکہ "رب العالمین" تھا۔ اور جو رسول اس رب العالمین نے بھیجا وہ صرف بنو ہاشم یا محض اقوامِ عرب کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ "رحمت للعالمین" تھا۔ پس سوچئے اور غور کیجئے کہ اس سے زیادہ دوسروں کے ساتھ رواداری کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟

۲۔ آزادیٔ ضمیر | دوسری بات جو غیر مسلموں سے رواداری کے متعلق اسلام نے تلقین کی وہ آزادیٔ ضمیر کا تسلیم کرنا ہے۔ اسلام نے آزادیٔ ضمیر کو انسان کا پیدائشی اور فطری حق سمجھا۔ جبر اور سختی کو حرام اور ناجائز بتایا اور اس بات کی سخت ممانعت فرمائی کہ کسی سے کوئی ایسی بات جبراً منوائی جائے جس کو اس کا ضمیر قبول نہ کرتا ہو اور اس بارہ میں صاف اور صریح طور پر فرمایا کہ لا اکراہ فی الدین یعنی مذہب کے معاملہ میں کسی زبردستی کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو اجازت دی کہ "من شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر" (جو شخص چاہے مسلمان ہو جائے جو نہ چاہے انکار کردے) ایک جگہ ارشاد فرمایا اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (ہم نے طریق حق سمجھا دیا ہے اب چاہے اسے مانو چاہے نہ مانو) جبر سے مسلمان کرنے کو اسلام نے نہایت نفرت کی نظر سے دیکھا ہے اور ایسے آدمیوں کا نام جو دل سے مسلمان نہ ہوئے ہوں بلکہ کسی طمع، ڈر یا جبر سے انھوں نے اسلام قبول کیا ہو، منافق رکھا ہے اور اسے اتنا بڑا جرم قرار دیا ہے کہ اس کی سزا جہنم کا سب سے نچلا حصہ قرار دی ہے (اِنَّ المنافقین فی الدرک الاسفل من النار) اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا اسلام نے کس سختی اور زور کے ساتھ خیال رکھا ہے اور کس قدر ان کا احترام کیا ہے اور اس معاملہ میں کس درجہ دوسروں سے رواداری برتی ہے۔

۳۔ مذاہب غیر سے محبت | تیسری رواداری جو اسلام نے غیر مسلموں سے برتی وہ یہ ہے کہ ان کے مذہب کے متعلق اپنے متبعین میں نفرت اور بغض پیدا نہیں کیا بلکہ طرح طرح سے محبت و تعلق کو بڑھایا ہے کبھی یہ کہہ کر کہ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا دوسری قوموں کے ہادیوں اور رہبروں کی بزرگی کو تسلیم کیا۔ کبھی یہ کہہ کر کہ لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ بت پرست قوموں کے دلوں میں محبت کا بیج بو دیا۔ کبھی یہ کہہ کر کہ فیھا کتب قیمہ۔ یہ بتایا کہ اسلام مجموعہ ہے ان کل صداقتوں بھلائیوں اور خوبیوں کا جو کسی بھی مذہب میں پائی جاتی ہوں یعنی یہ تسلیم کیا کہ دوسرے مذاہب بھی خوبیوں اور اچھائیوں سے خالی نہیں، کیا غیروں سے

رواداری کی اس سے بہتر مثال اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب میں بھی مل سکتی ہے؟

۴۔ دوسری قوموں کے مقدسوں کا احترام

اسلام نے ایک اعلیٰ درجہ کی رواداری کا نمونہ یہ دکھایا کہ یہود اور نصاریٰ کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو خدا کا فرستادہ اور سچا نبی تسلیم کیا۔ انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح (نساء آیت ۱۶۳) اور جو کتابیں یہود و نصاریٰ الہامی مانتے تھے خود بھی انھیں الہامی اور منجانب اللہ تسلیم کیا۔ (انا انزلنا التورٰۃ فیہا ھدی و نور و اٰتینٰہ الانجیل فیہ ھدی و نور) اور اس طرح یہود و نصاریٰ کی طرف ایک محبت کا ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت یہی دو نہایت مشہور اور نمایاں مذہب تھے۔ باقی تمام مذاہب کے متعلق بھی اس بات کو تسلیم کیا کہ ہر قوم و ملت میں خدا کے نبی آتے رہے (وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر) مطلب یہ ہے کہ دیگر تمام مذاہب کے مقدس بزرگوں کی عزت کو مسلمان کی نظر میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا اور مسلمان کو کسی دوسرے کے مذہبی پیشوا کو برا کہنے سے قطعی طور پر روک دیا اور اس طرح ایک عالمگیر اخوت، ہمدردی اور رواداری کی بنیاد دنیا میں قائم کی۔ جس کا اسلام سے پہلے نام و نشان بھی نہ تھا۔

۵۔ دوسروں سے عدل و انصاف کا حکم

پانچویں رواداری بڑی ہی عجیب و غریب ہے۔ جس کا قانون اسلام نے غیر مسلموں کے متعلق مقرر فرمایا ہے اور وہ ہے ہر حالت میں عدل و انصاف۔ اسلام نے حکم دیا کہ حالات خواہ کیسے ہی ہوں تم سے دوسرے لوگ خواہ کتنی ہی دشمنی کریں مگر تم کسی حال میں بھی عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ دو۔ فرمایا لا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ۔ یعنی کسی قوم کی دشمنی اور عداوت تم کو اس بات کا ملزم نہ کر دے کہ تم موقع پر عدل و انصاف نہ کرو۔ نہیں خواہ تم سے کوئی کتنی ہی دشمنی کرے مگر تم جب اس کے متعلق کوئی بات کہو انصاف سے کہو اگر تمہارے ساتھ کسی کی دشمنی ہے تو اس کی ہر بات میں کیڑے نہ ڈالو۔ دشمن اور مخالف کی جو اچھی بات دیکھو بیشک اسے تسلیم کرو۔ اگر کبھی کوئی معاملہ پیش آ جائے تو محض اس وجہ سے کہ فریق ثانی تمہارا دشمن ہے تم بد دیانتی نہ کرنا بلکہ ٹھیک ٹھیک قانون و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا۔ کیونکہ یہی نیک بختی کی علامت ہے۔ غور کیجئے کتنا بہترین اور کتنا بے نظیر قانون یہ اسلام نے بنایا۔ یوں سمجھئے کہ یہ قانون بنا کر اسلام نے جتنی مراعات غیر مسلموں کو دی جا سکتی تھیں سب دیدیں۔ اور ان کو اس بات سے بالکل بے خوف کر دیا۔ کہ مسلمان ان کے ساتھ کوئی زیادتی

پہنچانے کا تصور ہمیشہ دو بنیادوں میں سے کسی ایک کے تابع ہوگا یا تو صرف رسم ورواج، تمدنی وقار اور طعنِ اقرباء سے گریز اس کا محرک ہوگا۔ یا مرنے والے کی وہ نیک کرداریاں جن کے احساس نے خدمت کرسکنے کے جذبہ کو ابھارا۔ اگر پہلی چیز ہے تو کوئی شک نہیں کہ احباب کے پلاؤ زردہ کھانے سے زخم خوردہ، بے چین اور پریشان روح کو ذرہ برابر بھی تسکین نہیں ہوسکتی۔ نہ عالمِ خیال میں کوئی موج پیدا ہوگی جس سے کوئی دل آویز شکل تیار ہوسکتی تھی، سوائے اس کے کہ کسی سرمایہ دار کی دولت تقسیم کرسکنے کا موقعہ مل جائے۔ لیکن اگر ثواب پہنچانے کا تصور کسی عمل کا نتیجہ تھا تو صدقہ جاریہ کی طرح اس عمل کے نتائج بھی مرتب ہوں گے خواہ صدقہ جاریہ سے کیف وکم میں مساوی نہ ہوں۔ ثواب کا وہ طریقہ جو فاتحہ خوانی اور نخود شماری میں منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر میرا نقطۂ نظر غلط نہ ہو تو مرنے والے کے یتیم بچوں، بیوہ عورت اور مجبور ماں باپ کی خدمت و دل جوئی کرنے کے مقابلہ پر بہتر نہیں ہوسکتا۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اس ہی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تمدنی زندگی کو ترقی کرنے کا موقع ملیگا بلکہ جس طرح نیند میں جذبات سے وابستگی رکھنے والے واقعات کا اثر دل ودماغ پر محسوس ہوتا ہے ایسے ہی ایک مسافر عزیز اور مردہ بھی مسرت وغم کے احساسات قبول کرنے سے قطعاً مجبور نہیں ہوتا۔ اس کے احباب واعزا کی پریشانیاں دور کرنے سے مردہ کے دل ودماغ کا بار جس حد تک دور ہوسکتا ہے وہ رسم پرستی کے تحت فاتحہ خوانی اور نخود شماری سے ممکن نہیں۔

جن حضرات علماء کے نزدیک صرف الفاظ بھی مقاصدِ وحی کا جزء ہوں اور نتائج کے علمبردار وہ شاید اس رسم قرآن خوانی کو اہمیت سپرد کرسکیں ورنہ مجھ جیسے لوگوں کے نزدیک وہ قرآن خوانی جو وقفۂ تعزیت کے ایک شغل سے زیادہ نہ ہو نہ پاکیزہ تصورات کے گوشے روشن کرسکتی ہے نہ زندگی کے کسی انقلاب میں ارتقار کا باعث ہوسکے۔ ہاں جو اہم اسباب ومحرکات خواب کو جذباتی حیثیت سے خوش گوار اور ناخوش گوار بنا سکتے ہیں۔ ان کے لئے حیاتِ برزخ کو بھی خوشگوار بنا دینا ممکن ہے۔

مجدد الف ثانیؒ کا اندازِ بیان بھی بتاتا ہے کہ ثواب کی نوعیت اعمال کے مستقل اور

دیرپا نتائج کے ہم رنگ نہیں۔ تحفہ، وقتی سکون اور لذتِ رفتنی کی قسم سے ہے۔ اگر ثواب کے نتائج روح کے تعمیری ارتقا میں کام آسکتے اور اُسے لالہ و گل کی پُر خلود جنت سپرد کر سکتے تو ثواب کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں بہ طور تحفہ نہ پیش کیا جاسکتا تھا۔ تحائف، عزت افزائی کے کام آسکتے خوانِ نعمت کچھ دیر کے لئے ذائقہ کو خوشگوار بنا سکتا اور خوش خبری پریشانیوں کے بوجھ کو ایک وقفہ کے لئے ہلکا کر سکتی ہے۔ لیکن زندگی کو یہ چیزیں کامیاب اور ارتقا پذیر فتہ نہیں بنا سکتیں۔ شاید اس ہی بنیاد پر قرآن نے شخصی اعمال ہی کو تمام تر اہمیت سپرد کی۔

جذبات پر اثر انداز ہونے والے طرزِ عمل کو ثواب رسانی کا بہتر ذریعہ بتانے سے یہ مقصد نہیں کہ پاکیزہ تصورات، قرآن خوانی وغیرہ کے توسط سے حیاتِ برزخ کو خوشگوار نہیں بنا سکتے۔ خیال ایک زبردست طاقت کا نام ہے جو وارد، سلب امراض، خیال کی سمت بدل دینے، دل کی بات بتا دینے اور اعزا کی پرورش تک بھی محدود ہو سکتا ہے اور سیاسی تمدنی اور اقتصادی انقلاب بھی لا سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خیالات کی ایسی لہریں بھی ہو سکتی ہیں جو خیال کی ان چھوٹی چھوٹی لہروں اور موجوں سے گذر کر طویل، لطیف، نفاذ، سریع اور لاشعوری شعاعوں تک پہنچتی اور انھیں عالمِ تصویر و عالمِ آواز کا ہم رنگ بنا دیتی ہوں۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ اور آپ اسے سائنٹفک آلات کی گرفت میں آجانے والی شعاعوں سے لیکر ہر لطیف تموج شعاعی اور نوری میں مضمر پائیں گے۔

میں اس چیز کو ہرگز ناممکن نہیں سمجھتا کہ جس طرح صوفیاء کشفِ قبور کی استعداد سے اہلِ قبور کے پیغامات سُن سکتے ہیں ایسے ہی کسی زمانہ میں اہلِ سائنس کے ذرائع بھی کسی حد تک کر سکیں، عالمِ قبر بلکہ معرفتِ الٰہی اور سیر الی اللہ کے مدارج اگر ایک مشرک بھی مرضیاتِ الٰہیہ کا راستہ نہ اختیار کرتے ہوئے طے کر سکتا ہے خواہ دوزخ کا ایندھن ہونا ہی اس کے لئے مقدر ہو چکا ہو۔ جیسا کہ شاہ اسمٰعیل صاحبؒ نے صراطِ مستقیم میں تحریر فرمایا ہے۔ تو اہلِ سائنس یا دوسرے فن کاروں کے لئے یہ چیز کیونکر ناممکن ہو جائے گی۔ ہر پہلو کا مطالعہ وسعتِ قلب کے ساتھ کرنا چاہئے۔ قدرت نے حقائق و معارف تک پہنچنے کے صدہا دروازے بنائے ہیں، آپ جس طرح جس سمت سے اور جس زمانہ میں بھی پہنچنا چاہیں

کوئی طاقت آپ کو روک نہیں سکتی۔

اہل سائنس کے مکاشفات تو ایک طرف رہے۔ میں نے بعض ایسے حقائق کو جن کے کشف پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تفہیمات الٰہیہ میں فخر کیا ہے۔ مدینہ اخبار کے معمولی اشعار میں دیکھا تھا جسے خود شاعر ساری عمر بھی نہ محسوس کر سکیگا۔ "یوتی الحکمۃ من یشاء"

یہی وہ حقیقت ہے جس نے صوفیائے کرام کو محسوس کرا دیا تھا کہ کشف و کرامات، روحانی ارتقاء کا ثبوت نہیں ہو سکتیں۔ اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ قانونِ الٰہی اور مرضیاتِ الٰہی کا راستہ۔ یہ دنیا جتنی سادہ ہے اتنی ہی پیچیدہ بھی۔ سائنٹفک تحقیقات کا آپ جس حد تک مطالعہ وسیع کرتے جائیں گے میرے دعوے کے دلائل آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔ قوتِ متخیلہ کی ان برقی مقناطیسی شعاعوں ہی کو تمام تر سرمایہ نہیں سمجھ لینا چاہئے جن کا آپ کی سائنس مشاہدہ کر چکی۔ ہنوز دلی دور است۔ اس زندگی میں لطافت و قوت کے مدارج، شعاع سے لاشعاع اور شعور سے لاشعور کی طرف لے جا رہے ہیں اور لے جاتے رہیں گے۔ جب دنیا خودی سے بیخودی، خیال سے لاخیال اور حیات سے لاحیات[1] تک تحقیق کر چکی ہوگی وہی طلوعِ صبح عالمِ مثال و برزخ کے حقائق سائنٹفک ریسرچ کے سایہ میں سمجھ سکنے کی پہلی صبح ہوگی۔ فانتظر وانی معکم من المنتظرین۔

برزخ پر ایک مسلمان کے لئے جس حد تک بحث کرنا چاہئے تھی شاید اس تشنگی کو دور کرنے میں مجھے بالکل ناکام نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں عقلیت پرستوں کے لئے ابھی چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنا باقی رہ گیا۔ لیکن چونکہ میرا عقیدہ ہے کہ علمِ کلام کی ان جزئی بحثوں سے ان کی طمانیتِ قلب کا سامان فراہم نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس کتاب کا انتظار کرنا چاہئے جو اشتراکیت پرستوں کے لیڈر ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری ایم ڈی کی فرمائش اور مسلسل تقاضہ پر اسلام کے نظامِ حیات پر کئی مجلدات میں لکھ رہا ہوں۔ شاید اس خدمت سے ہی بخشش کا کوئی سامان ہو سکے۔ والتوفیق بیدہ۔

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے تفہیمات الٰہیہ میں دعویٰ کیا ہے کہ مجھے اس زندگی میں ہی دو مرتبہ موت دی گئی۔ ابو النظر رضوی

اب قیامت، حشر اور جنت و دوزخ کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ میں نے ان موضوعات پر بھی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ چیزیں علوم غیبی کا ایک جزء ہونے کے باوجود ایسی نہیں جنھیں عقل و مشاہدہ سے کوئی نسبت ہی نہ ہو۔ لیکن میرے موضوع سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے رخصت ہونے کی اجازت چاہتے ہوئے اتنا عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اگرچہ آئندہ زندگی کے ہر انقلاب و تغیر میں نباتیت، حیوانیت اور انسانیت کے خواص اضافی قدروں میں باقی رہیں گے لیکن اس ہی طرح جیسے کہ حیوانات سے انسان کے تخلیقی انقلاب پر ہوا۔

نطفہ، نباتاتی اور حیوانی ارتقار سے گذرتے ہوئے جب ایک خاص نقطہ تک پہنچتا ہے، تو باوجود اس کے کہ علامات کا تقاضہ تخلیق انسانی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کر رہا ہوتا۔ غیر متوقع طور پر انقلاب انسانی ارتقار کو نمایاں کر دیتا ہے۔ ایسے ہی موجودہ انسانیت کا انقلاب ایک ایسے تخلیقی نقطہ تک پہنچا دے گا۔ جس کی آج ہم کوئی توقع نہیں کر سکتے " ننشأکم فیما لا تعلمون " (ایسی حالت میں دوبارہ پیدا کریں گے جسے تم نہیں جانتے) کا منشا بھی یہی ہے۔

اور نشارۃ ثانیہ (دوسری زندگی) کے لئے " خلقا آخر " کی اصطلاح استعمال کرنے کا بھی اس کے سوا کچھ مطلب نہیں کہ موجودہ قانون حیات سے بہت کچھ مغائرت ہوگی۔ انسان کے موجودہ انداز پیدائش کو بھی قرآن نے " خلقا اٰخر " سے تعبیر کیا ہے اور دوسری زندگی کو بھی دونوں زندگیوں میں غیر متوقع انقلاب کی یکسانیت بھی ضروری ہے اور قوانینِ حیات و استعدادات میں کم از کم اتنی ہی بیگانگی، جتنی کہ حیوانیت اور انسانیت میں آپ پاتے ہیں۔

اگر ہم قرآن کا عمیق مطالعہ کریں تو قیامت کی علمی توجیہات بھی سامنے آسکتی ہیں اور دوسری زندگی کے بعض انقلاب پذیرفتہ قوانینِ حیات پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے۔ اگرچہ مکمل معلومات نہیں فراہم کی جا سکتیں۔ اور فراہم بھی ہو جائیں تو سمجھائی نہیں جا سکتیں۔ ارتقار سے پہلے اس کی استعداد کا اندازہ کر سکنا ہمیشہ ناممکن رہا۔ اور ہمیشہ ناممکن رہے گا۔ ایک دھندلا سا خاکہ تیار ہو سکتا ہے جو

تسکینِ قلب و دماغ نہ کر سکیگا۔

میرے نزدیک قرآنی نظریات میں اس عقیدہ کے لئے کوئی جگہ نہیں کہ آئندہ زندگی موجودہ زندگی کا عکس ہوگی۔ انسان بہت سی باتوں میں حیوان سے مشابہ ہے۔ پھر بھی کچھ شباہت نہیں رکھتا۔ اتحاد کے پہلو میں تغایر و بیگانگی کے "دشنۂ پنہاں" کو نہ بھول جانا چاہیے۔ آئندہ زندگی کا آغاز صحیح معنی میں قیامت کے بعد ہوگا۔

برزخ کو چند باتوں میں کسی حد تک مشابہ ہونے کی بنا پر اگر عالمِ آخرت کا جزو کہدیا جائے تو دوسری بات ہے ورنہ نشاۃ ثانیہ کے آغاز سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ عالمِ حشر جو کائناتی تخلیق کے اصول پر بھی ایک عالم ہی کہلائے جانے کا مستحق ہے اور جسے قرآن نے نباتات کی تخلیق و ارتقار سے سمجھایا تھا ضمنی موضوع کی حیثیت سے نہیں بیان کیا جا سکتا اس لئے اب مجھے رخصت ہونے کی اجازت دیجئے۔

معذرت یا تصحیح

میرے مضمون "نظریۂ موت اور قرآن" میں کئی جگہ فاحش غلطیاں اور کمزوریاں میری بد قسمتی سے ہو گئی تھیں۔ حتی کہ مارچ کے پرچہ میں صفحہ ۲۰ پر اس فقرہ سے پہلے کہ "قرآن نے صاف اور سیدھی بات بتائی تھی" وہ آیت ہی حذف ہو گئی جس کی شرح اس فقرہ سے شروع کرنا مقصود تھا۔ اور اس طرح مفہوم خبط ہو گیا۔ اس لئے میں نے ایک تحریر ایڈیٹر صاحب کے پاس روانہ کی تھی جس میں تصحیح کے ساتھ علم الٰہی کے لئے قرآن کی اصطلاح "کتاب" ہونے پر مزید روشنی ڈالی گئی تھی

تاکہ ہر گوشہ روشن ہو جائے مگر بد قسمتی سے وہ بھی گم ہو گئی۔ اگر تندرستی ہوتی تو شاید دوبارہ کوشش کر سکتا۔ لیکن بیماری اور مسلسل بیماری نے اس زمانہ میں اتنا کمزور کر دیا ہے کہ کسی علمی چیز پر غور نہیں کر سکتا، یہاں تک کہ آیت بھی ذہن میں نہیں رہی۔ اس لئے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری کمزوری و مجبوری پر نظر رکھتے ہوئے تصحیح نہ کر سکنے کی معذرت قبول کر لی جائے میں خود ذہنی اذیت میں مبتلا ہوں کہ میری ساری کوشش بیکار گئی اس لئے آپ کو بھی معاف کر دینا چاہیے۔

ابوالنظر رضوی

اسلام میں رواداری کی تعلیم

اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک غیروں کے ساتھ

از جناب مولوی شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی

قبل اس کے کہ ہم "اسلام میں غیر مسلموں سے رواداری" کے مضمون پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ بتائیں کہ رواداری کسے کہتے ہیں؟ اور اسلام سے پہلے متمدن اقوام دوسرے لوگوں سے کس قسم کا برتاؤ کرتی تھیں۔ تاکہ اس بات کا اندازہ آسانی کے ساتھ لگایا جا سکے کہ اسلام اور دیگر قوموں میں کیا اور کس قدر فرق ہے اور یہ کہ اسلام دنیا اور دنیا والوں کے لئے کہانتک رحمت ثابت ہوا۔

رواداری کی تعریف اپنے مخالفِ مذہب لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور مراعات سے پیش آنا۔ ان کے حق میں کوئی ایسی سخت بات نہ کہنا جو ان کی آزردگی اور دلآزاری کا موجب ہو۔ ان سے اخلاق نرمی اور ملائمت سے معاملہ کرنا، ان کو اپنے مذہب میں آزادئ ضمیر کا حق دینا۔ ضرورت پر ان کی امداد اور ہمدردی کرنا مصیبت اور مشکل میں ان کی اعانت کرنا۔ ان سے اپنے دل میں کینہ اور بغض نہ رکھنا۔ ان کو اپنے ہی جیسا انسان اور اپنے ہی مانند خدا کی مخلوق سمجھنا۔ ان پر کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ظلم و زیادتی نہ کرنا۔ ان کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا۔ یہ ہے "رواداری" کی تعریف اور یہ ہے اس برتاؤ کی تفصیل جس پر ہر مہذب انسان کو کاربند ہونا چاہئے۔

آیئے پہلے آپ کو دکھائیں کہ اسلام سے پہلے دنیا کی مشہور، متمدن اور مہذب قوموں نے اپنے علاوہ دوسری قوموں کے ساتھ کہاں تک ان باتوں کو نبھایا اور ان کا سلوک دیگر اقوام کے ساتھ کیا اور کیسا تھا؟

اسلام سے پہلے رواداری کے لحاظ سے متمدن اقوام کی حالت

ہندوستان قدیم کے آریہ ہندوستان کو اپنے قدیم تمدن وتہذیب اور معاشرت پر ناز ہے اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کہ اس سے قدیم کوئی تمدن نہیں اور نہ اس سے اعلیٰ اور افضل کوئی تہذیب ہے اس لئے یہی مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی سے شروع کروں۔

ہندوستان کے قدیم اور اصلی باشندے وہ لوگ تھے جو گونڈ اور بھیل وغیرہ ناموں سے اب بھی وسطِ ہند کے پہاڑوں میں منہ چھپائے ہوئے موجود ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہی لوگ ہندوستان کے مالک اور شمالی ملک پر قابض تھے۔ یکایک ایک سیلابِ عظیم وسطِ ایشیا سے اٹھا اور ہندوستان کے شمالی حصے میں داخل ہوکر اندرونِ ملک میں پھیل گیا۔ جہاں جہاں اس سیلاب کے قدم گئے وہاں تباہی، بربادی اور قتل وغارت کا بازار گرم ہوگیا۔ آریہ فاتحین کے مقابلہ میں جو صورت، شکل، تہذیب وتمدن اور چستی وچالاکی میں اہل باشندگانِ ملک سے بدرجہا زیادہ فائق تھے۔ ان جنگلیوں اور وحشیوں کا کیا حق تھا کہ خدائی زمین پر آزادی کے ساتھ رہنے پائیں؟ دراصل اس میں بیچارے آریوں کا بھی کچھ قصور نہ تھا۔ وہ بھی مجبور تھے کیونکہ ان کو مخالفوں کے لئے یہی ہدایت تھی کہ "ان کو زندہ آگ میں جلاکر خاک سیاہ کردو"[1]

انھیں یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ جو ممکن طریقہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کو تکلیف اور اذیت پہنچانے کا سمجھ میں آئے وہ اٹھا نہ رکھیں یہانتک کہ صاف حکم تھا کہ "جو تم سے دشمنی رکھے یا جس سے تم دشمنی رکھو اسے زندہ حالت میں شیر اور درندوں کے منہ میں ٹھونس دو"[2] خدا کی پناہ، اس ہولناک سزا پر سخت سے سخت د[illegible] انسان کا بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ شیر کے منہ میں ٹھنسنے والے بدنصیب انسان کا قصور صرف اتنا ہے کہ اعلیٰ مہذب اور تعلیم یافتہ انسان نے اس سے دشمنی رکھی۔ اس کا کوئی سوال نہیں کہ دشمنی کیوں اور کس لئے رکھی؟ مطلب تو صرف یہ ہے کہ دشمنی رکھی۔

ان کو یہ دعا مانگنے کی ہدایت کی گئی تھی کہ "جو ہم لوگوں سے بیر رکھتا ہے اور ہم لوگ جس سے

---

[1] یجر وید ادھیائے ۱۳۔ منتر ۱۲۔ [2] ایضاً ۵-۱۵۔

بیر رکھتے ہیں اس کے لئے تمام ماکولات اور پانی دکھ دینے والے دشمن کی مانند ثابت ہوں[۱] یعنی دشمن کے لئے پانی زہر کا کام کرے اور ساگ پات وغیرہ جو وہ کھائے وہ اس کے پھوٹ پھوٹ کر نکلے۔

چنانچہ آریوں نے ان ہدایات پر پورا پورا عمل کیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کے اصلی اور حقیقی باشندوں نے بھاگ بھاگ کر یا تو پہاڑوں اور کھوؤں میں اپنی جان بچائی۔ جہاں سے ان مظلوموں کو آج تک نکلنا نصیب نہیں ہوا اور یا فاتح اور مقدس لوگوں کے غلام بنے۔[۲]

منوسمرتی کے ہولناک قوانین

یہیں پر بس نہیں جب تمام ملک پر قبضہ ہو گیا تو پھر ملکی اور معاشرتی قوانین منضبط ہوئے جو منوسمرتی کے نام سے آج ہر جگہ ملتے ہیں اور نہایت ہی مستند اور قابل عمل سمجھے جاتے ہیں اس کو ملاحظہ فرمائیے تو ایسی ایسی حیرت انگیز اور خوفناک باتیں اس میں ملیں گی جن کے صرف خیال سے ہی بدن لرزنے لگتا ہے۔ دنیا میں جو ذلیل سے ذلیل اور بدتر سے بدتر حالت ذہن میں آسکتی ہے یا تصور میں گذر سکتی ہے وہ اس قوم کے لئے مخصوص کی گئی تھی جس کا نام محض اپنی طاقت، سلطنت اور علم و تہذیب کے غرور میں شودر (خدمتگار) رکھا گیا تھا۔ یہ غریب قوم اس خطاب کی صرف اس لئے مستحق قرار پائی کہ وہ اتنی تعلیم یافتہ، اتنی طاقتور اتنی مہذب نہیں تھی جتنی کہ منو مہاراج کے ہم قوم افراد۔ اگر برہمن دیوتا کسی شودر کو جان سے مار ڈالے تو اس کا پاپ زیادہ سے زیادہ اتنا ہوگا جتنا کسی چھپکلی یا مینڈک وغیرہ جانور کے مار ڈالنے کا۔ لیکن اگر بدقسمت شودر مقدس برہمن کے قریب بھی بیٹھ جائے تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا میں لکھا ہے کہ شودر کے بیٹھنے کی جگہ کا گوشت کاٹ ڈالا جائے۔ وید جو آسمانی اور الہامی کتاب ہے اگر ناپاک شودر اپنی بدقسمتی سے اس کا کوئی لفظ کہیں سن پائے تو منوسمرتی کا حکم ہے کہ سیسہ گرم کر کے اس کے کان میں ڈال دیا جائے۔ اگر شودر اتنی جرأت کر بیٹھے کہ کسی برہمن کو گالی دیدے تو اس کے متعلق قانون ہے کہ بلا تامل اس کی زبان کاٹ لی جائے۔ غرض کہاں تک بیان کیا جائے سارا منوشاستر ایسی ہی ہولناک

---

[۱] یجروید ادھیائے ۶ منتر ۲۲۔ [۲] مسٹر کے ایم پانیکر ایم اے اڈیٹر ہندوستان ٹائمز کی کتاب تاریخ ہند قدیم ص ۷۔

سزاؤں سے بھرا پڑا ہے۔

قدیم رومی اقوام ہندوستان سے آگے بڑھئے۔ روما کی تہذیب ساری دنیا میں مشہور ہے۔ وہاں ساری مفتوحہ قومیں غلام سمجھی جاتی تھیں اور سخت تعجب ہے کہ بایں تہذیب و شائستگی وہاں ان کی حالت ہندوستان کے شودروں سے بھی بدتر تھی۔ چنانچہ الفنسٹن اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے کہ "بہرکیف شودر فرقے کی حالت قدیم زمانہ کی جمہوری سلطنتوں کے غلاموں سے ہر حالت میں بہتر تھی۔"

ملکِ شام کے عیسائی جو انہی رومن بادشاہوں کی رعایا تھے ان کو اپنی زمینوں پر کسی قسم کا مالکانہ حق حاصل نہ تھا بلکہ وہ خود ایک قسم کی جائداد خیال کئے جاتے تھے اور بالکل غلامانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ چنانچہ زمین کے انتقال کے وقت وہ بھی منتقل ہو جاتے تھے اور مالک سابق کو ان پر جو مالکانہ اختیارات حاصل ہوتے تھے وہی قابض حال کو حاصل ہو جاتے تھے۔ یہودیوں کا حال اس رومن شہنشاہی میں عیسائیوں سے بھی بدتر تھا۔ اور ہرگز اس قابل نہ تھا کہ کسی حیثیت سے بھی ان پر رعایا کا اطلاق کیا جا سکے۔ (الفاروق ج ۲ ص ۱۹۸)

قدیم اسپین کی حالت رومن شہنشاہی کی یہی کیفیت اسپین میں اس وقت تھی جب یہ جزیرہ نما قیصرانِ روما کے زیرِ اقتدار تھا۔ چنانچہ ہالینڈ کا مشہور مورخ ڈوزی اپنی "تاریخ سپین" میں لکھتا ہے کہ "اسپین کی حالت یہ تھی کہ ایک طرف وسیع علاقوں اور جائیدادوں کے مالک تھے جن کو لتی فندی کہتے تھے اور دوسری طرف ایک بے شمار انبوہ شہروں کے مفلس باشندوں کا تھا جو سارے کے سارے غلام سمجھے جاتے تھے، گورنر، مجسٹریٹ، حاکم اور تمام دولتمند رومن ہر قسم کے محصول سے سرکاری طور پر مستثنیٰ تھے اور محصولات کا سارا باران غریب باشندوں پر پڑا ہوا تھا۔ یہ دولتمند لوگ، سرکاری حکام اور وسیع علاقوں کے مالک اور خطاب یافتہ رئیس بڑے پر تکلف اور شاندار محلوں میں عیش کرتے تھے اور غریب رعایا کے بدنصیب افراد غلاموں کی حیثیت میں ان کی میزوں کو لذیذ کھانوں اور پرانی شرابوں سے آراستہ کرتے اور یہ امیر مسندوں پر تکیے لگائے دادِ عیش دیتے اور مزے اڑاتے، سامنے مطربوں کے طائفے اور خوبصورت عورتیں ناچ گانے سے ان کا دل خوش کرتیں، ملک کے خاص لوگوں میں دولت کی یہ کثرت عام رعایا کی تنگدستی کو اور بھی نمایاں کرتی تھی (ص ۲۱۲ ج ۲)

قیصر اپنے آپ کو سلطنت کی کل زمینوں کا مالک تصور کرتا تھا اور رعایا کی نسبت سمجھتا تھا کہ زمین کے متعلق وہ کسی قسم کے مالکانہ حقوق نہیں رکھتی۔" (ص ۲۱۶) "کسی طرح کے سیاسی حقوق یا ایسے حقوق جو ایک آزاد شخص کو کسی حکومت میں حاصل ہوتے ہیں ان سے وہ محروم تھے۔ (ص ۲۱۷)" کاشتکار بھی بالکل غلام سمجھے جاتے تھے۔ مگر کسی شخص کے نہیں بلکہ اس زمین کے جس کو وہ کاشت کرتے تھے۔ مالک اراضی جب زمین کو کسی شخص کے ہاتھ فروخت کرتا تھا تو کاشتکار بھی ساتھ ہی فروخت ہوجاتا تھا" (۲۱۷) پھر وہ غریب رعایا جس کو اس طرح غلام بنالیا گیا تھا ان کی حالت یہ تھی کہ ایک ایک امیر کے حضور میں آٹھ آٹھ ہزار غلام خدمت کے لئے حاضر رہتے تھے چنانچہ ڈوزی لکھتا ہے کہ" ملک گال (فرانس) میں ایک شخص کے پاس پانچ ہزار اور دوسرے کے پاس آٹھ ہزار غلام تھے۔" (ص ۲۱۷) ان بدنصیب لوگوں پر جس قدر مظالم توڑے جاتے تھے۔ ان کو ڈوزی ان الفاظ میں بیان کرتا ہے" غلاموں پر سختیاں بڑی بے رحمی سے کی جاتی تھیں۔ بعض اوقات آقا اپنے غلام کو تین سو کوڑے صرف اس جرم پر لگاتا تھا کہ مانگتے ہی فوراً گرم پانی اس کے سامنے کیوں نہ حاضر کیا گیا اور کیوں آقا کو پانی کے لئے چند منٹ انتظار کرنا پڑا۔ (ص ۲۱۸)۔

اس خوفناک ظلم و زیادتی کا انجام کیا ہوتا تھا وہ بھی ڈوزی ہی کی زبان سے سنئے" غرض سوداگر اور تاجر رعایا اور کاشتکار، حکومت کے جور، آقاؤں کے تشدد اور مالکانِ آراضی کے ظلم سے بچنے کے لئے آخری علاج یہی کرتے کہ گھر بار چھوڑ کر جنگل کو نکل جاتے اور وہاں رہزنی اور قزاقی کا پیشہ اختیار کرتے اور جب ان کو موقع ملتا اپنے آقاؤں سے خوب جی کھول کر بدلہ نکالتے اور ان کے عیش و آرام کے گھروں اور پرتکلف محلوں کو لوٹ لیتے اور اگر کوئی دولتمند ان کے پنجہ میں گرفتار ہوجاتا تو اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ (ص ۲۱۸)

بنی اسرائیل کی عظیم الشان سلطنت میں

یہودیوں کا برتاؤ غیروں کے ساتھ

ان دونوں مہذب قوموں کے علاوہ دورِ قدیم کی ایک عظیم الشان سلطنت بنی اسرائیل کی تھی جو کہ اعلیٰ درجہ کی تہذیب اور ایک عمدہ تمدن کی مالک تھی۔ اپنے زمانہ میں یہ قوم دولت ثروت، حکومت و

عزت اور رعب و طاقت کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ خود خدا انھیں خطاب کر کے فرماتا ہے کہ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (میں نے تم کو تمام دنیا پر فضیلت دی تھی) اقوام عالم میں اس قوم کو ایک خصوصیت یہ حاصل ہے کہ جتنے پیغمبر اور نبی اس قوم میں مبعوث ہوئے اتنے کسی اور قوم میں نہیں آئے۔ یہ قوم ایک مستقل شریعت کی مالک اور بہت سی الہامی کتابوں کی حامل تھی جن کا مجموعہ عہد نامہ قدیم کہلاتا ہے۔ آؤ دیکھیں کہ اس مہذب اور متمدن قوم نے دوسری قوموں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا۔

جب ہم اس قوم کا شرعی قانون دیکھتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں۔ دوسروں سے رواداری اور حسنِ سلوک کا تو کیا ذکر ہے وہاں تو دوسروں سے اس درجہ بے رحمی، سختی اور درشتی کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے کہ پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سنئے۔ قانون تھا کہ جب دشمن پر حملہ کیا جائے تو اگر دشمن صلح کا خواہشمند ہو اور اپنے شہر کے دروازے بنی اسرائیل کے لئے کھول دے تب تو شہر کے سارے باشندے غلام بنالئے جائیں اور ان سے خدمت لی جائے۔ اور اگر وہ لوگ صلح نہ کریں تو فتحیاب ہونے کے بعد سارے مردوں کو بے دریغ تہ تیغ کر دیا جائے۔ کسی قسم کی کوئی رعایت یا رواداری ان سے نہ برتی جائے۔ ان کی ساری عورتوں اور تمام بچوں کو گرفتار کر کے لونڈی غلام بنالیا جائے۔ ان کے مویشی اور ہر قسم کا مال و اسباب لوٹ لیا جائے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل عبارت میں بنی اسرائیل کو یہ احکام دیئے گئے ہیں۔

> "اور جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے آ پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام کر
> تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور اور شہر کے دروازے تیرے لئے کھول دے
> تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری خراجگذار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی۔
> اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر اور جب خداوند
> تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے
> قتل کر۔ مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ

اپنے لئے لے۔ اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے
دی ہے کھائیو۔ اسی طرح سے تو ان سب شہروں سے جو تجھ سے بہت دور ہیں
اور ان قوموں کے شہروں میں سے نہیں ہیں کیجیو" (استثنا ۲۰: ۱۰-۱۵)

مگر آگے ارشاد ہوتا ہے کہ شہر کو فتح کرنے کے بعد کسی جاندار اور ذی روح کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔

"لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنھیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی
چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو" (استثنا باب ۲۰ آیت ۱۶)

ایک موقع پر حضرت موسیٰ کی ہدایت کے مطابق جب بنی اسرائیل نے دشمن کے سارے مردوں کو بلا استثنا قتل کر چکنے کے بعد ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا اور ان کے تمام مواشی اور بھیڑ بکریوں کو اور سارے مال و اسباب کو لوٹ لیا اور اس کے بعد ان کے شہروں اور قلعوں کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دینے کے بعد حضرت موسیٰ کے حضور میں حاضر ہوئے تو آپ ان پر اس وجہ سے بہت ناراض ہوئے کہ تم نے دشمنوں کے بچوں اور عورتوں کو کیوں زندہ رکھا اور حکم دیا کہ جتنے بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے لائے ہو سب کی ابھی گردن مارو۔ صرف کنواری لڑکیوں کو اپنے لئے زندہ رکھ لو۔ باقی سب کو تلوار کے گھاٹ اتار دو۔ چنانچہ آتا ہے۔

"موسیٰ نے ان کو لڑائی پر بھیجا۔ ایک ایک فرقہ کے پیچھے ایک ہزار کو۔ انھیں اور الیعزر کاہن کے
بیٹے فینحاس کو پاک ظروف کے ساتھ بھیجا اور پھونکنے کے نرسنگے اس کے ہاتھ میں تھے اور
انھوں نے مدیانیوں سے لڑائی کی۔ جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا تھا اور سارے مردوں کو قتل
کیا۔ اور انھوں نے ان مقتولوں کے سوا اوی اور رقم اور صور اور حور اور ربع کو جو مدیان
کے پانچ بادشاہ تھے جان سے مارا۔ اور بعور کے بیٹے بلعام کو بھی تلوار سے قتل کیا۔ اور
بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا۔ اور ان کی مواشی اور بھیڑ
بکری اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا۔ اور ان کے سارے شہروں کو جن میں وہ رہتے
تھے اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا اور انھوں نے ساری غنیمت اور سارے اسیر

انسان اور حیوان لئے اور وہ قیدی اور غنیمت اور لوٹ۔ موسیٰ اور الیعزر کاہن اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس خیمہ گاہ میں موآب کے میدانوں میں یردن کے کنارے جو یریحو کے مقابل ہے لائے۔ تب موسیٰ اور الیعزر کاہن اور جماعت کے سارے سردار ان کے استقبال کے لئے خیمہ گاہ سے باہر گئے اور موسیٰ لشکر کے رئیسوں پر اور ان پر جو ہزاروں کے سردار تھے اور ان پر جو سینکڑوں کے سردار تھے جو جنگ کر کے پھرے غصے ہوا۔ اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں کو جیتا رکھا۔ دیکھو یہ بلعام کے کہنے سے فغور کے بابت خداوند کے آگے اسرائیل کے گنہگار ہونے کا باعث ہوئیں۔ چنانچہ خداوند کی جماعت میں وبا آئی۔ سو تم ان بچوں کو جتنے لڑکے ہیں سب کو قتل کرو۔ اور ہر ایک عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف ہے جان سے مارو۔ لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لئے زندہ رکھو۔" (گنتی ۳۱: ۶-۱۸)

چونکہ وہ لوگ جن پر بنی اسرائیل چڑھ کر گئے تھے بنی اسرائیل میں سے نہ تھے بلکہ دوسری قوموں کے انسان تھے اس لئے ان کو قتل کرنے اور ان کی لاشوں کو چھونے کی وجہ سے بنی اسرائیل کے مطہر اور مقدس انسان سراسر ناپاک ہو گئے۔ پاک کس طرح ہوئے اس کی تفصیل کے لئے مندرجہ ذیل احکام پڑھو:-

"اور تم سات دن تک خیمہ گاہ سے باہر رہو۔ جس کسی نے آدمی کو مارا ہو اور جس کسی نے لاش کو چھوا ہو وہ آپ کو اور اپنے قیدیوں کو تیسرے دن اور ساتویں دن میں پاک کرے۔ تم اپنے سب کپڑے اور سب چمڑے کے برتن اور سب بکری کے بالوں کی بنی ہوئی چیزیں اور کاٹھ کے سب برتن پاک کرو۔ تب الیعزر کاہن نے ان سپاہیوں کو جو جنگ پر گئے تھے کہا کہ شریعت کا حکم جو خداوند نے موسیٰ کو فرمایا سو یہ ہے۔ فقط سونا، روپا، پیتل، لوہا رانگا، سیسا اور وہ سب چیزیں جو آگ میں ڈالی جاتی ہیں تم انھیں آگ میں ڈالو اور وہ پاک ہوں گی۔ پھر انھیں جدائی کے پانی سے بھی پاک کرو۔ پھر وہ سب چیزیں جو آگ میں

نہیں ڈالی جاتیں تم انھیں اس پانی میں ڈالو۔ اور تم ساتویں دن اپنے کپڑے دھوؤ۔ تاکہ تم پاک ہو۔ بعد اس کے خیمہ گاہ میں داخل ہو (گنتی ۳۱: ۱۹۔۲۴)۔

ایک جگہ دشمنوں کی سات بڑی اور قوی قوموں پر چڑھائی کرنے کا حکم ہے۔ ان کے ساتھ جس قسم کا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے:۔

"جب کہ خداوند تیرا خدا تجھ کو اس سرزمین میں جس کا وارث تو ہونے جاتا ہے داخل کرے اور تیرے آگے سے ان بہت سی قوموں کو دفع۔ یعنی حِتیوں، اور جرجاسیوں اور اموریوں اور کنعانیوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کو جو سات قومیں کہ بڑی اور قوی تجھ سے ہیں۔ اور جبکہ خداوند تیرا خدا اُنھیں تیرے حوالے کرے تو تو انھیں ماریو اور حرم کیجیو۔ نہ تو ان سے عہد کریو اور نہ ان پر رحم کریو۔ نہ ان سے بیاہ کرنا۔ اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہ دینا۔ نہ اپنے بیٹے کے لئے اس کی کوئی بیٹی لینا۔ کیونکہ وہ تیرے بیٹے کو میری پیروی سے پھرائیں گے۔ تاکہ وہ اور معبودوں کی عبادت کریں اور خداوند کا غصہ تجھ پر بھڑکے گا اور وہ تجھے بیکایک ہلاک کردے گا، سو تم ان سے یہ سلوک کرو، تم ان کے مذبحوں کو ڈھادو۔ ان کے بتوں کو توڑو۔ ان کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو۔ اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلادو" (استثنا ۷: ۱۔۵)

یہ تو ہوئی غیروں سے رواداری کی تعلیم! اب ان کا جو سلوک اپنوں سے تھا وہ بھی سن لیجئے:۔

ایک مرتبہ ایک جھگڑے پر بنی اسرائیل نے اپنے ہی ایک قبیلے بنی بنیمین پر سوا چار لاکھ کی عظیم الشان جمعیت کے ساتھ حملہ کیا۔ بنی بنیمین اگرچہ کثرتِ تعداد میں حملہ آوروں کے برابر نہ تھے مگر ذات میں ان سے ہیٹے بھی نہ تھے۔ انھوں نے بھی کٹ کر مرجانے کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ چھبیس ہزار اور سوا چار لاکھ کا مقابلہ کیا؟ مگر بقول شخصے جو جان سے درگذرے وہ جو چاہے سو کر گزرے۔ بنی بنیمین ایسی بے جگری کے ساتھ لڑے کہ پہلے ہی دن "بائیس ہزار اسرائیلیوں کو قتل کر کے خاک میں ملا دیا" (قاضیون ۲۰: ۲۱)

بنی اسرائیل نے کہا یہ تو کچھ نہ ہوئی اب کیا کریں۔ خیر" خداوند سے صلاح پوچھی کہ ہم اپنے بھائی بنیمین کے بیٹوں سے لڑنے کے لئے ان پر پھر چڑھیں یا نہیں؟ خداوند نے فرمایا۔ اس پر چڑھو" (قاضیون ۲۰: ۲۳) دوسرے دن جو لڑائی کا بازار گرم ہوا تو "بنی بنیمین نے بنی اسرائیل کے اٹھارہ ہزار آدمی مار کے زمین پر ڈالدیئے" (قاضیون ۲۰: ۲۵)

جب بائیس اور اٹھارہ پورے چالیس ہزار اسرائیلیوں کو چھبیس ہزار بنی بنیمین نے قتل کر ڈالا تو اب بنی اسرائیل بڑے گھبرائے۔ چنانچہ "سارے لوگ اٹھے اور خدا کے گھر میں آئے اور روئے اور وہاں خداوند کے حضور بیٹھے۔ اور اس دن سب نے شام تک روزہ رکھا اور قربانیاں خداوند کے آگے گذرانیں" (قاضیون ۲۰: ۲۶) چنانچہ خداوند ان سے راضی ہو گیا اور فرمایا "جا کہ میں کل ان کو تیرے ہاتھ میں کر دونگا" (قاضیون ۲۰: ۲۸) تیسرے دن بڑے گھمسان کا رن پڑا اور خداوند کے وعدے کے مطابق اس دن بنی اسرائیل کو کامل فتح ہوئی اور انھوں نے "اس دن پچیس ہزار ایک سو بنیمین کو قتل کیا" (قاضیون ۲۰: ۳۵)

جب اسرائیلی اس فوج کو شکست دے چکے تو بنی بنیمین کی بستیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور وہاں "جو مرد ملا اُسے تہ تیغ کیا اور مردوں اور حیوانات کو اور ان سب کو جو ان کے ہاتھ آئے اور جس جس شہر میں گئے ان سب کو پھونکدیا" (قاضیون ۲۰: ۴۸) آپس کے ذرا سے جھگڑے میں دونوں طرف کے پینسٹھ ہزار سے زیادہ آدمی کٹ مرے۔

مرغی کو تو تکلے کا گھاؤ ہی کافی ہوتا ہے۔ بنی بنیمین چھوٹا سا قبیلہ تھا۔ اس خانہ جنگی میں تباہ ہو گیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا اور جتنی تباہی اور بربادی ہونی تھی وہ ہولی تو چونکہ وہ اپنا ہی قبیلہ تھا اس لئے اب "بنی اسرائیل اپنے بھائی بنی بنیمین کی بابت پچھتائے اور بولے کہ آج کے دن بنی اسرائیل کا ایک فرقہ کٹ گیا" (قاضیون ۲۱: ۶) مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مرے ہوئے کس طرح واپس آسکتے تھے لیکن جتنے بچے کھچے لوگ اس قبیلے کے رہ گئے تھے سب کو کہلا بھیجا کہ کہا سنا معاف کرو۔ پچھلی باتوں پر خاک ڈالو اور آؤ مل بیٹھو۔ وہ بیچارے خانماں برباد جب اس "سلامتی کے

پیغام" (قاضیون ۲۱:۱۳) کو قبول کر کے بنی اسرائیل کے پاس آئے تو بنی اسرائیل نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ان کی خوب خاطر مدارات کی اور ان سے بڑی ہمدردی ظاہر کی کہ ناحق آپس کی لڑائی میں اتنا کشت و خون ہوا۔ اب سب سے پہلے بنی اسرائیل کو یہ فکر پڑی کہ بنی بنیمین کی ساری عورتیں تو ہم نے مار ڈالیں اب ان کے لئے بیویاں کہاں سے مہیا کریں تاکہ ان کی نسل منقطع نہ ہو۔ آخر کار یہ تدبیر سمجھ میں آئی کہ جب بنی بنیمین پر لشکر کشی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور سارے بنی اسرائیل کے فرقے ایک جگہ ان سے جنگ کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے تو اس وقت ایک قبیلہ یبیس جلعاد نامی لڑنے کے لئے نہ آیا تھا بس یہ جرم کافی تھا۔ لہٰذا یہ کام کیا جائے کہ اس پر فوج کشی کر کے جتنی کنواری لڑکیاں ان کی مل سکیں پکڑ لائیں اور لا کر بنی بنیمین کی خدمت میں پیش کر دیں تاکہ بیچارے بنیمینوں کے کچھ تو آنسو پچھیں اور وہ سمجھیں کہ واقعی ہمارے بھائی ہمارے حقیقی اور سچے ہمدرد ہیں کہ ہمارے لئے بیویاں فراہم کر دیں ۔

(بنی اسرائیل نے اپنی بیٹیاں انھیں اس لئے نہ دیں کہ انھوں نے قسم کھائی تھی کہ "ہم اپنی بیٹیاں جورو کرنے کو انھیں نہیں دیں گے۔" قاضیون (۲۱:۷)

چنانچہ بنی اسرائیل نے فوراً بارہ ہزار بہادروں کا ایک لشکر جرار تیار کیا اور انھیں یہ حکم دیکر روانہ کر دیا کہ یبیس جلعاد کے باشندوں کو جا کے عورتوں اور بچوں سمیت قتل کرو اور یہ وہ کام ہے جس کا تم کو کرنا ضرور ہے کہ سارے مردوں اور ان عورتوں کو جو مرد سے ہمبستر ہوئی ہوں ہلاک کر دینا (قاضیون ۲۱:۱۰)

چنانچہ غازیانِ نامدار کا یہ لشکر جرار بے خبر اور غافل یبیس جلعاد کے باشندوں پر جا پڑا۔ ان میں انھیں کُل چار سو کنواری عورتیں جو مرد سے ناواقف تھیں ملیں (قاضیون ۲۱:۱۲) انھیں وہ غازی پکڑ لائے اور لاکر بنی بنیمین کے سپرد کر دیا۔ (قاضیون ۲۱:۱۴) لیکن مشکل اب بھی آسان نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ کنواریاں ان لوگوں کے لئے کافی نہ تھیں اور ضرورت اور باقی رہ گئی (قاضیون ۲۱:۱۴) چنانچہ بوڑھے بوڑھے بزرگ آدمی پھر جمع ہوئے اور سوچنے لگے کہ اس مشکل کا حل کیا اختیار کیا جائے؟ آخر کار ایک لاجواب ترکیب ان کی سمجھ میں آئی اور وہ یہ تھی کہ سیلا میں کے مقام پر جو ایک مذہبی میلہ لگتا ہے اور عورتیں اور مرد خداوند کی عید منانے کے لئے جمع ہوتے ہیں وہاں بنی بنیمین انگوری باغوں کے درمیان گھات میں

بیٹھ جائیں اور سیلا میں کی بیٹیوں پر اچانک حملہ کرکے جو عورت جس شخص کو پسند آئے وہ اسے بلا تامل اپنی بیوی بنالے اور اپنے ملک کو لے جائے۔ (قاضیون ۲۱: ۲۰-۲۱) جب ان عورتوں کے باپ بھائی ہمارے پاس فریاد لائیں گے تو ہم کہہ دیں گے کہ بھئی جانے دو۔ ان پر ہماری خاطر مہربانی کرو — (قاضیون ۲۱: ۲۲) آخر کسی نہ کسی کو تم اپنی بیٹی دیتے ہی اور پھر جہیز اور سامان بہت کچھ ساتھ دینا پڑتا۔ شکر کرو سستے ہی چھوٹ گئے۔ بنی بنیمین کو اس کار خیر میں کیا تامل ہو سکتا تھا چنانچہ انھوں نے اپنے بھائیوں کے کہنے پر عمل کیا اور نہایت انصاف کے ساتھ "اپنے شمار کے موافق ان میں سے جو ناچتی نکلی تھیں جنھیں پکڑ لیا تھا ایک نے اپنے لئے جورو لی (قاضیون ۲۱-۲۳) اور فائز المرام خوش خوش اپنی تباہ شدہ بستیوں کو روانہ ہوگئے اور ان کی مرمت کرکے ان میں بس گئے" (قاضیون ۲۱: ۲۳) اور اس طرح اس قضیہ نامرضیہ کا بڑی خوش اسلوبی سے خاتمہ ہوگیا۔

دیکھا آپ نے "حسن سلوک" اور "رواداری" کی کتنی حیرت انگیز مثالیں بنی اسرائیل کی تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

بنی اسرائیل کا جو سلوک اپنوں اور غیروں سے تھا اس عجیب و غریب حکایت کے بعد اسکی اور مثالیں دینے کی اگرچہ قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن اب ذکر چلا ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ ان کے لئے حکم تھا کہ "جب تو اپنے ہمسائے کے تاکستان میں داخل ہو تو جتنے انگور چاہے اپنی خوشی سے کھا" — (استثنا ۲۳: ۲۴) یعنی دوسرے کے مال پر دست تصرف دراز کرنے کے لئے مالک کی مرضی اور اجازت کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جتنا چاہو کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ۔ کتنی محبت، ہمدردی اور رواداری کی تعلیم ہے۔

اس سے اگلی آیت میں جو حکم دیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ پر لطف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "جب تو اپنے ہمسائے کے کھیت میں داخل ہو تو اپنے ہاتھ سے (جتنی چاہے) بالیں توڑ لے مگر کھیت کو ہنسوے سے مت کاٹ" (استثنا ۲۳: ۲۵) دیکھئے کس قدر رعایت ہے کہ چاہے ہاتھ سے توڑ توڑ کر تمام کھیت کا ستیاناس کردے مگر یہ تا احسان کھیت والے پر ضرور کر کہ درانتی سے کھیت کا صفایا نہ کر۔ آپ ہی انصاف سے فرمائیے کہ اس سے زیادہ "مہربانی" اپنے بھائی اور ہمسائے کے ساتھ اور کیا ہو سکتی ہے اور

یہ مہربانی ایسی عظیم الشان ہے کہ کھیت والے جس قدر بھی شکریہ ادا کریں تھوڑا ہے۔

ناظرین! ذرا انصافاً غور فرمائیں کہ یہ دونوں حکم کس قدر فساد انگیز ہیں۔ اگر آج دنیا میں یہودیوں کی حکومت قائم ہو جائے اور ان کی شریعت کے مطابق احکامات جاری ہوں تو ملک کس قدر فتنہ و فساد لڑائی جھگڑے اور قتل و غارت کا آماجگاہ بن جائے۔

یہودی کس قدر ذلت کے ساتھ دوسری قوموں کو دیکھتے تھے؟

یہودی اپنے آپ کو جتنا معزز، جس قدر محترم اور جیسا قابل تکریم سمجھتے تھے اور دوسری قوموں کو جتنا ذلیل جس قدر کمینہ اور جیسا قابل نفرت سمجھتے تھے اس کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے کتاب استثنا کے چودھویں باب کی اکیسویں آیت پڑھئے۔ لکھا ہے۔

"جو جیوان آپ سے مر جائے تم اسے مت کھائیو، تو اسے کسی پردیسی کو جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو دیجیو تاکہ وہ اسے کھائے یا کسی اجنبی کے ہاتھ بیچ ڈالیو۔ کیونکہ تو خداوند اپنے خدا کی مقدس قوم ہے۔"

یعنی اپنے لئے مردار اس لئے حرام کیا گیا کہ خود کو خدا کی مقدس قوم سمجھا، ہاں پردیسیوں اور اجنبیوں کو کھلانے اور ان کے ہاتھ اس مردار کو بیچ ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہودی دوسری قوموں سے کہاں تک رواداری برت سکتے تھے اور انھوں نے کتنی رواداری دوسروں سے برتی ہوگی۔ یہودی خدا کی دوسری مخلوق کے مقابلے میں اپنے آپ کو جس قدر اعلیٰ سمجھتے تھے اس کو قرآن مجید نے انہی کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے۔ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (مائدہ ۲۶ آیت ۳) ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

خدا کے یہ "بیٹے" اور "پیارے" خدا کی دوسری غریب مخلوق کو کس ذلت اور حقارت سے دیکھتے تھے اس کے لئے یہ بیان کر دینا کافی ہوگا کہ ان کو دوسری قوموں سے پانی لیکر پینا بھی گوارا نہ تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی ناپاک تھیں اور ان کا پانی بھی ناپاک تھا۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰؑ نے ایک سفر کے دوران میں

راستہ کے ایک کنوئیں پر پیاس کی حالت میں ایک سامری عورت سے پانی مانگا تو اس عورت نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ "تو یہودی ہو کر مجھ سامری عورت سے پانی کیوں مانگتا ہے کیونکہ یہودی سامریوں سے کسی طرح کا برتاؤ نہیں رکھتے" (یوحنا ۹:۴)

عیسائیوں کا سلوک غیروں کے ساتھ

یہ تو پڑھا آپ نے یہودیوں کا برتاؤ دوسروں کے ساتھ۔ اب عیسائیوں کو لیجئے۔ چونکہ عیسائیوں کی کوئی علیحدہ شریعت نہیں۔ لہذا ان کے ہاں بھی وہ تمام احکامات قابلِ تسلیم ہیں جو یہودی شریعت میں رائج ہیں۔ اس بات کا ثبوت کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی شریعت ایک ہی ہے اور عیسائی اسی شریعت پر کاربند ہیں، جو موسیٰؑ لائے تھے۔ انجیل کا وہ فقرہ ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلیگا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے" (متی ۵: ۱۷-۱۸)

اس فقرہ سے صاف ثابت ہے کہ عیسویت یہودی شریعت اور موسوی کتاب کے تابع فرمان ہے، تاہم انجیل میں دوسری قوموں کے متعلق اتنے سخت اور شدید الفاظ موجود ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ یہ شہزادہ امن کے منہ کے کلمات ہوں گے چنانچہ ایک جگہ انجیل میں صاف اور واضح طور پر دوسری قوموں کو کتوں سے تشبیہ دی گئی ہے (انجیل متی ۱۵: ۲۶) اور ایک اور مقام پر انھیں سور کہا گیا ہے۔ (متی ۷: ۶)

قدیم ایرانیوں میں رواداری کی حیثیت

روما کی طرح ایران میں بھی ایک قدیم اور زبردست سلطنت قائم تھی جو ہر طرح شہنشاہی روما کی ہمسر و حریف تھی۔ اس سلطنت میں سب سے زیادہ عادل، رحمدل اور منصف مزاج شہنشاہ نوشیرواں گذرا ہے جو نوشیروانِ عادل کے نام سے دنیا میں شہرت رکھتا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی عظیم الشان سلطنت

میں بھی اعلیٰ اقوام کا برتاؤ پست اقوام کے ساتھ روادارانہ نہیں تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب ایک موقع پر نوشیرواں کو روپے کی ضرورت پڑی تو ایک موچی نے چالیس لاکھ درم بادشاہ کو اس شرط پر قرض دینے منظور کئے کہ میرے بیٹے کو جو پڑھا لکھا اور مہذب ہے بادشاہ کوئی اعلیٰ عہدہ عطا فرمادے۔ نوشیرواں نے یہ شرط سنکر خفگی کے ساتھ روپیہ لینے سے انکار کردیا اور کہا کہ جب موچیوں کے لڑکے سلطنت کے عہدہ دار ہوں گے تو کیا شرفا اور معززین کی اولاد ان کی جوتیاں سیدھی کرے گی۔ نہیں مجھے یہ بات ہرگز منظور نہیں کہ موچی کا لڑکا ایک خاندانی معزز آدمی کے برابر بیٹھے۔ (نوشیرواں نامہ ص ۳۰)

اسلام اور دوسری اقوام

غرض یہ تھی دنیا کی حالت جب اسلام کا روشن اور چمکدار سورج سرزمین عرب سے طلوع ہوا جسے دیکھتے ہی جہالت و تعصب کی تمام تاریکی آنِ واحد میں کافور ہوگئی۔ اسلام نے دنیا کو کیا حقوق دیئے؟ اور کس درجہ دوسری قوموں سے فیاضانہ اور روادارانہ برتاؤ کی تلقین کی؟ یہی اس مضمون کا موضوع ہے اور اسی پر اب ہم تفصیلی نظر ڈالتے ہیں۔

اسلام نے جو حقوق انسان پر قائم کئے ہیں وہ تین طرح کے ہیں۔ حقوق اللہ [۱]۔ حقوق النفس [۲] اور حقوق العباد [۳]۔ آخری شق میں وہ موضوع آتا ہے جس پر ہمیں بحث کرنی ہے۔ یعنی اسلام میں غیر مسلموں سے رواداری کی تعلیم، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا تعلیم ہے جو اسلام نے غیر مسلموں کے متعلق ہمیں دی ہے اور جس پر کاربند ہونا ہر مسلمان کا اولین فرض ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام نے ہر قوم اور مذہب سے زیادہ اپنے پیروؤں کو غیر مسلموں سے رواداری اور حسن سلوک کا حکم دیا ہے ثبوت میں ہم پہلے تعلیم کو پیش کریں گے اور ازاں بعد بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طرز عمل اور اسوۂ حسنہ کو۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

ا۔ اسلام کی تعلیم غیر مسلموں کے متعلق

۱۔ مساوات کی تعلیم

اس باب میں سب سے اول اسلام نے جو تعلیم دی وہ قوموں اور نسلوں کا امتیاز اور

قبیلوں اور فرقوں کا فرق مٹانا تھا۔ سب سے پہلے اسلام نے اعلیٰ ذات کے فخر اور نسلی غرور کا قلع قمع کیا اور بآوازِ بلند اعلان کیا کہ کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ خدا کی ساری مخلوق برابر ہے۔ کیونکہ سب آدم کی اولاد ہیں۔ بنی آدم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو خدا کا سب سے زیادہ فرمانبردار ہو (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ) اس فرمانِ خداوندی کا نازل ہونا تھا کہ قریش کے معزز سردار ملک حبش کے موٹے ہونٹ والے سیاہ رنگ کے حبشی سے بھی درجے میں نیچے ہوگئے اور فارسی النسل غلام اہلِ بیت نبوی میں شمار ہونے لگے۔ اسی مقدس تعلیم کا اثر تھا کہ ایک غریب اور بے مایہ حبشیؓ کے انتقال پر کسریٰ اور قیصر کی پر شوکت سلطنتوں کے مالک اور دنیائے اسلام کے زبردست شہنشاہ نے آبدیدہ ہو کر کہا ؎

اٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبرؐ — اٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا

یہ دنیا میں سب سے پہلی مثال تھی کہ اسلام نے اس زور اور اس شان کے ساتھ نسلی فخر و غرور کا خاتمہ کیا۔ اور تمام دنیا کے لوگوں کو اپنا بھائی اور اپنے جیسا انسان سمجھنے کی تلقین کی۔ نسلی منافرت کو دور کیا اور ایک دوسرے سے حسن سلوک کی تعلیم دی۔ رواداری کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہم دوسری قوموں کے افراد کو اپنے ہی جیسا انسان سمجھیں کیونکہ صرف اسی وقت ہم ان سے رواداری اور حسنِ سلوک کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے دوسروں کو ذلیل حقیر اور کم درجہ کا انسان سمجھا تو پھر محال ہے کہ ہم ان کے ساتھ کسی قسم کا سلوک یا رواداری برت سکیں۔ اپنوں سے سلوک و احسان کرنا ہر کوئی سکھاتا ہے مگر یہ صرف اسلام ہی تھا جس نے دنیا میں سب سے اول عالمگیر اخوت اور عالمگیر ہمدردی کی تعلیم دی۔ دیکھئے "حکیم مشرق" نے اسلام کی اس رواداری کی تعلیم کو کن الفاظ میں بیان کیا ہے کہتا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

یہ اسلام ہی ہے جس نے کسی قوم اور کسی نسلِ انسانی کو ذلیل اور حقیر نہیں ٹھیرایا۔ قرآن نے ساری دنیا کو مخاطب کر کے کہا (خلقکم من نفسٍ واحدۃ) اور اس طرح ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا۔ ہاں انسانی عزت کی بنیاد صرف نیکی اور خدائی فرمانبرداری پر رکھی۔ اسلام نے جو خدا پیش کیا وہ صرف بنو ہاشم

یا قریش کا خدا نہ تھا بلکہ "رب العالمین" تھا۔ اور جو رسول اس رب العالمین نے بھیجا وہ صرف بنو ہاشم یا محض اقوام عرب کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ "رحمت للعالمین" تھا۔ پس سوچئے اور غور کیجئے کہ اس سے زیادہ دوسروں کے ساتھ رواداری کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟

۲۔ آزادئ ضمیر | دوسری بات جو غیر مسلموں سے رواداری کے متعلق اسلام نے تلقین کی وہ آزادی ضمیر کا تسلیم کرنا ہے۔ اسلام نے آزادئ ضمیر کو انسان کا پیدائشی اور فطری حق سمجھا۔ جبر اور سختی کو حرام اور ناجائز بتایا اور اس بات کی سخت ممانعت فرمائی کہ کسی سے کوئی ایسی بات جبراً منوائی جائے جس کو اس کا ضمیر قبول نہ کرتا ہو اور اس بارہ میں صاف اور صریح طور پر فرمایا کہ لا اکراہ فی الدین یعنی مذہب کے معاملہ میں کسی زبردستی کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو اجازت دی کہ "من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر" (جو شخص چاہے مسلمان ہو جائے جو نہ چاہے انکار کر دے) ایک جگہ ارشاد فرمایا اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (ہم نے طریق حق سمجھا دیا ہے اب چاہے اسے مانو چاہے نہ مانو) جبر سے مسلمان کرنے کو اسلام نے نہایت نفرت کی نظر سے دیکھا ہے اور ایسے آدمیوں کا نام جو دل سے مسلمان نہ ہوئے ہوں بلکہ کسی طمع، ڈر یا جبر سے انھوں نے اسلام قبول کیا ہو، منافق رکھا ہے اور اسے اتنا بڑا جرم قرار دیا ہے کہ اس کی سزا جہنم کا سب سے نچلا حصہ قرار دی ہے (اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ) اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا اسلام نے کس سختی اور زور کے ساتھ خیال رکھا ہے اور کس قدر ان کا احترام کیا ہے اور اس معاملہ میں کس درجہ دوسروں سے رواداری برتی ہے۔

۳۔ مذاہب غیر سے محبت | تیسری رواداری جو اسلام نے غیر مسلموں سے برتی وہ یہ ہے کہ ان کے مذہب کے متعلق اپنے متبعین میں نفرت اور بغض پیدا نہیں کیا بلکہ طرح طرح سے محبت و تعلق کو بڑھایا ہے کبھی یہ کہہ کر کہ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا دوسری قوموں کے ہادیوں اور رہبروں کی بزرگی کو تسلیم کیا۔ کبھی یہ کہہ کر کہ لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ بت پرست قوموں کے دلوں میں محبت کا بیج بو دیا۔ کبھی یہ کہہ کر کہ فیھا کتب قیمۃ۔ یہ بتایا کہ اسلام مجموعہ ہے ان کل صداقتوں بھلائیوں اور خوبیوں کا جو کسی بھی مذہب میں پائی جاتی ہوں۔ یعنی یہ تسلیم کیا کہ دوسرے مذاہب بھی خوبیوں اور اچھائیوں سے خالی نہیں۔ کیا غیروں سے

رواداری کی اس سے بہتر مثال اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب میں بھی مل سکتی ہے؟

۴- دوسری قوموں کے مقدسوں کا احترام

اسلام نے ایک اعلیٰ درجہ کی رواداری کا نمونہ یہ دکھایا کہ یہود اور نصاریٰ کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو خدا کا فرستادہ اور سچا نبی تسلیم کیا۔ انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح (نساء آیت ۱۶۲) اور جو کتابیں یہود و نصاریٰ الہامی مانتے تھے خود بھی انھیں الہامی اور منجانب اللہ تسلیم کیا۔ (انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی ونور و اتینہ الانجیل فیہ ھدی ونور) اور اس طرح یہود و نصاریٰ کی طرف ایک محبت کا ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت یہی دو نہایت مشہور اور نمایاں مذہب تھے۔ باقی تمام مذاہب کے متعلق بھی اس بات کو تسلیم کیا کہ ہر قوم و ملت میں خدا کے نبی آتے رہے (وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر) مطلب یہ ہے کہ دیگر تمام مذاہب کے مقدس بزرگوں کی عزت کو مسلمان کی نظر میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا اور مسلمان کو کسی دوسرے کے مذہبی پیشوا کو برا کہنے سے قطعی طور پر روک دیا اور اس طرح ایک عالمگیر اخوت، ہمدردی اور رواداری کی بنیاد دنیا میں قائم کی جس کا اسلام سے پہلے نام و نشان بھی نہ تھا۔

۵- دوسروں سے عدل و انصاف کا حکم

پانچویں رواداری بڑی ہی عجیب و غریب ہے جس کا قانون اسلام نے غیر مسلموں کے متعلق مقرر فرمایا ہے اور وہ ہے ہر حالت میں عدل و انصاف۔ اسلام نے حکم دیا کہ حالات خواہ کیسے ہی ہوں تم سے دوسرے لوگ خواہ کتنی ہی دشمنی کریں مگر تم کسی حال میں بھی عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ دو۔ فرمایا لایجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ یعنی کسی قوم کی دشمنی اور عداوت تم کو اس بات کا ملزم نہ کر دے کہ تم موقع پر عدل و انصاف نہ کرو۔ نہیں خواہ تم سے کوئی کتنی ہی دشمنی کرے مگر تم جب اس کے متعلق کوئی بات کہو انصاف سے کہو اگر تمہارے ساتھ کسی کی دشمنی ہے تو اس کی ہر بات میں کیڑے نہ ڈالو۔ دشمن اور مخالف کی جو اچھی بات دیکھو بیشک اسے تسلیم کرو۔ اگر کبھی کوئی معاملہ پیش آجائے تو محض اس وجہ سے کہ فریق ثانی تمہارا دشمن ہے تم بددیانتی نہ کرنا بلکہ ٹھیک ٹھیک قانون و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا۔ کیونکہ یہی نیک بختی کی علامت ہے۔ غور کیجئے کتنا بہترین اور کتنا بے نظیر قانون یہ اسلام نے بنایا۔ یوں سمجھئے کہ یہ قانون بنا کر اسلام نے جتنی مراعات غیر مسلموں کو دی جاسکتی تھیں سب دیدیں۔ اور ان کو اس بات سے بالکل بے خوف کر دیا۔ کہ مسلمان ان کے ساتھ کوئی زیادتی

کریں گے پاک ہے وہ نبی جو ایسی حکمت اور صداقت کی باتیں ہم تک لایا صلی اللہ علیہ وسلم۔

۶۔ دشمنوں سے نیک برتاؤ — اپنے دشمنوں سے سخت اور صعب حالتوں میں بھی اسلام نے اعلیٰ درجہ کی رواداری ہی برتنے کی تعلیم دی ہے فرمایا ادفع بالتی ھی احسن۔ دشمن کی بدی اور برائی کا ایسی خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ دفعیہ کرو کہ (فاذا الذی بینك وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم) یعنی وہ جو سخت دشمن ہی گہرا دوست بن جائے بتلائیے دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے؟ بس یہ انتہا ہے۔

۷۔ عام طور پر حسنِ سلوک کی تعلیم — اللہ تعالیٰ نے ایک عام رواداری اور حسنِ سلوک کا ارشاد کس جامعیت کے ساتھ فرمایا ہے چنانچہ حکم دیا ہے کہ واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا وبذی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم ان اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً۔ یعنی اللہ کی عبادت کرو اور اس کی عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ اپنے والدین کے ساتھ احسان کرو اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھی اور یتیموں، مسکینوں، اور پڑوسیوں کے ساتھ خواہ دور کے ہوں یا پاس کے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ۔ مسافروں اور غلاموں کے ساتھ۔ غرض سب کے ساتھ احسان مروت اور سلوک کرو۔ نہ تمہیں یہ غرور ہو کہ تم نسل میں ان سے اعلیٰ ہو اس لئے انھیں ذلیل سمجھو۔ نہ تمہیں یہ تکبر ہو کہ تم طاقت میں یا دولت میں ان سے بڑھے ہوئے ہو اور اس لئے وہ حقیر ہیں۔ جانے رہو کہ اللہ تعالیٰ نہ متکبر کو پسند فرماتا ہے اور نہ شیخی باز کو۔ اس آیت میں جن جن لوگوں سے احسان و مروت کرنے کی تعلیم دی گئی ہے ہرگز اس میں کوئی تخصیص ان کے مذہب کی نہیں کی گئی۔ خواہ وہ لوگ مسلمان ہوں یا کافر۔ بہرحال ان کے ساتھ احسان کرو۔

۸۔ غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک — ایک مقام پر تو قرآن کریم نے نہایت ہی صاف اور کھلے الفاظ میں غیر مسلموں سے رواداری حسن سلوک اور احسان و مروت کی تعلیم دی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ جن لوگوں نے تم سے مذہب کی بنا پر جنگ نہیں کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا تم ان سے احسان اور مروت سے پیش آؤ اور ان کے

ساتھ انصاف کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

آخری فقرہ میں گویا اس امر کی تاکید کی ہے کہ ضرور ایسے اشخاص سے سلوک اور احسان کرو۔ آیت کے اگلے حصہ میں بیشک ایسے ظالموں سے علیحدہ رہنے کی ہدایت ہے جنہوں نے طرح طرح کی تکلیفیں مسلمانوں کو پہنچائیں اور کوئی دقیقہ ایذارسانی کا اٹھا نہ رکھا مگر وہاں بھی ایسے لوگوں سے صرف دوستی کرنے کی ممانعت کی ہے۔ باقی احسان و سلوک کو وہاں بھی منع نہیں کیا۔

۹۔ قیدیوں کے ساتھ سلوک کی تعلیم

آزاد تو پھر آزاد ہیں۔ اسلام نے تو یہاں تک رواداری برتی ہے کہ اپنے قیدیوں کے ساتھ بھی احسان اور سلوک کی تعلیم دی ہے اور ان کو بھی حقیر اور ذلیل نہیں سمجھنے دیا۔ مومنین کی صفت ہی خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ یطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما و اسیرا۔ یعنی وہ خدا کی محبت میں غریبوں یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس قیدی صرف وہی لوگ ہوتے تھے جو کافر مشرک ہوتے تھے کیونکہ وہی لڑائیوں میں گرفتار ہو کر آتے تھے۔ اسلام کی رحمت و شفقت دیکھیے کہ اس نے غیر مسلم قیدیوں کو بھی آرام سے رکھنے اور ان سے انتہائی رواداری برتنے کی تلقین فرمائی ہے۔

۱۰۔ غیروں سے احسان کرنے کے متعلق ایک عجیب تعلیم

غیر مسلموں سے حسن سلوک سے پیش آنے اور ان کے ساتھ ہر قسم کا احسان کرنے کے متعلق ایک آیت قرآن مجید کی بڑی عجیب ہے۔ سنئے ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتآء ذی القربیٰ۔ یعنی اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم ہر شخص سے عدل و احسان کا معاملہ کرو۔ یہی نہیں بلکہ احسان کرو اور پھر احسان بھی اس طرح کہ تمہارے دل میں خیال بھی نہ گذرے کہ یہ ہم اس شخص پر احسان کر رہے ہیں۔ بنی نوعِ انسان کے ساتھ رواداری برتنے اور ان کے ساتھ احسان و سلوک کرنے کی اس سے زیادہ جامع تعلیم کسی بھی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف اسلام ہی ہے جس میں ہر مسلمان کو بلا امتیاز ہر انسان کے ساتھ ہمدردی، احسان اور رواداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ کیا دنیا کا کوئی دوسرا مذہب بھی اپنی الہامی کتاب میں اس قسم کی ایک آیت پیش کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

۱۱۔ ظالم سے برتاؤ کی تعلیم

جب دشمنوں کے ظلم اور ان کی تعدیاں حد سے بڑھ جائیں تو پھر انھیں

سزا دینی بھی عین قانون انصاف کے مطابق ہے۔ مگر اس سزا کے متعلق بھی جو قانون اسلام نے بنایا ہے وہ بلاشبہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ سنئے جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفی واصلح فاجرہ علی اللہ یعنی برائی کا بدلہ صرف اسی قدر برائی ہے جتنی تمہارے ساتھ کی گئی ہے لیکن اگر معاف کرنے میں مخالف کی اصلاح ہوتی ہو تو پھر معاف ہی کردو۔ اللہ اللہ کتنی پرحکمت تعلیم ہے۔

۱۲۔ تبلیغ اور بحث کس طرح کی جائے اسلام ساری دنیا کے لوگوں کے لئے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے بھیجے گئے تھے (وما ارسلناک الا کافۃ للناس) پس ضروری ہوا کہ ساری دنیا کو دعوتِ حق پہنچائی جائے مگر اس تبلیغ میں بھی اسلام نے پوری پوری رواداری کو ملحوظ رکھا ہے۔ یعنی حکم دیا ہے کہ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ[1] والموعظۃ الحسنۃ[2] وجادلھم[3] بالتی ھی احسن۔ یعنی طریق حق کی طرف نہایت دانائی اور شیریں کلامی سے بلاؤ اور ان سے نہایت نرمی اور شائستگی کے ساتھ گفتگو کرو۔ اور اگر اس احتیاط کے باوجود بھی کسی احمق اور کندہ ناتراش سے سابقہ پڑجائے جو نہ اپنی کہے اور نہ دوسرے کی سنے تو پھر اس وقت اپنے رب سے اس کے دماغ کی سلامتی کی دعا مانگ کر خاموش ہوجاؤ واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما مطلب یہ ہے کہ بات بات پر اور قدم قدم پر غیر مسلموں سے اسلام نے اعلیٰ درجہ کی رواداری کی تعلیم دی ہے یہاں تک کہ بحث میں بھی کبھی گرم اور تیز گفتگو نہ ہونے پائے سانتہا ہے۔

۱۳۔ اپنی مسجدیں ہر قوم کیلئے کھول دیں ایک عظیم الشان رواداری کی تعلیم دنیا کے غیر مسلموں سے اسلام نے یہ دی کہ اپنی عبادت گاہیں ہر قوم وملت کے لئے خدا کی عبادت کے واسطے کھول دیں اور خدا کی اس زمین پر آباد شدہ ہر انسان کو اجازت دیدی کہ وہ آئے اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں اور مسجدوں میں اپنے مذہب کے طریقے کے موافق خدائے واحد کی عبادت کرے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے متعلق سخت ترین وعید فرمائی جو مسجدوں میں لوگوں کو خدا کی عبادت سے روکتے ہیں۔ ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ یعنی اس سے بڑھکر کون شخص ظالم ہوسکتا ہے جو لوگوں کو خدا کی مسجدوں میں خدا کے ذکر سے روکتا ہے۔ ایسے ظالموں کے لئے خدا فرماتا ہے کہ یہ بدبخت خود اس قابل نہیں کہ خدا کی مسجدوں میں ان کو داخل ہونے کی اجازت دی جائے

---

[1] فلسفی مزاج اور منطقی اشخاص کے لئے۔ [2] عوام کے واسطے۔ [3] فضول بحث مباحثہ کرنے والوں کے لئے۔

(اولٰئک ما کان لھم ان یدخلوھا الا خائفین) یہ تو ہوا ناراضگی کا اظہار۔ آگے ایسے لوگوں کی سزا کا بیان بھی فرما دیا اور صاف کہدیا کہ لھم فی الدنیا خزیٌ ولھم فی الاخرۃ عذابٌ عظیم یعنی مساجد میں ذکر خدا سے منع کرنے والے ظالم صفت لوگوں کے لئے اس دنیا میں ذلت اور رسوائی لکھدی گئی ہے اور اسی پر بس نہیں آخرت میں بھی ان کو اس جرم کے بدلے سخت عذاب دیا جائیگا۔

دوسری اقوام کی عبادت گاہوں کی حالت بتلائیے دنیا میں کونسا مذہب اور کونسی قوم ہے جس نے اپنے سوا دوسری قوموں کو اپنی عبادت گاہوں میں داخلے کی اجازت دیکر رواداری کا ثبوت دیا ہو، امریکہ کے اصلی باشندے اگر کبھی سفید رنگ فاتح اقوام کے گرجاؤں میں داخل ہو جاتے ہیں تو اس کی سزا میں انھیں زندہ آگ میں جلا دیا جاتا ہے۔ چند سال ہوئے ایسے ہی ایک واقعہ کی اطلاع اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔

عیسائیوں کے گرجا دور کیوں جائیے۔ یہاں ہندوستان ہی میں دیکھ لیجئے۔ یورپین عیسائیوں اور دیسی عیسائیوں کے گرجا علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے ہیں۔ یعنی دوسری قوموں سے تو درکنار خود اپنے ہم مذہبوں سے بھی کسی قسم کی رواداری نہیں برتی جاتی لیکن آپ نے آج تک کبھی نہ سنا ہوگا کہ امرا کے نماز پڑھنے کی مسجدیں اور ہیں غربا کی اور۔ خود کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی جو مسلمانوں کی تمام دنیا میں مقدس ترین عبادت گاہیں ہیں وہاں سلطانِ وقت بھی ہاتھ باندھ کر ادب سے خدا کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے اور ایک گدائے بے نوا بھی۔ نہ کسی قسم کی روک ٹوک ہے اور نہ کسی کی مجال ہے کہ روک سکے۔ شاہجہاں نے لاکھوں روپے خرچ کرکے دہلی میں شاہی مسجد بنائی لیکن وہ خود بھی اسی میں نماز پڑھتا رہا اور شہر کا غریب سے غریب باشندہ بھی اس کے دوش بدوش مصروف عبادت رہا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ حیدرآباد میں باغ عامہ کی مسجد میں فرمانروائے وقت حضور نظام بھی جمعہ کی نماز ادا فرماتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی شہر کے سینکڑوں غربا بھی نماز پڑھتے ہیں۔

ہندوؤں کے مندر عیسائیت کو چھوڑ کر ہندو مذہب پر نظر ڈالئے۔ آجکل اچھوتوں کے مندروں میں داخل ہونے کے متعلق ملک میں ہر طرف جنگ و جدل برپا ہے۔ اور کتنے گرما گرم مجادلے روزمرہ فریقین کے درمیان ہوتے رہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی جہاں کہیں اچھوتوں نے مندروں میں داخل ہونا چاہا ہے وہاں اکثر مقامات پر لٹھ بھی چل گئے ہیں۔ جہاں اچھوتوں کا رخ مندروں کی طرف دیکھا فوراً مہنت جی مہاراج نے

مقدس مندر کا دروازہ بند کیا۔ یاد رہے کہ یہ حال برادرانِ وطن کا ان لوگوں کے ساتھ ہے جن کو وہ اپنا کہتے نہیں تھکتے اور مردم شماری کے وقت جن کو ہندو لکھوانے کی کوشش میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں دوسرے تو پھر غیر ہیں۔ پس درود بھیجئے پاکبازوں کے اس سردار پر جس نے غیرت اور نفرت و حقارت کے ہر ایک ذرہ کو دلِ مسلم سے نکال کر پھینک دیا۔ اور دنیا میں کامل طور پر غیروں سے رواداری برتنے کی تلقین کی۔ کیونکہ اس کے بغیر دنیا کی مختلف اقوام میں محبت و یگانگت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

۱۴۔ دوسروں سے معاشرت کی تعلیم

اخلاق اور حسن معاشرت کے جو اصول اسلام نے تعلیم کئے ہیں وہ سارے کے سارے محبت یگانگت اور آپس کی ہمدردی کو بڑھانے والے ہیں اور وہ ایسے محکم اصول ہیں کہ آج بھی دنیا ان کو اصول تمدن و تہذیب کے لئے لازمی سمجھتی ہے۔ مگر دیکھنے کی خاص بات یہ ہے کہ اسلام نے اخلاقی اصول کے برتنے میں جہاں آپس میں ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھا ہے۔ وہاں دوسری قوموں سے معاشرت میں ان کے جذبات کا بھی خاص طور پر خیال رکھا ہے اور اس بات کی تاکید فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لینے اور دینے کے اوزان ایک ہی رکھے ہیں۔ جس بات کو اپنوں کے لئے ناپسند کیا ہے اس کی دوسروں کے لئے بھی ممانعت کر دی ہے۔ اور یہی اعلیٰ درجہ کی رواداری ہے جو اسلام نے دوسری قوموں کے ساتھ روا رکھی ہے۔ سنئے جہاں اپنوں کے متعلق اس بات کا حکم دیا ہے کہ یا ایھا الذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتیٰ تستأنسوا (اے مومنو! ایک دوسرے کے گھروں میں بغیر اجازت حاصل کئے داخل نہ ہوا کرو) وہاں غیروں کے متعلق بھی صاف طور پر بلکہ زیادہ سخت طریقہ سے ارشاد نبوی ہے کہ ان اللہ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتٰب الا باذن (بیشک اللہ نے تمہارے لئے یہ بات جائز نہیں رکھی کہ تم اہل کتاب کے گھروں میں ان کی بغیر اجازت داخل ہو)

۱۵۔ اشیاء خوردنی میں رواداری کی تعلیم

اسلام کے علاوہ بعض دوسری قوموں میں آپس میں اتنی معمولی رواداری بھی نہیں ہے کہ وہ آپس میں ایک جگہ بیٹھ کر ایک ساتھ کھانا بھی کھا سکیں۔ اگر کسی غیر نے ان کے برتنوں کو ہاتھ بھی لگا دیا تو برتن اور جو کچھ اس میں ہے سب ناپاک اور پھینک دینے کے قابل ہو گیا۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ جس مذہب میں اتنی معمولی سی رواداری بھی موجود نہیں وہ عالمگیر بننے

اور اصول فطرت کے مطابق ہونے کا کس طرح دعویٰ کر سکتا ہے۔ مگر اسلام نے یہ رواداری بھی نہایت فیاضی کے ساتھ غیر مسلموں سے برتی اور صاف فرمادیا کہ الیوم احل لکم الطیبٰت وطعام الذین اوتوا الکتٰب حل لکم (اے مسلمانو! تمام دنیا کی پاکیزہ چیزیں (خواہ کسی مذہب وملت کے افراد کے ملیں) تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں۔ ہاں بعض لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے ہاں کا کھانا بھی ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں؟ تو تمہیں اس کی بھی اجازت ہے مگر اس کے لئے بھی طیب کی شرط ضروری ہے۔ کیونکہ مسلم کو کسی ایسے کھانے یا خوراک کی اجازت نہیں دی گئی جس کے کھانے سے انسان کی صحت بگڑ جائے مثلاً مردار کا گوشت۔ یا جس کے کھانے سے کراہیت اور نفرت آئے جیسے خون وغیرہ یا اخلاق پر برا اثر پڑے مثلاً سور کا گوشت یا شراب وغیرہ۔ یا ایمان خراب ہو جیسے بتوں کے نام کی قربانیاں۔ ان چاروں باتوں کو قرآن حکیم نے نہایت ہی جامعیت کے ساتھ ایک چھوٹی سی آیت میں بیان فرمادیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ (تم پر مردار۔ خون۔ سور کا گوشت اور ہر وہ چیز حرام کردی گئی جو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے حلال کی جائے)۔

۱۲۔ ایفائے عہد کے ذریعے رواداری کی تعلیم

دوسروں سے رواداری کی ایک اعلیٰ تعلیم اسلام نے یہ دی کہ جو وعدہ ان سے کیا جائے وہ پورا کرو۔ حکومت۔ عزت۔ طاقت یا کبھی غرور تم کو وعدہ خلافی پر آمادہ نہ کرے۔ یہاں بھی اسلام نے وہی اصول برتا ہے۔ یعنی جہاں آپس داری میں یہ ارشاد فرمایا۔ اوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا (وعدہ کو پورا کرو۔ بیشک وعدہ کے متعلق آخرت میں پوچھا جائیگا) وہاں غیروں سے معاملہ کرتے وقت بھی اس بات کی تاکید فرمائی کہ فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم (جو عہد وپیمان ان سے کیا ہے اس کو اس کی مدت تک پورا کرو) جن مسلمانوں نے زمانۂ جاہلیت میں کسی شخص سے کوئی وعدہ یا اقرار کیا تھا مسلمان ہونے کے بعد اس کے ایفا کے متعلق انھوں نے حضورؐ سے دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا اَوْفُوْا بِحِلْفِ الْجَاهِلِيَّةِ فَاِنَّهٗ لَا يَزِيْدُهٗ (یعنی الاسلام) اِلَّا شِدَّةً (ترمذی) (یعنی جاہلیت کے وعدہ کو پورا کرو کیونکہ اسلام وفائے عہد کو اور زیادہ مضبوط کرنے کا حکم دیتا ہے)

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا مَنْ قَتَلَ معاھدا لم یر ح

رائحتہ الجنتہ (جس نے کسی ایسے شخص کو قتل کردیا جس سے معاہدہ ہو وہ آدمی جنت کی بو بھی نہیں پائیگا)
انھیں عبداللہ بن عمرو سے بخاری میں روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے عہد کو توڑ ڈالے
جھوٹ بولے۔ وعدہ خلافی کرے۔ لڑائی جھگڑے میں فحش بکے (یہ ساری باتیں خواہ اپنوں کے ساتھ
کرے یا غیر مسلموں کے ساتھ) وہ مسلمان نہیں بلکہ پکا منافق ہے اور منافق کے متعلق قرآنی وعید ہے کہ
ان المنٰفقین فی الدرک الاسفل من النار۔ یعنی منافقین دوزخ کے سب سے نچلے حصہ میں پھینکے جائینگے۔

۱۷۔ غیروں کی دلآزاری کے متعلق تعلیم اسلام نے رواداری اور اصولِ مساوات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک اعلیٰ پایہ کا
یہ قانون مقرر کیا کہ لوگوں کی دلآزاری کی ممانعت کردی چنانچہ ارشاد فرمایا لا یحب
اللہ الجھر بالسوٓء من القول الا من ظلم وکان اللہ سمیعاً علیماً۔ یعنی اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی
شخص کسی دوسرے آدمی کی نسبت کوئی دلآزار بات زبان سے نکالے (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) ہاں اگر کسی پر
ظلم ہوا ہو اور وہ اس کا اظہار کرے تو خیر۔ مگر اس اظہار ظلم میں بھی اس بات کا خاص طور پر یہ خیال
رکھے کہ مخالف کی طرف کوئی جھوٹ بات منسوب نہ کرے کیونکہ اللہ کو اصل حال کی بھی خبر ہے
اور جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو وہ بھی سنتا ہے۔

یہ قانون مقرر فرما کر اسلام نے بہت سے ان فتنوں کا دروازہ بند کردیا جو دوسروں کی
عیب جوئی یا دلآزاری سے پیدا ہوسکتے ہیں۔

حالتِ جنگ میں دشمنوں کے ساتھ سلوک کیمتعلق اسلامی تعلیم

یہ تو ہوئیں امن کی حالتیں۔ اگر لڑائی اور جنگ کا موقع پیش آجائے تو اسلام نے اس وقت بھی
دشمن سے انتہائی رواداری اور حسنِ سلوک کی تعلیم دی ہے۔ اگرچہ دشمنوں نے شدید دشمنی، قتل وغارت
ظلم وجور اور بے رحمی و بے دردی کی خود ابتدا کرنے اور اسے انتہا تک پہنچا دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی
تھی مگر اسلام نے ایسے صعب وقت میں جبکہ بڑے سے بڑے متحمل اور بردبار انسان کے ہاتھ سے
بھی رشتۂ صبر چھوٹ جاتا ہے اعلیٰ درجہ کی ہمدردی۔ انتہائی رواداری اور بے مثل تحمل کی تعلیم دی

خدا کے ہزاروں ہزار درود و سلام ہوں اس انسان کامل پر جس نے اپنی ذات میں اس ہمدردی، رواداری اور تحمل کا ایسا محیر العقول نمونہ دکھایا کہ دنیا ششدر رہ گئی۔

مسلمانوں نے تلوار کیوں ہاتھ میں لی؟

اس معاملہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اور وہ ایسے کیا حالات تھے جن کے باعث مجبور ہو کر مسلمانوں کو تلوار ہاتھ میں لینی پڑی؟

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کفار کا ظلم سہتے سہتے مسلمان عاجز آگئے تو مجبور ہو کر بے سروسامانی کی حالت میں مکہ سے نکلے اور مدینہ میں جا بسے۔ مگر یہاں بھی تکالیف کا خاتمہ نہ ہوا۔ انتہا یہ کہ دین اسلام کو دنیا سے ملیامیٹ کر دینے اور بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شہید کر دینے کے لئے ایک جرار لشکر لیکر کفار مکہ نے مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ اس انتہائی مجبوری کی حالت میں سوائے اس کے کیا چارۂ کار باقی رہ گیا کہ تلوار کا تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔ تاہم خدائے برحق کے مٹھی بھر پرستار آسمانی آواز اور خدائی حکم کے منتظر تھے۔ چنانچہ عین موقع پر خدا کا پاک فرشتہ پیغام لایا۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۔ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا۔ یعنی ان لوگوں کو جن پر ظلم ہوا اور جو ناحق اپنے گھروں سے نکالدیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ لڑائی کی اجازت دی گئی اور اللہ تعالیٰ یقیناً ان کی امداد پر قادر ہے اگر ایسی اجازت نہ دی جائے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے نہ ہٹاتا رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ پھر لوگ تعصب اور جہالت کی وجہ سے معبد، گرجا، عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں خدا کی پرستش کی جاتی ہے ڈھا دیں۔

دیکھئے اور غور کیجئے یہ کتنی عظیم الشان رواداری ہے جو اسلام نے تمام غیر مسلموں کے ساتھ برتی۔ یعنی ان کی عبادتگاہوں کی حفاظت کیلئے اگر ضرورت پڑے تو اجازت دی کہ بیشک مسلمان تلوار سے کام لیں اس سے بڑھکر یا کم از کم اس کے برابر ہی دنیا کا کوئی مذہب رواداری کی تعلیم ہمیں اپنی کتاب سے نکالکر دکھادے تو ہم جانیں۔

میدان جنگ میں بے نظیر رواداری کی تعلیم

اسلام نے حالتِ جنگ میں بھی دشمن سے پوری پوری رواداری برتنے کی تلقین کی ہے۔ مثلاً

(۱) جنگ میں خود پیش قدمی سے روکا۔

(۲) ظلم وزیادتی کی ممانعت کی۔

(۳) جنگ کی صرف اس وقت تک اجازت دی جب تک کہ فتنہ وفساد فرو نہ ہوجائے۔

(۴) دشمن کے قاصدوں کو امن دیا۔

(۵) دشمن کی عورتوں، بچوں اور معذور لوگوں کو مارنے سے منع کیا۔

(۶) سرسبز کھیتوں اور پھلدار درختوں کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی۔

(۷) عبادت گاہوں کو ڈھانے اور تارک الدنیا عابدوں اور مذہبی بزرگوں کو قتل کرنے سے روکا۔

(۸) اسیرانِ جنگ کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت فرمائی۔

(۹) دشمن اپنے کو کمزور دیکھ کر اگر صلح کی درخواست کرے تو اسے قبول کرلینے کا ارشاد فرمایا۔

(۱۰) نقض عہد کی ممانعت فرمائی۔

(۱۱) پناہ میں آجانے والے غیر مسلم کو امن دینے اور عافیت سے رکھنے کی تاکید فرمائی۔

(۱۲) محض مالِ غنیمت کی غرض سے جہاد کرنے کی ممانعت فرمائی۔

(۱۳) لوٹ کے مال کو مالِ حرام فرمایا۔

(۱۴) معاہدہ کرنے والے ذمیوں کی جان ومال کی پوری پوری حفاظت کا مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھیرایا

اب ہم نمبروار ہر ایک بات کو لیتے ہیں اور سب باتوں کے متعلق مختصر طور پر احکام خداوندی اور ارشادات نبوی بتانے کے بعد مضمون کے اس حصہ کو ختم کرتے ہیں۔

۱۔ پیشقدمی کی ممانعت

(۱) ولا تقتلوھم عند المسجد الحرام حتی یقتلوکم فیہ۔ جب تک کافر تم سے نہ لڑیں تم بھی پیشقدمی نہ کرو۔

۲۔ ظلم کی ممانعت

(۲) وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی ہرگز نہ کرو۔ اللہ کو ایسے آدمی پسند نہیں۔ یہاں صرف ان لوگوں سے لڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔ جنھوں نے خود لڑنے میں سبقت کی اور لشکر لیکر چڑھ آئے۔ مگر شانِ رواداری دیکھیے کہ اس پر بھی مسلمانوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ دیکھنا کہیں کافروں پر زیادتی نہ ہونے پائے اور فی سبیل اللہ کا لفظ فرما کر اس بات کی بھی تاکید فرمائی کہ کافروں سے جنگ اپنے ذاتی اغراض اور ذاتی دشمنی کی وجہ سے نہ ہو بلکہ محض خدا کے واسطے اور رضائے الٰہی کے لئے ہو ورنہ بیکار اور فضول ہے۔

۳۔ ناحق لڑنے کی ممانعت | (۳) وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین للہ۔ یعنی وہاں تک لڑو کہ ملک میں فتنہ وفساد باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ تمہاری جنگیں اور تمہاری لڑائیاں کفار اور دوسرے لوگوں سے اس وقت تک رہیں جبتک کہ ملک میں فتنہ وفساد برپا رہے اور جب تک خدا کے بندوں کو یہ فسادی لوگ مذہب کی بنا پر دکھ اور تکلیف پہنچانے سے قطعی طور پر باز نہ آجائیں۔ اور لوگوں کو خدا کے دین پر چلنے میں پوری پوری آزادی حاصل نہ ہو جائے۔ کسی پر کوئی شخص مذہبی لحاظ سے جبر اور سختی نہ کر سکے۔ جب امن کی یہ حالت پیدا ہو جائے تو پھر فوراً ہتھیار رکھ دو۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ خدا نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت صرف اس لئے دی کہ انسان کی رائے اور ضمیر کو کامل آزادی مل جائے۔ حکومت و سلطنت اور شوکت وغلبہ ان جنگوں کا مقصد ہرگز نہ تھا اور یہ بہت بڑی رواداری ہے جو اسلام نے تمام دنیا کی اقوام سے ملحوظ رکھی کہ ہر شخص کو رائے اور ضمیر کی آزادی عطا فرمائی۔ نہ صرف یہ بلکہ جہاں یہ آزادی حاصل نہ ہو وہاں مسلمانوں کو حکم دیا کہ بزور شمشیر دنیا میں اس آزادی کو قائم کر دیں اور جب تک ہر شخص کو یہ آزادی حاصل نہ ہو جائے تلوار میان میں نہ کریں۔

۴۔ قاصدوں سے حسن سلوک کی تعلیم | (۴) اسلام سے پہلے عام دستور تھا کہ جہاں کوئی بادشاہ کسی دوسرے بادشاہ کے ایلچی اور قاصد سے کسی بات پر ناراض ہوا فوراً اس کو قتل کر دیتا تھا۔ [۱]

---

[۱] سیرۃ النبی شبلی ج ۱ ص ۵۵۱۔

مگر یہ اسلام ہی ہے جس نے سب سے اول دشمن کے قاصد کا یہ حق قائم کیا کہ اسے قتل نہ کیا جائے چنانچہ ایک مرتبہ مسیلمہ کذاب کے دو قاصدوں نے جب بارگاہِ رسالت میں گستاخانہ کلام کیا تو حضورؐ نے فرمایا۔ لو کنت قاتلاً رسولاً لقتلتکما (اگر میں قاصد کو قتل کردینے والا ہوتا تو تم کو ابھی قتل کردیتا) حدیث کے راوی عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد سے یہ طریقہ قانون بن گیا کہ ایلچی کو ہرگز قتل نہ کیا جائے اگرچہ وہ اپنی بدزبانی کی وجہ سے مستحقِ قتل ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ کمزوروں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تعلیم

(۵) صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل النساء والصبیان (آنحضورؐ نے جنگ میں عورتوں اور بچوں کے قتل سے روکا ہے) جب حضورؐ کوئی مہم کہیں روانہ فرماتے تو سردار لشکر کو لازمی طور پر حکم دیتے۔ لا تقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً ولا صغیراً ولا امرأۃ (ابوداؤد ج ص ۱۰) یعنی کسی کہن سال بوڑھے کو قتل کرو نہ کسی بچے کو، نہ کسی کم سن کو اور نہ کسی عورت کو۔

ایسے وقت میں جبکہ جنگ وجدل کے بادل ہر طرف چھائے ہوئے ہوں۔ دوست دشمن کی تمیز اٹھ گئی ہو۔ ہر ایک طرح سے دشمن پر غلبہ کی تدبیر کی جاتی ہو۔ اس وقت بھی اس انسان کامل نے اعلیٰ درجہ کی رواداری کی تعلیم اپنے پیرووں کو دی کہ عورتیں اور بچے جو لڑ نہیں سکتے انھیں مت مارو۔ اگرچہ ان کے جوانوں سے تمہیں کتنا ہی نقصان پہنچے۔

۶، ۷۔ سرسبز درختوں کے کاٹنے اور دشمن کی عبادتگاہوں کو گرانے کی تعلیم

(۶-۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے فوراً بعد جب حضرت صدیق اکبرؓ جیش اسامہ کو روانہ فرمانے لگے تو ان کو منجملہ اور نصیحتوں کے نہایت زور کے ساتھ یہ بھی تاکید کی کہ:۔

لا تخونوا ولا تغلوا ولا تحذروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا الطفل ولا الشیخ ولا المرأۃ ولا تعرقوا نخلاً ولا تحرقوا ولا تقطعوا شجرۃ ولا تذبحوا شاۃ ولا بقرۃ ولا بعیراً الا لاکل واذا مررتم بقوم فرغوا انفسہم فی الصوامع فدعوا ھم وما فرغوا انفسہم لہ۔

(ابن خلدون ج ۲۔ الجزء الثانی ص ۶۵) یعنی نہ خیانت کرنا۔ نہ دھوکا دینا۔ بدعہدی نہ کرنا۔

کسی شخص کے ہاتھ کان ناک وغیرہ نہ کاٹنا۔ نہ کسی بچے۔ بوڑھے اور عورت کو قتل کرنا۔ نہ کسی کھجور کے پیڑ کو جڑ سے اکھاڑنا۔ نہ کسی پھلدار درخت کو جلانا اور نہ کاٹنا۔ غذا کی ضرورت کے سوا نہ کسی بکری کو ذبح کرنا۔ نہ کسی گائے کو اور نہ کسی اونٹ کو۔ اور جب تم راہبوں کے صومعوں کے پاس سے گزرو تو ان سے اور ان کے گرجوں سے کچھ تعرض نہ کرو۔ اور ان کے حال پر چھوڑ دو۔

۸۔ اسیرانِ جنگ کے متعلق تعلیم

(۸) اسیرانِ جنگ کے ساتھ اسلام سے قبل فاتح نہایت برا برتاؤ کرتے تھے نہ انھیں کھانے کو دیتے نہ ان کی خبر گیری کرتے۔ اسلام کے بعد بھی جب کبھی مسلمان کسی جنگ میں غیر قوموں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے ہیں تو انھوں نے ان کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں جب مشہور سیاح ابن جبیر کا جزیرہ سسلی میں گذر ہوا تو اس نے وہاں مسلمان قیدی دیکھے جو عیسائیوں کے ہاتھ میں قید تھے اور وہ ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دے رہے تھے۔ ابن جبیر کے الفاظ یہ ہیں۔

ومن الفجائع التی یحاینھا من حل بلادھم اسری المسلمین یرسفون فی القیود ویصرفون فی الخدمة الشاقة والاسیرات المسلمات کذلک فی سوقھن خلاخیل الحدید فتنفطر لھم الافئدة (سفرنامہ ابن جبیر مطبوعہ لیڈن ص ۳۰۷) یعنی منجملہ اور دیگر درد انگیز مناظر کے جو یہاں کے شہروں میں نظر آتے ہیں وہ مسلمان قیدی ہیں جو بیڑیاں پہنے دکھائی دیتے ہیں اور ان سے نہایت شدید اور سخت محنت لی جاتی ہے جو مسلمان عورتیں قید ہیں ان کی پنڈلیوں میں لوہے کے وزنی کڑے پڑے ہوئے ہیں اور ان سے اتنی سخت مشقت لی جاتی ہے کہ دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے۔

دیکھا آپ نے غیر قوموں کا سلوک اور برتاؤ اپنے اسیرانِ جنگ سے۔ اب آیئے اسلام کی طرف۔ وہاں ہم صاف لکھا ہوا پاتے ہیں کہ سچے مومن کی نشانی ہی یہ ہے کہ وہ قیدیوں کو آرام سے رکھے اور ان کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکیناً ویتیماً واسیراً علیٰ حبہ

کا مطلب یہ ہے کہ اسیروں کے ساتھ سلوک دنیوی اغراض کے لئے نہ ہو بلکہ محض خدا تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے ہو۔ اور یہ سمجھکر ہو کہ یہ بھی اسی خدا کی مخلوق ہے جس کے ہم بندے ہیں۔ اس آیت کے بعد صحابہؓ کا یہ طرزِ عمل تھا کہ خود بھوکے رہتے اور اسیرانِ جنگ کو کھانا کھلاتے تھے۔ (سیرۃ النبی ج ا ص ۵۵۲)

۹۔ درخواستِ صلح قبول کر لینے کی تعلیم

(۹) ارشادِ خداوندی ہے کہ وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ۔ اگر کافر صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کر لو۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ یہ اس لئے فرمایا کہ اسلام کا اصل مقصد یہ ہے کہ کسی طرح دنیا میں امن قائم ہو جائے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اگر کچھ دبنا بھی پڑے تو دبو۔

۱۰۔ بدعہدی کی ممانعت

(۱۰) نقضِ عہد کے متعلق تمام تفصیل اوپر آچکی ہے۔ اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ عہدِ نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں پابندیٔ عہد کی حیرت انگیز مثالیں کتبِ تواریخ میں مذکور ہیں۔

۱۱۔ پناہ میں آئے ہوئے شخص کے متعلق تعلیم

(۱۱) اگر کوئی غیر مسلم دشمن ایامِ جنگ میں مسلمانوں کے ہاں اس غرض سے آئے کہ مذہب کے متعلق کچھ تحقیق کرے تو اس کے متعلق کمال رواداری سے کام لیکر اسلام نے یہ قانون بنا دیا کہ جب تک وہ مسلمانوں میں رہے اس کی جان اور مال پورے طور پر امن میں ہیں۔ اور کوئی اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور جب وہ جانا چاہے تو مسلمانوں کا فرض قرار دیا کہ اسے امن اور حفاظت کی جگہ پہنچا دیں۔ (وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتیٰ یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ) یعنی مشرکین میں سے اگر کوئی شخص تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو۔ اور دینِ حق کی اسے اچھی طرح تبلیغ کر دو۔ پھر اس کو اس کے امن کی جگہ حفاظت سے واپس پہنچا دو۔

۱۲۔ محض لالچ کے لئے جہاد کی ممانعت

(۱۲) ایک شخص نے آنحضورؐ سے سوال کیا کہ رجل یرید الجھاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا فقال النبی لا اجر لہ۔ (ابوداؤد) یعنی کوئی آدمی خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی یہ بھی خواہش ہے کہ کچھ دنیوی فائدہ (مالِ غنیمت) بھی حاصل ہو جائے۔ اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ حضورؐ نے فرمایا اسے جہاد کا کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

یعنی مطلب یہ ہے کہ جہاد امن قائم کرنے کے لئے اور محض رضائے الٰہی کے واسطے ہو۔ مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے جو جہاد کیا جائے خدا کے نزدیک اس کی کوئی وقعت نہیں۔

۱۳۔ مالِ غنیمت کے متعلق تعلیم

(۱۳) عام دستور تھا کہ جب فوج اپنی جگہ سے چلتی تو راستہ میں جو کچھ نظر آتا اسے سپاہی لوٹ لیتے اور اپنے تصرف میں لے آتے۔ اور اس کا نتیجہ تھا کہ فوج کے گزرنے کے بعد راستوں میں لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا بازار گرم ہو جاتا۔ اسلام آیا تو اس نے اس حرکت کی سخت ممانعت کر دی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب فوج نے چند بکریاں پکڑ کر ذبح کر ڈالیں تو حضورؐ نے پکی ہوئی ہانڈیاں خود دستِ مبارک سے اٹھا اٹھا کر پھینکدیں اور ارشاد فرمایا "لوٹ کا مال مردار گوشت کی مانند ہے۔" (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد جلد ثانی) دیکھئے یہ حکم دیکر اسلام نے لوگوں کے مال کی کس قدر حفاظت فرمادی اور ان کو لٹنے سے بچادیا۔ بتلایئے اس سے زیادہ دشمن کے ساتھ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے؟

۱۴۔ ذمیوں کی حفاظت کے متعلق تعلیم

(۱۴) ذمی ان لوگوں کو کہتے ہیں جو مسلمان نہ ہوں مگر مسلمانوں کے ملک میں سکونت رکھیں۔ ایسی غیر مسلم رعایا کے ساتھ جو حیرت انگیز رعایتیں اسلام نے برتی ہیں۔ جس فیاضی کے ساتھ ان کو شہری حقوق عطا کئے ہیں اور جس قدر رواداری کے ساتھ ان سے برتاؤ کیا ہے اس کی نظیر بلاشبہ اس دورِ تمدن و تہذیب میں بھی نہیں ملتی۔

وہ حقوق جو ذمیوں کو حضورؐ نے دیئے

ذمیوں کو جو شہری اور معاشرتی حقوق آنحضورؐ نے مرحمت فرمائے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جب کوئی شخص ان پر حملہ آور ہوگا تو مسلمان ان کی طرف سے اس کی مدافعت کریں گے۔

(۲) ان کو ان کے موجودہ مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا۔ (اپنی خوشی اور مرضی سے کوئی شخص اپنے مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہو جائے تو یہ علیحدہ بات ہے)

(۳) جزیہ (حفاظت کا معمولی معاوضہ) لینے کے لئے خود وصول کنندہ رعایا کے پاس آیا کرے گا رعایا کو اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(۴) ان کی جانیں محفوظ رہیں گی۔

(۵) ان کے مال کی حفاظت کی جائیگی اور ظلم یا جبر سے ان سے ایک پائی بھی وصول نہیں کی جائیگی۔

(۶) ان کے تجارتی اور معمولی قانون کی اندرونِ ملک میں پوری پوری حفاظت کی جائیگی۔

(۷) ہر وہ چیز جو کسی ذمی کے قبضہ میں ہے اسی کے قبضہ میں رہیگی۔

(۸) پادری۔ رہبان اور عبادت گاہوں کے پجاری اپنے موجودہ عہدوں سے علیحدہ نہیں کئے جائینگے

(۹) صلیبوں اور بتوں وغیرہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا (یہ علیحدہ بات ہے کہ قومیں مسلمان ہونے کے بعد خود اپنے بتوں اور صلیبوں کو توڑ دیں)

(۱۰) ان سے عشر نہیں لیا جائے گا۔

(۱۱) ان کے ملک میں فوج نہیں بھیجی جائے گی اور نہ فوج گذرتے ہوئے ان کے علاقہ میں کسی قسم کی تباہی پھیلائے گی۔

(۱۲) ان کو وہ سارے حقوق حاصل رہیں گے جو اس سے پہلی سلطنت میں ان کو حاصل تھے۔

(۱۳) یہ حقوق ان لوگوں پر بھی حاوی ہوں گے جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔ حاضر غائب کو سنادیں اور غائب سن کران پر کار بند ہوں۔ (فتوح البلدان)

غور کیجئے اور تلاش فرمائیے کہ اپنی رعایا کے ساتھ یہ روادارانہ برتاؤ اسلام سے پہلے یا بعد میں کسی سلطنت یا بادشاہ نے کیا تھا؟ تاریخ کے صفحات آپ کو اس کے جواب سے ساکت نظر آئینگے پس مجھے کہنے دیجئے کہ یہ رواداری کا سلوک اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اور اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک زبردست دلیل۔

یہ ہے جنگ کے متعلق اسلام کا برتاؤ غیر مسلموں کے ساتھ۔ جس کی تفصیل ہم نے اوپر لکھی۔ اس کو پڑھکر یہ حقیقت آئینہ ہوجاتی ہے کہ جنگ جو اسلام سے پہلے ہر طرح کے ظلم وستم اور جہالت ووحشت کا مجموعہ تھی۔ اسلام کی مقدس تعلیم نے اس کو اعلائے کلمۃ اللہ۔ قیام امن رفع مفاسد اور اعانتِ مظلوم کی صورت میں بدل دیا۔ اللہ کی ہزاروں برکتیں نازل ہوں اس پاک نبیؐ پر جس کے وسیلے سے ہم کو ایسا پاکیزہ اور ایسا بہترین مذہب ملا۔ صلی اللہ علیہ وسلم

غیر مسلموں کے متعلق اسلام کی جو رواداراتہ تعلیم تھی اس کی تفصیلات ہم ختم کر چکے۔ اب نہایت مختصر طور پر یہ بتلائیں گے کہ آنحضورؐ کا عمل اور آپ کا برتاؤ غیر مسلموں کے ساتھ کیسا تھا۔ تاکہ قول اور عمل دونوں ناظرین کے سامنے آجائیں۔

(ب) آنحضرتؐ کا سلوک غیر مسلموں کے ساتھ

عرب میں بالعموم دو قومیں آباد تھیں۔ ایک بت پرست اور دوسرے اہل کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) اور انھیں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واسطہ پڑا۔ اب ہم علیحدہ علیحدہ دکھلائیں گے کہ رحمت للعالمینؐ نے ان دونوں قوموں سے کیسا برتاؤ کیا؟

ا۔ بُت پرستوں کے ساتھ حضورؐ کا برتاؤ

بجائے بددُعا کے دعائے ہدایت

کفار مکہ کے ظلموں پر صبر | یہ وہ لوگ تھے جو آپ کے ہم قبیلہ اور ہم وطن تھے اور انہی کو آنحضرت صلعم نے سب سے پہلے تبلیغ کی جو جو تکلیفیں اور اذیتیں کفار مکہ نے اس "جرم" میں آپ کو اور آپ کے ماننے والے نفوس مقدسہ کو دیں قلم میں طاقت نہیں کہ ان کی تفصیل لکھ سکے۔ مختصر یہ کہ کوئی تکلیف ایسی باقی نہ رہی جو پیغمبر امنؐ کو پہنچا کر کفار نے راحت محسوس نہ کی ہو۔ اور کوئی اذیت ایسی نہ رہی جسے مسلمانوں کو دیکر قریش نے خوشی نہ منائی ہو۔ خدا کا رسول ان سب آلام و مصائب کو نہایت صبر کے ساتھ برداشت کرتا رہا۔ اور کوئی کلمہ بددعا کا ان کے متعلق استعمال نہیں کیا اور جب ایک صحابی (خباب بن ارت) نے اس مسلسل تکلیف دہی سے تنگ آکر بارگاہِ رسالت میں ایسے ملعونوں کے لئے بددعا کی درخواست کی تو حضورؐ نے فرمایا۔ ابھی سے گھبرا گئے۔ تم سے پہلے تو ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے گئے اور انھوں نے اُف تک نہ کی۔ تاہم صبر کرو۔ یہ فساد اور بدامنی کا دور عنقریب ختم ہوا جاتا ہے اور تم دیکھو گے کہ ایک شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک تنہا سفر کرے گا اور امن و سلامتی کا یہ عالم ہوگا کہ

(آج جہاں خدا کے رسول کو بھی امن نہیں وہاں) اسے سوائے خدا کے اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔

اہلِ طائف کا سلوک آپ کے ساتھ | مکی زندگی کے دوران میں جب سرورِ عالم طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے باشندوں کو خدا کا مقدس پیغام پہنچایا تو سعادتمندی سے قبول کرنے کی بجائے بدمعاشوں نے شیطانوں کو فرشتہ رحمت کے پیچھے لگادیا جنھوں نے اتنے پتھر مارے کہ حضور اپنے ہوش میں نہیں رہے۔ اور جسم مبارک سے خون نکل کر جوتیوں میں جم گیا۔ جانتے ہو اس سلوک کا بدلہ رحمت للعالمین نے کیا دیا؟ جب خدا کا پیغام پہنچا کہ کہو تو پتھروں کی بارش سے اس خبیث قوم کو ہلاک کردیا جائے؟ تو بے اختیار اس قدسی صفت انسان کی زبان سے نکلا "نہیں میں نہیں چاہتا۔ شاید ان کی اولاد ہی مسلمان ہوجائے۔" (صحیح مسلم) مقابلہ کرو اس رحمت۔ اس رواداری اور اس ہمدردی کا۔ اس واقعہ سے جب کہ عالی مرتبت انسان (نوحؑ) نے ایک ایسے ہی موقع پر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بڑے ہی دردانگیز لہجے میں کہا تھا رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراً۔ (پ ۲۹ ع ۱۰) اے پروردگار زمین پر کسی کافر کو چلتا پھرتا باقی نہ چھوڑیو۔

ہجرت کا منظر | مصیبتیں اٹھانے کی ایک انتہا اور تکلیفیں سہنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب یہ ناقابلِ برداشت ہوگئیں اور کفار مکہ تلواریں سونت سونت کر آپ کو قتل کرنے کے لئے آپ کے مکان کے گرد جمع ہوگئے تو اس وقت انتہائی مجبوری کی حالت میں خدا کا رسول رات کی تاریکی میں محب صمیم کو ساتھ لیکر اور چچازاد بھائی کو پلنگ پر لٹا کر مکہ سے یہ کہتے ہوئے نکل گیا کہ "اے زمینِ مکہ تو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے مگر کیا کروں تیرے فرزند مجھے یہاں نہیں رہنے دیتے" لیکن کوئی کلمہ بددعا یا اظہار غضب کا اس وقت بھی استعمال نہ کیا۔ اتنے لمبے اور اس قدر پرخطر سفر کے لئے یقیناً ایک تجربہ کار، جہاندیدہ اور جاں نثار ساتھی کی ضرورت تھی۔ صدیق اکبرؓ سے زیادہ موزوں اس کام کے لئے اور کون ہوسکتا تھا۔ حیدر کرار کو پلنگ پر کیوں لٹایا؟ اس لئے کہ پاس امانت، عدل وانصاف اور رواداری کی ایک اعلیٰ ترین مثال دنیا میں قائم کرنی تھی۔ یعنی جو امانتیں کفار کی حضورؐ کے پاس رکھی تھیں ان کو ان کے مالکوں تک صحیح سلامت پہنچادو اور پھر میرے پاس مدینہ چلے آؤ تاکہ بعد میں

کوئی یہ نہ کہے کہ محمد ہماری امانت لیکر چلا گیا۔

واقعہ ہجرت کی دو تصویریں | ذرا مقابلہ تو کرو اس واقعہ کا اس واقعہ سے جبکہ ایسے ہی ظالموں سے عاجز آکر بنی اسرائیل کا سردار اپنی قوم کو لیکر راتوں رات مصر سے نکلا تھا۔ وہاں کیا ہوا تھا؟ اس کہانی کو توریت کی زبانی سنو:-

مصر سے چلتے وقت موسیٰ نے خداوندی کی ہدایت کے موافق بنی اسرائیل کے کان میں چپکے سے کہا" کہ دیکھو چلتے چلتے ایک کام کرو" تم میں کا ہر ایک مرد اپنے پڑوسی سے اور عورت اپنی پڑوسن سے چاندی اور سونے کے برتن عاریتاً لے"۔ (خروج باب ۱۱ آیت ۲) پھر یہ مال غنیمت جمع کرتے ہی مصر کی سرزمین سے نکل جانا۔ چنانچہ وفادار بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق کیا۔ اور انھوں نے مصریوں سے چاندی اور سونے کے برتن اور کپڑے عاریتاً لئے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ انھوں نے وہ عاریتاً دے دیئے اور اس طرح بنی اسرائیل نے مصریوں کو لوٹ لیا۔[۱]

معلوم ہے کہ اس رات مصر سے کتنے اسرائیلیوں نے ہجرت کی؟ توریت میں لکھا ہے کہ لڑکوں اور عورتوں کو الگ رکھ کر صرف مردوں کی تعداد چھ لاکھ کے قریب تھی[۲]

اس عظیم الشان تعداد سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس لوٹ میں کتنا بیش قرار مال بنی اسرائیل کے ہاتھ آیا ہوگا۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ سب ایک دفعہ ہی واقع ہو گیا۔ اور بیچارے مصری منہ دیکھتے رہ گئے نہیں، واقعہ کی ساری کڑیاں مسلسل ہیں۔ سب سے اول خدائی نوشتہ میں اس اہم واقعہ کی پیشگوئی کی گئی "اور یوں ہوگا کہ جب تم (یعنی بنی اسرائیل) (مصر سے) جاؤ گے تو خالی ہاتھ نہ جاؤ گے۔ بلکہ ہر ایک عورت اپنی پڑوسن سے اور اس سے جو اس کے گھر میں رہتی ہے چاندی اور سونے کے برتن اور لباس عاریتاً لیگی اور تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو غارت کرو گے"۔[۳] اس کے بعد موسیٰ نے بنی اسرائیل کے کان میں انھیں ارشاد خداوندی کی تعمیل کے لئے کہا۔ ازاں بعد بنی اسرائیل نے تعمیل

[۱] خروج باب ۱۲۔ آیت ۳۵۔ ۳۶۔ [۲] ایضاً باب ۱۲۔ آیت ۳۷۔ [۳] ایضاً باب ۳۔ آیت ۲۱۔ ۲۲

حکم کرکے پیشگوئی کو پورا کر دکھایا۔ اور درحقیقت مصریوں کو مالی لحاظ سے "غارت" کر دیا۔

آیئے ہم آپ کو پھر اس انسانِ کامل کی مقدس سیرت دکھانے کے لئے لے چلتے ہیں جس کی نظیر دنیا ہزاروں چکر کھانے کے بعد بھی پیدا نہ کر سکی اور نہ آئندہ کر سکے گی۔

واقعۂ اُحد | بد طینت اور بد سرشتوں نے مدینہ میں بھی حضورؐ کو ایک منٹ چین نہ لینے دیا۔ اور اپنی تکالیف اور ایذا رسانی کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ انتہا یہ ہے کہ خدا کے دین کو مٹانے اور خدا کے پیغامبر کو شہید کر دینے کے لئے بڑے بڑے لشکر لیکر میدان جدال و قتال گرم کیا۔ مگر اس وقت بھی رحم و کرم۔ رواداری اور ہمدردی کا جو نمونہ حضورؐ نے دنیا کو دکھلایا یقیناً وہ عدیم النظیر تھا۔ اور رہتی دنیا تک عدیم النظیر رہے گا۔ میدانِ احد میں حق و باطل صف آرا ہے۔ گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ خدا کے دشمن، خدا کے پیارے نبی پر تیروں تلواروں اور پتھروں کی بارش کر رہے ہیں جن سے آپ سخت زخمی ہو چکے ہیں چہرہ مبارک خون آلود ہو چکا ہے دو دانت بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تو اسوقت آپ کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے اور اس قدسی صفت انسان اپنے مولا کے حضور میں عرض کیا مگر جانتے ہو اس وقت آپ کے منہ سے کیا الفاظ نکلے؟ سنو آپ نے عاجزی سے کہا "رب اغفر قومی فانھم لا یعلمون (صحیح مسلم بیان غزوہ احد) یعنی اے اللہ انھیں معاف فرما دے کیونکہ یہ ناواقف ہیں "

تمہیں دنیا میں کسی ایسے انسان کا نام معلوم ہے جس نے ایسے سخت اور صعب وقت میں اس کا دسواں حصہ بھی دشمن سے ہمدردی کا نمونہ دکھایا ہو؟ تاریخ عالم کو چھان ڈالو۔ تمہیں اس کا جواب یقیناً نفی میں ملیگا۔

یہ تو ہوا صرف دعا کا معاملہ کہ آپ نے کفار مکہ کی طرف سے انتہائی تکلیفیں پہنچنے کے باوجود ان کے لئے بد دعا نہیں فرمائی۔ اگرچہ اپنے افعالِ زشت کی بدولت انھوں نے اپنے آپ کو پورا پورا اس کا مستحق ضرور بنا لیا تھا مگر آیئے اب آپ کو دکھائیں کہ عملی حالت میں آپ نے ایسے سنگدل اور ظالم ترین دشمنوں کے ساتھ کس قدر رواداری کا سلوک کیا۔

عملی حالت میں حضورؐ کا سلوک دشمنوں کے ساتھ

میدان بدر میں پانی نہ روکا ہر ایک قسم کے ظلم سہنے کے بعد اور ہر طرح کی مصیبتیں اٹھانے کے بعد جب مسلمانوں کو ایک امن کی جگہ مل گئی اور وہ ان کے پنجۂ ظلم سے نکل کر مدینہ میں جا بسے اس وقت رؤسائے قریش اور کفار مکہ نے سوچا یہ تو کچھ نہ ہوئی۔ اب مشق ستم کس پر کریں اور مظالم کے پہاڑ کس پر ڈھائیں۔ بس انہوں نے اپنے بہترین بہادروں کو چنا اور ان کو ہر ایک قسم کے اسلحۂ جنگ سے آراستہ کر کے مدینہ کی طرف کوچ کر دیا۔ تاکہ نام حق کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالیں۔ اور کسی انسان کو جو اللہ کی وحدانیت اور محمدؐ کی رسالت کا قائل ہو زندہ باقی نہ چھوڑیں۔ اس عزم وارادہ کے ساتھ جب یہ دشمنانِ حق وصداقت مقام بدر میں خیمہ زن ہوئے تو خدا کا رسول بھی تین سو تیرہ جاں نثاروں کو لیکر جو بہت ہی بے سروسامانی کی حالت میں گھروں سے نکلے تھے میدان جنگ میں آیا۔ اس موقع پر سب سے پہلی رواداری جو حضورؐ نے اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ برتی وہ یہ تھی کہ جس وقت حضور میدان جنگ میں پہنچے ہیں تو چونکہ ہموار اور سخت زمین پر کفار مکہ پہلے ہی قابض ہو چکے تھے اس لئے حضورؐ کو مجبوراً ریتلی زمین میں اپنے لشکر کو اتارنا پڑا۔ اللہ پاک نے فضل فرمایا فوراً بارش ہو گئی۔ جس سے کفار کے ہاں کیچڑ ہو گئی اور جہاں مسلمان تھے اس کا سارا ریت دب کر زمین نہایت عمدہ اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی۔ نیز مسلمانوں نے مٹی روک کر بہت سے حوض پانی سے بھر لئے تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔ حضورؐ کی رحمت اور شفقت اور رواداری دیکھو کہ آپ نے اپنے ان جانی دشمنوں کو بھی عام اجازت دیدی کہ جس کا جی چاہے یہاں سے پانی بھر کر لے جائے۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶)

بدر کے قیدیوں کے ساتھ سلوک پھر کیا ہوا؟ یہی کہ جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً تین سو تیرہ بے سروسامان جاں بازوں نے اس لشکر جرار کو شکست فاش دی۔ قریش کی شوکت اور طاقت ملیامیٹ ہو گئی اور وہ حسرت وندامت کے ساتھ واپس بھاگے۔ بڑے بڑے سرداران قریش جو شجاعت اور بہادری میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے کتوں کی موت مارے گئے اور ستر کے قریب قریش

مسلمانوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگئے۔

غور کا مقام ہے کہ کیا یہ سرکش ظالم اور فتنہ انگیز انسان اس بات کے مستحق نہیں تھے کہ بلا تامل سب کی گردنیں اڑادی جاتیں؟ مگر آؤ دیکھیں کہ ان سفاکوں اور خونخوار بھیڑیوں کے ساتھ حضورؐ نے کیا سلوک کیا۔

جتنے کفار اس لڑائی میں گرفتار ہوئے تھے حضورؐ نے قبل اس کے کہ ان کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جائے سب سے پہلے ان کے قیام و طعام کا مناسب انتظام کرنا ضروری سمجھا اور اس کے لئے یہ تدبیر کی کہ صحابہ کو جمع کیا اور ان سے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ جنھیں آج خدا نے تمہارا قیدی بنادیا ہے قریش کے بہترین فرزند ہیں اور اپنی قوم میں معزز و محترم۔ بس یہ کام کرو کہ تم میں سے جو آدمی مقدور رکھتے ہیں وہ ایک ایک دو دو قیدیوں کو اپنے اپنے گھر لیجائیں۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور سارے قیدی صحابہ پر تقسیم کردئیے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ان سب کو آرام سے رکھنا۔

حضورؐ کے ارشاد پر صحابہ کا برتاؤ قیدیوں کے ساتھ

صحابہؓ نے اس ارشاد نبویؐ کی اس طرح تعمیل کی کہ اپنے ان بدترین دشمنوں کو جو اس وقت ان کی قید میں تھے اپنے اپنے گھروں پر لے گئے جو خود کھاتے وہی انھیں کھلاتے، جو آپ پہنتے وہی انھیں پہناتے۔ غرض ان کی ہر قسم کی خبر گیری کرتے۔ جن صحابیوں کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ کھانا نہ ہوتا وہ جو کچھ بھی موجود ہوتا پہلے قیدیوں کے سامنے رکھتے اور جب اُن سے بچ جاتا تب اپنی بیوی بچوں کو کھلاتے۔

حضرت مصعب بن عمیر کے بھائی ابو عزیز بھی قیدیوں میں تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں جس مسلمان کے ہاں قید تھا وہ غریب تھا۔ جب کھانا تیار ہوتا تو روٹی میرے آگے رکھ دیتا اور خود کھجوروں پر گذارہ کرتا۔ مجھے بعض مرتبہ اس کے اس طرز عمل سے شرم آنے لگتی تو میں کھجوریں اٹھالیتا اور روٹی اس کے لئے چھوڑ دیتا۔ مگر وہ اصرار سے مجھے روٹی کھلاتا اور اپنے آپ کھجوریں کھالیتا۔ ابو عزیز کہتے ہیں کہ یہ سارا رواداری اور ہمدردی کا سلوک ہم قیدیوں کے ساتھ مسلمانوں کا صرف اس وجہ سے تھا کہ آنحضورؐ نے ان کے ساتھ نرمی اور ملائمت کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی تھی (طبری ص ۱۳۳۸)

بدترین دشمنوں پر انتہائی رحم

حضورؐ کی مہربانی کا اسیرانِ جنگ کے ساتھ یہ عالم تھا کہ آپ کو بڑا خیال اس بات کا رہتا تھا کہ قیدیوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ بعض کے پاس کپڑے نہ رہے تو حضورؐ نے ان کو کپڑے دلوائے۔ حضرت عباسؓ جو ابھی تک حالتِ کفر میں تھے بہت دراز قد واقع ہوئے تھے۔ کسی مسلمان کا کرتا ان کے بدن پر ٹھیک نہ اترتا۔ سردار منافقین عبداللہ بن اُبی پاس کھڑا تھا کہنے لگا میرا کرتہ انھیں پہنا دو۔ حضورؐ نے اسے قبول تو فرمالیا مگر کراہیت کے ساتھ۔ عبداللہ بن ابی جب مرا ہے تو اس معمولی سے سلوک کے باعث آنحضورؐ نے اپنا کرتہ اتار کر دیدیا تھا کہ لو اس میں لے دفن کر دینا۔

انھیں قیدیوں میں ایک شخص تھا سہیل بن عمرو۔ بڑا فصیح و بلیغ انسان تھا۔ قبائل میں آنحضرتؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا اور لوگوں کو آپ کی دشمنی پر آمادہ کرتا رہتا۔ اب قید ہو کر آیا تو حضرت عمر فاروقؓ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی کہ حضورؐ یہ سہیل ہے۔ دشمن خدا اور رسول کا۔ حضورؐ یہ کام کریں کہ اس کے نیچے کے دو دانت نکلوا دیجئے تاکہ پھر اتنی عمدگی کے ساتھ تقریر نہ کر سکے اور اس طرح اس کے فساد سے ہم امن میں رہیں گے۔ رحمتِ عالمؐ نے فرمایا۔ نہیں۔ اگر میں اس کے اعضا بگاڑونگا (جسے اصطلاح میں مُثلہ کہتے ہیں) تو خدا میرے اعضا بگاڑ دیگا (طبری ص ۱۳۴۴)

قیدیوں کے متعلق آخری فیصلہ

اب ان قیدیوں کی قسمتوں کے فیصلہ کا وقت تھا۔ یعنی یہ کہ آیا سارے کے سارے اپنے ظالمانہ افعال کی پاداش میں جہنم واصل کر دیئے جائیں یا فدیہ لیکر انھیں چھوڑ دیا جائے یہاں بھی حضورؐ کی رواداارانہ اور رحیمانہ پالیسی نے اپنا کام کیا اور فدیہ لیکر کفارانِ قریش کو چھوڑ دیا گیا۔ جن کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا انھیں حکم ملا کہ مسلمانوں کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھلا دیں اور پھر وہ آزاد ہیں۔ جو ایسے تھے کہ نہ ان کے پاس فدیہ دینے کے لئے کچھ تھا اور نہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے حضورؐ کی شفقت نے نہ چاہا کہ وہ قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں پس وہ بھی آزاد کر دیئے گئے۔

یہ تھا سلوک ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے حتی الامکان آپ کی جان تک لینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا تھا۔

رحمت و شفقت کی عجیب مثال

بدر کی ناکامیابیوں کا انتقام لینے کے لئے جب کفار قریش دوسرے سال احد کے مقام پر صف آرا ہوئے تو بڑے زور کا رن پڑا۔ عین معرکہ کارزار میں حضرت حنظلہ رض ایک صحابی نے حضورؐ کی رکاب کو بوسہ دیا اور عرض کیا میرا باپ ابو عامر کفار کی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں سے لڑنے آیا ہے۔ حضورؐ اجازت دیں تو جا کر اس کا خاتمہ کر دوں۔" مگر اس ذات پاک نے جو رحمت و رافت کا مجسمہ تھی گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے۔ اگرچہ باپ کفر کا ساتھی، خدا کا دشمن اور رسول کی جان کا خواہاں تھا۔

کفار کا سلوک محمدؐ کے ساتھ اور محمدؐ کا سلوک کفار کے ساتھ

کفارِ قریش کے مظالم کی فہرست جو انھوں نے آنحضرتؐ پر توڑے بڑی طویل اور نہایت دردناک ہے۔ تین سال تک آپ کو ایک گھاٹی (شعب ابیطالب) میں محصور رکھا اور اس عرصہ میں نہ غلہ اور نہ کوئی اور چیز آپ کے پاس آنے دی معصوم بچے بھوک سے تڑپتے اور روتے چلاتے مگر ان بے دردوں اور ظالموں پر مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ نہ پوچھو کہ آنحضورؐ نے یہ تین سال کا طویل زمانہ کس مصیبت اور تکلیف میں کاٹا۔

یہ تھا سلوک کفار کا محمدؐ کے ساتھ

رئیس یمامہ ثمامہ بن آثال گرفتار ہو کر بارگاہِ رسالت میں پیش کیا گیا۔ مستحق تھا کہ فوراً قتل کر دیا جاتا۔ کیونکہ سخت دشمن اور فتنہ انگیز تھا۔ حضورؐ نے فرمایا "چھوڑ دو"۔ اور ثمامہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جاؤ تم آزاد ہو"۔ عفو و ترحم کی تیز تلوار نے اپنا پورا وار کیا۔ اور ثمامہ اب مسلمان تھے۔ مدینہ سے مکہ میں . . . . . آئے تو قریش نے بزدلی اور نامردی کا طعنہ دیا کہ جان کے خوف سے مسلمان ہو گیا۔ ثمامہ کو بڑا غصہ آیا کہنے لگے "اچھا جاؤ اب ایک دانہ غلہ کا سرور عالمؐ کی اجازت کے بغیر تمہیں نہیں دیا جائے گا۔ مرو بھوکے۔" (مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا) اہل مکہ رئیس یمامہ کے یہ الفاظ سن کر سناٹے میں آگئے مگر کرتے کیا۔ چنانچہ یمامہ سے غلہ آنا بند ہو گیا۔ اور اہل مکہ بھوکوں مرنے لگے۔ سخت مجبور ہو کر ایک وفد بحالِ تباہ آنحضورؐ کی خدمت میں پہنچا۔ اور مصیبت کی رام کہانی رو رو کر عرض کی۔ کیا یہ پورا پورا بدلہ لینے کا بہترین موقع نہیں تھا؟ مگر انتقام کا مادہ اس ذات

قدسی صفات میں تھا ہی نہیں۔ فوراً ثمامہ سے کہلا بھیجا کہ "غلہ مت روکو" اب پھر اہلِ مکہ ویسے ہی خوش تھے اور غلہ کی طرف سے ہمیشہ کے لئے مطمئن۔

یہ تھا سلوک محمدؐ کا کفار کے ساتھ

رواداری اور حسن سلوک کا انتہائی مظاہرہ

حضور جب انتہائی ظلم سہنے کے بعد آخر مجبور ہو کر مکہ سے نکل گئے تو آپ کے بعد مکہ میں سخت قحط پڑا۔ یہاں تک کہ کفار مکہ مردار کھانے پر مجبور ہو گئے اور مکہ کا ہر گھر نالہ و فریاد کا مرکز بن گیا۔ . . . . . . ابو سفیان کو اس موقع پر بہترین تدبیر سوجھی۔ مدینہ آیا۔ اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر بڑی ہی بیباکی سے کہنے لگا "محمد! کیا تجھے یہ بات گوارا ہے کہ تو یہاں آرام سے بیٹھا ہے اور تیری قوم مکہ میں بھوک سے ہلاک ہو جائے۔ اپنے خدا سے دعا مانگ تا یہ مصیبت تیری قوم سے ٹل جائے"۔

جانتے ہو یہ قوم کون تھی؟ وہی جو حضورؐ کی جان کی دشمن اور خون کی پیاسی تھی مگر رواداری اور حسن سلوک کا یہ نمونہ دیکھنے کے قابل تھا کہ حضورؐ سرورِ عالم نے فوراً آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور اس کے بعد مکہ بدستور خوش و خرم تھا کیونکہ مکہ کافی بارش ہوگئی اور قحط دور ہو گیا۔

ایک گالیاں دینے والی کے لئے دعا

کفار کے ساتھ رواداری کی ایک ادنٰی سی مثال یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی والدہ کافرہ تھیں۔ اور جہالت اور جوش تعصب میں آنحضورؐ کو گالیاں دیا کرتی تھیں حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک روز نہایت دلگیر اور رنجیدہ ہو کر خدمت اقدس میں شکایت کی۔ موقعہ تھا کہ حضور نہایت غیظ و غضب کا اظہار فرماتے۔ مگر بجائے اظہار غضب کے حضورؐ نے بڑے ہی سکون خاطر سے فرمایا "اے خدا اس کو ہدایت دے"۔ ابو ہریرہؓ گھر پہنچے تو والدہ مسلمان ہو چکی تھیں۔

کافروں کے ساتھ نیکی کی تلقین

حضرت اسماءؓ کی والدہ مشرکہ تھیں۔ بیٹی کے پاس مکہ سے چل کر مدینہ آئیں اور کچھ مالی امداد کی خواستگار ہوئیں۔ بیٹی کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں ایک دشمن خدا اور رسولؐ کی اعانت کروں۔ حضورؐ سے آکر پوچھا۔ رحمت عالم نے پوری رواداری سے کام لیتے ہوئے ارشاد فرمایا "ان کے ساتھ نیکی کرو" (صحیح بخاری)

کافروں کو مسجد میں ٹھیرایا

۹ھ ہجری میں جب اہلِ طائف کا وفد حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کے امیر الوفد عبدیالیل کو جو بت پرست اور سخت دشمنِ خدا اور رسول تھا مع تمام وفد کے بکمال رواداری عین مسجد نبوی میں قیام کی اجازت دی۔ اور ان لوگوں کے لئے مسجد کے صحن میں خیمے نصب کرا دیئے۔ نماز اور خطبہ کے وقت یہ لوگ موجود رہتے تھے۔ حضور صلعم نمازِ عشا کے بعد ان کے پاس تشریف لاتے اور بہت دیر تک ان سے باتیں کرتے رہتے۔ مکہ میں سالہا سال جو جو تکالیف حضورؐ نے اٹھائی تھیں ان کا ذکر کرتے۔ غزوات اور سریات کا تذکرہ کرتے رہتے۔ غرض نہایت اخلاق و مروت کے ساتھ ان سے پیش آتے رہے۔ جانتے ہو آج جن لوگوں سے اتنی رواداری کا برتاؤ کیا جا رہا ہے وہ کون لوگ ہیں۔ وہی جنہوں نے پتھر مار مار کر خدا کے اس رسول کو اپنے شہر سے نکالا تھا جب وہ ان کو خدا کا پیغام سنانے تشریف لے گئے تھے۔

اکثر کافر حضورؐ کے ہاں مہمان رہتے

کافروں کے ساتھ حضورؐ کی رواداری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ مدینہ میں یہ لوگ بلا تکلف حضورؐ کے مہمان ہوتے تھے۔ اور حضورؐ خوشی کے ساتھ ان کی مہمانداری فرماتے۔ اس مہمانداری میں بعض مشرک شرارتیں اور بدمعاشیاں بھی کرتے۔ مگر حضورؐ سب کچھ کمال تحمل اور بردباری سے برداشت کرتے۔ اور کبھی کوئی کلمہ شکایت کا ان کافر مہمانوں کے متعلق استعمال نہ کرتے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ خود کہتے ہیں کہ حالتِ کفر میں میں ایک روز حضور کا مہمان رہا۔ اور گھر کی ساری بکریوں کا دودھ پی گیا۔ لیکن حضورؐ نے کچھ بھی نہ کہا۔ حالانکہ اس رات حضورؐ کا سارا گھرانہ بھوکا رہا۔ (مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۳۹۷)

اسی طرح ایک مرتبہ ایک کافر جب حضورؐ کا مہمان ہوا تو حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے ایک بکری کا دودھ دوہ کر اُسے دیا وہ فوراً پی گیا۔ پھر حضورؐ نے دوسری بکری کا دودھ نکالا وہ بھی پی گیا۔ پھر تیسری کا۔ پھر چوتھی کا۔ یہاں تک کہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ باوجود اس کے حضورؐ نے ذرا بھی ملال یا غصہ کا اظہار نہیں فرمایا۔ اسی رواداری اور تحمل کا نتیجہ تھا کہ صبح کو وہ کافر مسلمان تھا۔ (ترمذی)

ایک مرتبہ ایک کافر آپ کے ہاں مہمان ہوا۔ اور محض شرارت اور تکلیف پہنچانے کے لئے سارے گھر کا کھانا اکیلا کھا گیا اور گھر والے بھوکے سو رہے۔ رات کو اسے خوب دست آئے اور اس نے تمام بستر اور سارا کمرہ نجاست سے بھر دیا اور پھر مارے ڈر کے صبح ہونے سے پہلے نکل کر چل دیا۔ حضورؐ سویرے ہی آئے تو کمرہ کی یہ حالت دیکھی۔ صحابہؓ نے سخت اصرار کیا کہ لائیے ہم یہ کپڑے پاک کر دیں حضورؐ نے فرمایا وہ میرا مہمان تھا اور مجھے ہی انھیں پاک کرنا چاہیے۔ اتفاقاً وہ کافر اپنی تلوار چلتے ہوئے بھول گیا تھا راہ میں یاد آئی تو سوچا ایسے سویرے محمدؐ کہاں گھر سے آئے ہوں گے چلو لوٹ چلوں اور تلوار لے آؤں۔ یہ سوچکر جب واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ حضورؐ خود کپڑوں سے نجاست دور کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے دیکھا تو کچھ بھی غصہ یا ناراضگی کا اظہار نہیں کیا صرف یہ فرمایا "میاں! تم اپنی تلوار بھول گئے تھے یہ لو اپنی تلوار" اور فوراً تلوار اٹھا کر اسے دیدی۔ رحمت و شفقت اور انتہائی رواداری کی یہ حیرت انگیز مثالیں کیا دنیا کے کسی اور انسان کی زندگی میں بھی ملتی ہیں؟

صلح حدیبیہ میں حضورؐ کا برتاؤ کفارِ مکہ سے

صلح حدیبیہ حضورؐ کی رواداری کی ایک خاص مثال ہے جو حضورؐ نے کفار مکہ سے برتی اگرچہ بظاہر دب کر حضورؐ نے صلح کی۔ مگر آنے والے زمانہ نے ثابت کر دیا کہ یہ عظیم الشان فتح تھی اور محض اس لئے کی گئی تھی کہ لوگوں کو امن و عافیت کی حالت میں رہ کر مذہب پر غور کرنے کا کافی موقع ملے۔ اور وہ لوگ بکثرت دینِ حق کو قبول کریں۔ چنانچہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور جب صلح ہو کر لڑائیاں رک گئیں اور ملک میں امن ہو گیا تو اسلام نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کرنی شروع کی۔ رفتار کا اندازہ خود ہی لگا لو کہ ذی قعدہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے وقت مسلمانوں کا شمار صرف ڈیڑھ ہزار تھا۔ اور اس کے قریباً پونے دو سال بعد رمضان ۸ ہجری میں فتح مکہ کے وقت دس ہزار قدوسی حضورؐ کے ہمرکاب تھے مگر صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ بے نظیر رواداری کفار مکہ سے نہ برتتے اور باوجود ان کی سختیوں اور بے انصافیوں کے نہایت خاموشی کے ساتھ

دب کر صلح نہ کرتے تو یہ عظیم الشان نتیجہ پیدا نہ ہوتا اور نہ خدا اس صلح کو فتحاً مبیناً کہتا۔

فتح مکہ کے وقت سب ظالموں کو معاف کردیا

اب آیئے فتح مکہ کی طرف۔ اور دیکھئے کہ جس قوم نے حضورؐ کی تذلیل و تحقیر کرنے آپ کو بدنام اور رسوا کرنے اور آپ کا مذاق اڑانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ جس قوم نے حضورؐ کو اور حضورؐ کے ساتھیوں کو انتہائی تکلیفیں پہنچانے میں ہمیشہ انتہائی خوشی محسوس کی۔ جس قوم نے بارہا حضورؐ پر پتھروں اور سنگریزوں کی بارش کی۔ جس قوم نے تین سال تک آپ کا دانہ پانی بالکل بند رکھا، نہ کوئی آپ کے پاس آسکتا تھا نہ آپ کسی کے پاس جاسکتے تھے۔ نہ کوئی آپ سے بات کرنے پاتا تھا اور نہ آپ کو کوئی سودا سلف دیتا تھا۔ جس قوم نے آپ کے راستہ میں بارہا کانٹے بچھائے۔ جس قوم نے آپ کا گلا گھونٹا ایسا کہ آنکھیں اُبل پڑیں۔ جس قوم نے خدائے واحد کی عبادت کے وقت اونٹ کی اوجھڑی آپ پر رکھدی۔ جس قوم نے آپ کے غریب ساتھیوں کو سخت دھوپ میں گرم پتھروں پر لٹا لٹا کر سزائیں دیں۔ جس قوم نے آپ کے پیروؤں کو نیزے مار مار کر ہلاک کردیا۔ جس قوم نے سارے عرب میں ایک مجنون اور پاگل کے نام سے آپ کو شہرت دی۔ جس قوم نے بارہا آپ کے قتل کے منصوبے باندھے۔ جس قوم نے انتہائی شقاوت کے ساتھ آپ سے اپنا وطن چھڑوایا۔ جس قوم نے مدینہ میں آپ کو آرام اور چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ جس قوم نے بیسیوں مرتبہ لشکر لیکر آپ کو ہلاک کرنے کی کوششیں کیں۔ جس قوم نے مکہ میں بیٹھ کر آپ کے قتل کرنے کو مدینہ آدمیوں کو بھیجا۔ جس قوم نے آپ کے خلاف تمام عرب میں ایک آگ لگادی۔ جس قوم نے آپ کو بڑی سے بڑی تکلیف پہنچانے کا کوئی خفیف سا خفیف موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب ایسی قوم پر آپ کو نصرت اور فتح حاصل ہوئی اس وقت آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ فتح مکہ اس سوال کا عملی جواب ہے۔ اہل مکہ کو کیا خبر تھی کہ آج ہم جس پتھر کو رد کررہے ہیں ایک دن آئے گا جب وہ کونے کا پتھر ثابت ہوگا جس پر وہ گرے گا اُسے بھسم کردے گا اور جو اس پر گریگا

اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔

جب مکہ فتح ہو گیا اور خدائی نوشتہ کے مطابق دس ہزار قدوسی اس میں داخل ہو گئے تو کفارانِ مکہ کی آنکھوں کے آگے موت اپنی بھیانک صورت کے ساتھ پھرنے لگی۔ ان کو اپنے سیاہ اعمال نامے میں وہ گہرے گہرے غار نظر آنے لگے۔ جن میں کا ہر ایک ان کو جہنم کے نیچے کے طبقہ میں پہنچانے کے لئے کافی تھا۔ ان کو ایک ایک کر کے وہ ہولناک مظالم یاد آنے لگے جو انھوں نے اس شہنشاہ امن کے ساتھ حالت غربت میں کئے تھے۔ تمام اہلِ مکہ کی جانیں اب محمدؐ کی مٹھی میں تھیں اور ہر متکبر کا سر آمنہ کے یتیم کی ایڑی کے نیچے تھا۔ بڑے بڑے ائمۃ الکفر اور جبارانِ قریش جانوں کے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اور زمین و آسمان میں ان کو اس وقت کوئی بھی اپنا ہمدرد اور مددگار دکھائی نہ دیتا تھا جس وقت سردار دو عالمؐ کی پر جلال اور با ہیبت آواز ان کے کانوں میں پڑی کہ "اے اہل مکہ آؤ اور میری بات سنو" تو مارے خوف کے خون جسموں میں جم کر رہ گئے اور سوچنے لگے کہ ع

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آ گیا آخر

سب دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ اپنی قسمت کا آخری فیصلہ سننے کے لئے میدان میں جمع ہوئے۔ اس وقت ان کی حالت بالکل اس مجرم جیسی ہو رہی تھی جس کو پھانسی کا حکم مل چکا ہو اور جلاد اسے کشاں کشاں مقتل کی طرف لیجا رہے ہوں۔

یکایک حضورؐ نے نہایت پُر رعب لہجے میں ان سے پوچھا "اے جمع ہونے والو! جانتے ہو آج میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟" یہ سننا تھا کہ ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

سب کے چہروں پر موت کی مردنی چھا گئی۔ اور بڑے بڑے بہادر جان کے خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر سرورِ عالمؐ مسکرائے اور فرمایا لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔ (تمہارے جرم معاف کر دیئے گئے جاؤ اب تم آزاد ہو)۔

غیر مسلموں، کافروں قاتلوں اور جانی دشمنوں کے ساتھ یہ مہربانی۔ یہ رواداری اور یہ

احسان خدا کی قسم رہتی دنیا تک اپنا نظیر نہیں لا سکتا۔ ع

کوئی بتلائے اگر حق کو چھپایا ہم نے

متعصب اور ہٹ دھرم انسان کہتا ہے کہ اسلام تلوار کا رہین منت ہے۔ ذرا سوچو تو سہی فتح مکہ سے بڑھکر جبراً مسلمان کرنے کا اور کونسا موقع تھا جبکہ تمام ساکنین مکہ کی جانیں محض حضورؐ کے رحم پر موقوف تھیں۔ لیکن کیا دنیا میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو ثابت کر سکے کہ اس موقع پر کسی ایک انسان کو بھی جبر سے مسلمان بنایا گیا ہو۔

۲۔ اہلِ کتاب سے حضورؐ کا سلوک

ا۔ یہودیوں کے ساتھ برتاؤ

کفار مکہ کے ساتھ حضورؐ کے روادارانہ سلوک کی ایک مخالف یہ تاویل کر سکتا ہے کہ وہ آپ کی اپنی قوم تھی۔ خواہ کتنی بھی دشمنی ہو پھر بھی کچھ نہ کچھ رشتہ داری کا خیال آ ہی جاتا ہے۔ اگرچہ خدا پرستی اور بت پرستی کے درمیان جو بعد المشرقین ہے وہ اس تاویل کو جائز نہیں ٹھیرا سکتا۔ لیکن بہرحال نکتہ چین کی زبان کون پکڑ سکتا ہے مگر بتایا جائے کہ یہود و نصاریٰ سے حضورؐ کا کونسا رشتہ داری کا تعلق تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جو سلوک حضورؐ کا کفار مکہ کے ساتھ تھا وہی روادارانہ برتاؤ مدینہ کے یہود و نصاریٰ کے ساتھ تھا بلکہ شاید کچھ زیادہ۔ حالانکہ خفیہ سازشیں کرنے۔ علانیہ جنگ کرنے۔ بغاوت کے منصوبے باندھنے۔ آپ کو زہر دینے۔ آپ کی شہادت کی تدبیریں سوچنے اور ان پر عمل پیرا ہونے میں یہ لوگ کفار مکہ کے سگے بھائی تھے۔ مگر رحمت للعالمین کا دستِ شفقت و رحمت ان سے روادارانہ برتاؤ کرنے میں اس امر کو نظرانداز کر دیتا تھا۔ نہ کبھی حضورؐ نے اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ لیا۔ نہ روادارانہ برتاؤ کرنے میں دشمن کے تاریک اعمالنامے پر نظر ڈالی۔ خدا کی ہزار در ہزار رحمتیں نازل ہوں اس پیکر رحمت پر۔

حضور علیہ السلام محض تالیفِ قلوب کے لئے اور اپنی طرف سے انتہائی رواداری برتتے ہوئے معاشرت کی اکثر باتوں میں یہودیوں کی رسومات کے ساتھ اتفاق فرماتے تھے۔ اور مذہب کے لحاظ سے جو عزت اور وقعت ان کو حاصل تھی اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی روایت ہے۔ وکان یحب موافقۃ اھل الکتاب فیما لم یومر فیہ بشئ (جن امور میں خدا تعالیٰ کا کوئی خاص حکم نہ ہوتا تھا آنحضورؐ کو ان میں اہل کتاب کی موافقت پسند تھی) عام معاشرت میں حضورؐ کی اہل کتاب سے موافقت کی دو تین مثالیں یہاں لکھی جاتی ہیں۔

۱۔ مدینہ میں تشریف آوری کے بعد حضورؐ نے دیکھا کہ اہل کتاب یوم عاشورہ (محرم کی دسویں تاریخ) کو روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے بھی ارشاد فرمایا کہ لوگ اس دن روزہ رکھا کریں۔ (بخاری)۔

۲۔ عرب بالوں میں مانگ نکالا کرتے تھے۔ مگر یہودی ایسا نہ کرتے تھے بلکہ بالوں کو ویسے ہی چھوڑ دیتے تھے۔ حضورؐ نے دیکھا تو خود بھی ایسا ہی کرنے لگے۔

۳۔ قبلہ کے متعلق جب تک خدا تعالیٰ کا خاص حکم نازل نہیں ہوا۔ آپ برابر بیت المقدس ہی کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرماتے رہے جو یہود و نصاریٰ کا قبلہ تھا۔ مدینہ میں تشریف لانے کے قریباً سولہ مہینے بعد بیت الحرام مسلمانوں کا قبلہ مقرر کیا گیا۔

حضورؐ اتنا زیادہ روادارانہ سلوک یہود سے کرتے تھے کہ اکثر حضورؐ کو نہایت ناگوار اور تلخ باتیں بھی سننی پڑتیں۔ اور اکثر مرتبہ یہود حضورؐ سے نہایت گستاخانہ طریقہ پر پیش آتے لیکن حضورؐ نرمی اور ملائمت کرتے اور ان کی بدطینتی کا خیال نہ فرماتے۔

۱۔ یہود نے اپنی یہ عادت اختیار کر لی تھی کہ جب دربار رسالت میں حاضر ہوتے تو کہتے "یا محمد السام علیکم" (تم پر موت آئے)۔ وہ سمجھتے کہ السلام علیکم کی بجائے السام علیکم کہہ جائیں گے تو حضور سمجھ نہیں سکیں گے کہ مجھے بجائے دعا کے بددعا دی ہے۔ مگر حضورؐ نرمی اور خندہ پیشانی کے ساتھ صرف یہ جواب دیتے "وعلیکم" (تمہیں پر) روزانہ یہی دستور تھا۔ ایک دن عائشہ صدیقہؓ کے سامنے بھی انھوں نے یہ منحوس سلام کیا۔ بھلا صدیقہؓ کو کہاں تاب تھی۔ کہنے لگیں "کم بختو! تم پر خدا کی مار

تم ہی پر موت آئے۔" حضورؐ نے بیوی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے فرمایا" عائشہؓ نرمی سے بولو۔ خدا ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔"

۲۔ ایک مرتبہ بازار میں حضرت موسیٰؑ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ایک یہودی نے ان کو حضور صلعم پر ترجیح دی۔ ایک مسلمان کو جو غصہ آیا تو اس نے یہودی کے ایک تھپڑ مارا۔ یہودی سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا۔ آپ نے مسلمان کو طلب فرما کر ایسی حرکت پر سرزنش کی۔

حضورؐ یہود کے ساتھ باوجود ان کی تمام بدذاتیوں اور شرارتوں کے ایسے حسن سلوک اور روادارانہ برتاؤ سے پیش آتے تھے کہ آج لوگ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی اس طرح پیش نہیں آتے۔ اور حضور کا یہ حسنِ سلوک معزز اور اعلیٰ طبقہ کے یہودیوں کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ بالکل معمولی آدمیوں حتیٰ کہ غلاموں تک سے حضورؐ کا یہی برتاؤ تھا۔ چنانچہ بخاری میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی یہودی غلام مرض الموت میں گرفتار ہوا تو اسے پوچھنے کے لئے اس کے مکان پر تشریف لے گئے ایک دفعہ کوئی یہودی لڑکا بیمار ہوا تو اس کی عیادت کو بھی حضور تشریف لے گئے اور مزاج پرسی کے بعد حضورؐ نے اس سے اسلام قبول کرنے کے لئے فرمایا۔ لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا باپ نے جو حضورؐ کے اس روادارانہ برتاؤ سے بیحد متاثر تھا کہا" جو کچھ محمدؐ کہتے ہیں مان لو" لڑکا فوراً مسلمان ہوگیا۔

یہودیوں کی دعوت بھی آپ بلا تامل منظور فرمالیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک یہودیہ نے تو اس بہانے سے آپ کو گھر بلا کر زہر آمیز گوشت کھلانے کی بھی کوشش کی تھی تاکہ کھاتے ہی آپ کا کام تمام ہو جائے مگر" یعصمک من الناس" اس ہستی کا وعدہ تھا جو قادرٌ علیٰ کل شیٍٔ ہے۔ اور جس کی اجازت کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔

آپ نے رواداری کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے۔ نکاح اور معاشرت کی عام اجازت مسلمانوں کو دی اور ان کے لئے مخصوص امتیازی احکامات جاری فرمائے جو نہایت تفصیل کے ساتھ کتب احادیث میں مذکور ہیں۔

زندوں کے علاوہ آپ کی رواداری یہود کے مُردوں تک پر حاوی تھی۔ چنانچہ آپ کسی

یہودی کا جنازہ دیکھتے اور بیٹھے ہوتے تو کھڑے ہو جاتے (بخاری)۔

جس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں تشریف لائے تو یہاں یہود بکثرت آباد تھے۔ حضور نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے آپس کے تعلقات خوشگوار بنانے کے لئے دونوں کو بلایا اور فرمایا کہ اگر دونوں قومیں ایک دوسرے کا پاس لحاظ کریں، ایک دوسرے سے رواداری کے ساتھ پیش آئیں، ایک دوسرے کی مشکل کے وقت امداد واعانت کریں۔ غرض آپس میں شیر و شکر ہو کر رہیں تو یہ امر دونوں قوموں کی بہبودی اور ترقی کا ذریعہ ہوگا۔ شہر میں امن وامان رہیگا۔ اور کسی طرح کا جھگڑا قضیہ پیدا نہیں ہوگا۔ چنانچہ یہود نے حضورؐ کی اس تجویز کو منظور فرمالیا۔ اور دونوں قوموں کے درمیان جو عہد نامہ لکھا گیا وہ ابن ہشام میں مفصل مذکور ہے۔ ہم یہاں اس کی چند دفعات خلاصہ کے طور پر نقل کرتے ہیں۔

(۱) تمام یہودیوں کو شہریت کے وہی حقوق حاصل رہیں گے جو اسلام سے پہلے انھیں حاصل تھے۔

(۲) مسلمان تمام لوگوں سے دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

(۳) اگر کوئی مسلمان کسی شہری کے ہاتھ سے مارا جائے تو بشرط منظوری ورثا قاتل سے خونبہا لے لیا جائیگا۔

(۴) باشندگان مدینہ میں سے جو شخص کسی سنگین جرم کا مرتکب ہو اس کی سزا صرف اسی شخص کو دیجائیگی اس کے اہل وعیال سے اس کی سزا کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۵) موقع پیش آنے پر یہودی مسلمانوں کی مدد کریں گے اور مسلمان یہودیوں کی۔

(۶) حلیفوں میں سے کوئی فریق اپنے حلیف سے دروغ گوئی نہیں کرے گا۔

(۷) مظلوم اور ستم رسیدہ شخص کی خواہ کسی قوم سے ہو مدد کی جائیگی۔

(۸) یہود پر جو بیرونی دشمن حملہ آور ہوگا تو مسلمانوں پر ان کی امداد لازمی ہوگی۔

(۹) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہب سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا۔

(۱۰) مسلمانوں میں سے جو شخص ظلم یا زیادتی کریگا تو مسلمان اسے سزا دیں گے۔

(۱۱) بنی عوف کے یہودی مسلمانوں ہی میں شمار ہوں گے۔

(۱۲) یہودیوں اور مسلمانوں میں جس وقت کوئی قضیہ پیش آئیگا تو اس کا فیصلہ رسول اللہ کرینگے۔

(۱۳) یہ عہد نامہ کبھی کسی ظالم یا خاطی کی حمایت نہیں کریگا۔ [۱]

دیکھا آپ نے۔ آنحضورؐ نے کس فیاضی اور انصاف کے ساتھ یہود کو مساویانہ حقوق دیئے ہیں اور کس طرح ان سے روادارانہ برتاؤ کرنے میں پہل کی ہے۔

ب۔ عیسائیوں کے ساتھ برتاؤ

۹ھ میں وفد نجران حضورؐ کی خدمت میں باریاب ہوا۔ نجران مکہ معظمہ اور یمن کے درمیان ایک علاقہ ہے جو عیسائیوں سے آباد تھا۔ یہ علاقہ اپنے ایک عظیم الشان کلیسا کی وجہ سے تمام عرب میں مشہور تھا جسکو عیسائی حرم کعبہ کا مدمقابل سمجھتے تھے۔ یہ وفد ساٹھ بڑے بڑے پادریوں پر مشتمل تھا۔ حضورؐ نے ان کو بھی صحن مسجد میں اُتارا۔ انکی نماز کا وقت آیا تو حضورؐ نے مسجد نبوی ہی میں ان کو شریعت موسوی کے مطابق بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کی اجازت دی اور انھوں نے جمعیت خاطر کے ساتھ نماز ادا کی۔ دیکھئے یہ کتنی بڑی رواداری ہے جو حضورؐ نے ان کے ساتھ روا رکھی۔ گویا یہ اجازت دیکر حضورؐ نے تمام دنیا کی مساجد کو ہمیشہ کے لئے تمام مذاہب کے واسطے خدا کی عبادت کے لئے کھولدیا اور جیسا کہ بیان ہوچکا ہے قرآن مجید میں سخت وعید ایسے لوگوں کے لئے آئی جو کسی رنگ میں کسی انسان کو مساجد میں ذکر اللہ سے روکیں۔

یہ وفد نجران وہی ہے جس کے ساتھ بحث کے درمیان میں حضورؐ پر آیت مباہلہ نازل ہوئی تھی۔ آنحضورؐ نے جو معاہدہ اس وفد سے کیا اس کا ایک ایک لفظ حضورؐ کی اعلیٰ درجہ کی رواداری اور فیاضی کو ظاہر کررہا ہے معاہدہ کی عبارت فتوح البلدان بلاذری میں تمام وکمال درج ہے یہاں اس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے۔

"یہ معاہدہ ہے محمد خدا کے رسول اور اسقف ابو الحارث کے درمیان نجران کے دیگر اسقفوں کاہنوں، پادریوں، پیروؤں، غلاموں اور عام عیسائیوں کے متعلق اور ان اشیاء کے متعلق بھی جو اس وقت ان کے قبضہ میں ہیں۔ ان سب کو خدا اور اس کے رسول کی حفاظت حاصل ہوگی۔ علاقہ نجران کے گرجاؤں کے کسی چھوٹے یا بڑے عہدیدار کو نہ برخاست کیا جائیگا نہ

---

[۱] ترجمہ ابن خلدون ج ۳ ص ۵۰۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۱۲۶۔ سیرۃ النبی شبلی ج ۱ ص ۲۷۵۔

تبدیل کیا جائے گا۔ نہ ان کے حقوق یا اختیارات میں کسی قسم کی مداخلت کی جائیگی۔ نہ گرجاؤں اور پادریوں کی موجودہ حالت میں کسی قسم کا تغیر کیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ رعایا کے خیر خواہ اور خیر اندیش رہیں نہ ظالم کا ساتھ دیں اور نہ خود ظلم کریں۔" (ص ۴۱۹)

نجران کے اس بڑے وفد کے آنے سے کچھ دنوں پہلے تین آدمیوں کا ایک چھوٹا سا وفد اور حضورؐ کی خدمت میں نجران ہی سے آیا تھا اس کو جو معاہدہ حضورؐ نے لکھ کر دیا اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"اہلِ نجران کو خدا اور محمد رسول اللہ کی حفاظت حاصل ہوگی۔ تمام حاضر و غائب اہل نجران کی جانیں، مذہب، زمین اور مال محفوظ رہیں گے۔ ان کی حالت اور ان کے حقوق میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی جو مال ان کے پاس ہے وہ ان کے قبضہ سے نہیں نکالا جائیگا۔ نہ گذشتہ زمانہ کے شبہات اور قتل کے مقدمے ان پر چلائے جائیں گے۔ باشندے بیگار میں نہیں پکڑے جائیں گے۔ ان سے رسد یا زمین کی پیداوار وصول نہیں کی جائیگی۔ ان کے علاقہ سے فوج نہیں گذریگی۔" (فتوح البلدان بلاذری)

دونوں معاہدوں کو ملا کر پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ معاہدے لکھتے وقت حضورؐ نے رواداری فیاضی اور سیر چشمی کی انتہا کردی، ان سب معاہدوں سے حضورؐ کا مطلب صرف یہی تھا کہ دنیا سے فساد، شر، بغاوت اور فتنہ مٹ جائے۔ امن و سکون، عافیت اور ضمیر کی آزادی انسان کو مل جائے۔ آدمی چاہے جس مذہب پر رہے اس پر کوئی جبر، سختی اور ظلم مذہب کے بارے میں نہ ہو۔ وہ جس مذہب اور جس مشرب کو حق اور اعلیٰ سمجھے اسے اختیار کرنے میں اس کو کوئی روک حائل نہ ہو۔

خاتمہ یہ ہے نہایت مختصر بیان اس رواداری، اس حسن سلوک، اس مہربانی، اس عالی ظرفی اور اس فیاضی کا جس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں سے پیش آتے تھے اور یہ ہیں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ حقوق جو غیروں کو حضورؐ نے اس وقت مرحمت فرمائے جب حضور برسر اقتدار تھے اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ آپ پر انہی لوگوں نے ہر قسم کے مظالم کی انتہا کردی تھی۔ اور اگر ان لوگوں کا بس چلتا تو صفحۂ ہستی سے اسلام اور حاملِ اسلام کا نام و نشان مٹا دیتے۔ خدا کے ہزاروں ہزار درود و سلام ہوں اس ذات اقدس پر جس نے ہمارے سامنے زندگی کا ایسا اعلیٰ معیار اور اخلاقِ فاضلہ کا ایسا کامل نمونہ پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضورؐ کی بنائی ہوئی صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ادبیات

ثمراتِ تخئیل

شباب وانقلاب کا ایک ورق

جناب نہالؔ سیوہاروی

عظمت نے مری رفعتِ افلاک ہی چھینی — اللہ رے مراد بدیۂ عرش نشینی
کر مشورہ تسخیرِ مہمات میں دل سے — دنیا کی نہ سن بات، یہ دنیا ہے کمینی!!
تابندہ نہ ہو گر مری قسمت کا ستارہ — کس کام کی اے دوست تری زہرہ جبینی
ہستی پہ دلالت ہے، تری شدتِ احساس — بجھ جائے یہ شعلہ تو ہے موت یقینی،
اس سمت بھی لے پیرِ مغاں ساغرِ اخلاص — زاہد کو پلا بادہ کہ ہے خدمتِ دینی
اٹھیگا تری خاک سے کب غلغلۂ حشر — اے مشرق والے خوابگہِ ہندی و چینی
کچھ اور مچا شور گرجتے ہوئے بادل — منظور ہے مے آج مجھے دھوم سے پینی
آنے کو ہے اس سطحِ بلندی پہ یہ دنیا — بن جائیں گے افلاک پہ ذراتِ زمینی

محروم نہ رہ جائے نہالؔ ابرِ کرم سے
لے رحمتِ عالم تو انیسی و معینی

گزرگاہ

جناب طورؔ سیوہاروی

فسوں کاریٔ دو جہاں سے گزر — زمیں سے گزر، آسماں سے گزر
سکوں موت ہے، گرمِ پرواز ہو — برنگِ صبا آشیاں سے گزر

تصرف میں تیرے ہیں سب کیف و کم حکایاتِ سود و زیاں سے گزر
عبث ہے تمنائے نام و نشاں تمنائے نام و نشاں سے گزر
حوادث میں گم ہو مصائب سے کھیل مقاماتِ امن و اماں سے گزر
تو ہر رہروِ شوق کا ساتھ دے مثالِ جرس کارواں سے گزر
کمالِ محبت ہے سوزِ دروں روایاتِ آہ و فغاں سے گزر
نشیب و فرازِ جہاں کچھ نہیں نشیب و فرازِ جہاں سے گزر
میسر نہیں مے تو پی خونِ دل عنایاتِ پیرِ مغاں سے گزر
نہ ہو پائے بندِ غم و انبساط! طلسمِ بہار و خزاں سے گزر
ترے واسطے لالہ و گل نہیں مہ و انجم و کہکشاں سے گزر

عمل سے ہے تاباں شرارِ حیات
فرارِ نفس ہے قرارِ حیات

قطعات

جناب طور سیوہاروی

آرزو

عہدِ رفتہ کا سر سماں اے دوست چاہتا ہوں کہ خواب ہو جائے
اس طرح جیسے رقص و مستی میں نعرۂ انقلاب کھو جائے

(۲)

فریبِ تصور

یہ گلستاں، یہ منظرِ خوش رنگ یہ بہار و شباب کا عالم
سب طلسمِ خیال ہے اے دوست سارا عالم ہے خواب کا عالم

خدا اور کائنات از ماہر القادری صاحب، تقطیع خورد، ضخامت ۴۸ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر، قیمت ۹ر پتہ:- ادارہ اشاعت اردو عابد روڈ حیدر آباد دکن۔

خدا کا وجود، اس کی ضرورت، اور اس کا کائنات سے تعلق، انسانی فکر و نظر کا ہمیشہ ایک اہم موضوع رہا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں مولف نے اسی موضوع پر جامع اور مختصر بحث کی ہے۔ اور انفسی و آفاقی ہر دو دلائل کے ذریعہ خدا کے ثبوت اور کائنات سے اس کے تخلیقی تعلق پر دل پذیر اور قریب الفہم انداز سے روشنی ڈالی ہے اسی کے ساتھ قدیم و جدید فلاسفہ کے اقوال و دلائل جو انھوں نے خدا کے وجود پر قائم کئے ہیں اختصار کے ساتھ نقل کئے ہیں۔ اندازِ نگارش پُرجوش بھی ہے اور ادیبانہ بھی۔ کتاب کا مطالعہ جدید طبقہ، مسلم اور غیر مسلم ہر ایک کے لئے مفید ہوگا۔

امت کی مائیں از مولانا راشد الخیری صاحب مرحوم۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۶۰ صفات۔ کاغذ خاکی۔ قیمت عہ پتہ:- نیا کتاب گھر اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

"نیا کتاب گھر" دہلی کا ایک کم عمر اور حدیث العہد مکتبہ ہے لیکن اس کے پُرجوش اور سلیقہ مند مالک عبدالحق صاحب فاروقی پبلک کی طرف سے ہمت افزائی کے مستحق ہیں کہ ایسے مشکل زمانے میں ان کا مکتبہ اچھی اچھی کتابیں شائع کرکے ہمارے لٹریچر میں مفید اضافے کر رہا ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات پر اردو میں کافی لٹریچر موجود ہے اور بعض ازواج کی سیرت پر تو مستقل اور مبسوط کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ زیر نظر تالیف اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مولف کتاب مولانا راشد الخیری اپنی گرانقدر ادبی و معاشرتی خدمات کے باعث کسی تعارف کے محتاج نہیں، ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کا عدد تقریباً ۸۰ تک پہنچا ہوا ہے جن کو

اپنے اپنے موضوع پر کامیاب اور لائق قدر تصانیف کہا جا سکتا ہے، زیر تبصرہ کتاب میں ابتداءً ۴۵ صفحات پر مشتمل ایک بسیط مقدمہ ہے، جس میں عرب کی رسوم وعادات اور اخلاق ومعاشرت پر اجمالی تبصرہ ہے اور عربوں کے (محاسن کے ساتھ ساتھ ان کے) قبائح اور عیوب پر بحث کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ اس وقت عرب کے لئے ایک نبی اور پیغمبر کی مصلحانہ مساعی کی شدید ضرورت تھی بعد ازاں ایک خاص نظریہ وفکر کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص حالات وواقعات اس عہد تک کے لکھے ہیں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع بنوہاشم کے شعبِ ابی طالب میں محصور تھے اور قوم نے آپ سے ترک موالات کر دیا تھا۔ اس کے بعد چند صفحات میں نکاح اور تعددِ ازدواج پر بحث کی گئی ہے اور اسی پر مقدمہ ختم ہو جاتا ہے اور اصل مقصد اور کتاب شروع ہوتی ہے۔ ازواج مطہرات کا تذکرہ اور تقدم وتاخر سنین کے اعتبار سے ہے۔ اور ازدواجی تعلق ووابستگی جیسے جیسے تفاوت زمانہ سے پیش آتی رہی کتاب میں اسی ترتیب سے انکا ترجمہ ذکر کیا گیا ہے۔ زیادہ تفصیل سے حضرت عائشہؓ پر لکھا ہے اور کتاب کے دیگر حصوں کی بہ نسبت اچھا لکھا ہے۔

کتاب میں جہاں کہیں قرآن وحدیث اور تاریخ کی بحثیں چھڑ گئی ہیں، وہاں فاضل مصنف سے سخت لغزشیں ہوئیں ہیں، چند مواقع میں اصل احادیث میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ بعض جگہ غلط روایتیں جو عوام میں مشہور ہیں بغیر کسی تحقیق کے بجنسہ نقل کر دی گئی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے بھی بہت سے غیر ذمہ دارانہ واقعات کتاب میں ملتے ہیں، پریس کی بھی کافی غلطیاں رہ گئی ہیں اور بیشتر آیات واحادیث غلط طبع ہو گئی ہیں۔ کتاب میں کچھ ایسے بھی مواقع ہیں جہاں قلم کی روانی پورے شباب پر ہے اور اسی زورِ بیان میں بعض صحابہؓ کے متعلق ناموزوں جملے زبان سے نکل گئے ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوصف جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس کے لحاظ سے کتاب کا پایہ نہایت بلند ہے۔

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن پہلے بھی نکل چکے ہیں۔ اب "دنیا کتاب گھر" کے اہتمام سے یہ جدید ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

پتھر سے ہیرا مصنفہ ڈاکٹر سعید احمد بریلوی، تقطیع خورد، ضخامت ۱۷۶ صفحات، کاغذ خاکی۔ لکھائی چھپائی متوسط قیمت عہ پتہ:۔ نیا کتاب گھر اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

زیر نظر کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ بچوں کے لئے عمدہ تربیت واخلاقی تعلیم از حد ضروری ہے۔ نیز تربیت کے ذریعہ بد چلن و قبیح سیرت بچوں کو بھی حسن سیرت اور اعلیٰ کیرکٹر کا حامل بنادیا جاسکتا ہے۔ کتاب مجموعی حیثیت سے اصلاحی رنگ میں خاصی دلچسپ اور مفید ہے۔ بعض مواقع میں مذہب واخلاق پر چند تقریریں ایسے معقول و دلنشین انداز میں کی گئی ہیں کہ جنھیں پڑھکر شمیم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ زبان کی پاکیزگی اور اندازِ بیان کی خوبی کے لئے ڈاکٹر سعید احمد کا نام کافی ضمانت ہے۔

چاند سورج کی چوری از مسٹر عبدالرحیم چمن دہلوی، تقطیع خورد، طباعت کتابت متوسط قیمت عہ ۱۸۴ صفحات۔ پتہ:۔ نیا کتاب گھر اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

مسٹر چمن دہلوی جاسوسی ناول نگاری میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اس سے قبل ان کے دو جاسوسی ناول شائع ہوچکے ہیں اور پسند کئے گئے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب دلچسپ اور فنی حیثیت سے بہت کافی وقیع ہے، زبان سلیس ورواں اور شگفتہ ہے۔

باغی لڑکی از شفیق بانو شفق۔ سائز خورد، کاغذ خاکی، صفحات ۱۴۰ کتابت و طباعت متوسط۔ قیمت عہ۔ ناشر نیا کتاب گھر اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

باغی لڑکی محترمہ شفق کے تیئس طبعزاد افسانوں کا مجموعہ ہے۔ سوسائٹی میں جو غلط اور خلافِ فطرت رسوم قائم ہوگئی ہیں، ان پر تنقید واصلاح ان افسانوں کا ماحصل ہے۔ بیشتر افسانوں کا پلاٹ ایسا ہے جسے دلچسپ نہیں کہا جاسکتا تاہم مقصد اور زبان کے لحاظ سے یہ ایک اچھا اور کامیاب مجموعہ ہے۔

زار ریبہ مترجم عبدالرحیم صاحب چمن دہلوی۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ طباعت وکتابت اور کاغذ بہتر قیمت عہ پتہ:۔ نیا کتاب گھر اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

۱۹۱۷ء میں روسی عوام نے حکومت کے غیر مدبرانہ اور ظالمانہ برتاؤ سے مجبور ہوکر بادشاہ کو

معزول کردیا تھا اور حکمران خاندان رومناف سے بجبر اس کے شاہی اقتدار کو چھین لیا اور جمہوری سلطنت کا سنگِ بنیاد رکھنے کی سعی کی۔ اس انقلاب کے واقعات اور اس کے واقعی اسباب و علل پر زارینہ سے قبل اردو میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں انقلابِ روس کے پُراسرار واقعات کی وضاحت کی گئی ہے اور قیصر ولیم کی ان جملہ خفیہ تدابیر سے جن کی تکمیل کے لئے ملکۂ روس کو آلۂ کار بنا لیا گیا تھا، ناواقفیت کے پردے اٹھا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب میں بہت خوبی سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ روسی دولت کے سقوط میں زارینہ کی سازشیں اور اسکیمیں جو قیصر کی حسبِ منشا تیار کی جاتی تھیں انقلابِ روس کا واقعی سبب ہیں اور زوالِ حکومت کی تمامتر ذمہ داری ملکۂ روس پر ہے۔

کتاب کی مصنف زارینہ ملکۂ روس کی ایک روسی ہمراز سہیلی ہے۔ مجموعی اعتبار سے کتاب دلچسپ اور مفید ہے اور لائق مترجم نے بھی اس کا ترجمہ خوبی اور عمدگی سے کیا ہے۔

سید زاہد قیصر

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۴۱ء

قصص القرآن حصہ اول

قصص قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور ان کی دعوتِ حق کی مستند ترین تاریخ جس میں حضرت آدم سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات قبل عبور دریا تک نہایت مفصل اور محققانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت للعہ

وحی الٰہی

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے دلپذیر و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے۔ قیمت عگر

بین الاقوامی سیاسی معلومات

بین الاقوامی سیاسی معلومات میں سیاسیات میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحوں، قوموں کے درمیان سیاسی معاہدوں، بین الاقوامی شخصیتوں اور تمام قوموں اور ملکوں کے سیاسی اور جغرافیائی حالات کو نہایت سہل اور دلچسپ انداز میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ قیمت مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت عگر

تاریخ انقلاب روس

ٹراٹسکی کی مشہور و معروف کتاب "تاریخ انقلاب روس" کا مستند اور مکمل خلاصہ جس میں روس کے حیرت انگیز سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے اسباب و نتائج اور دیگر اہم واقعات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عہ

سنہ ۱۹۴۲ء

قصص القرآن حصہ دوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعاتِ عبور دریا سے لیکر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات تک ان تمام پیغمبروں کے سوانح حیات اور ان کی دعوتِ حق کی محققانہ تشریح و تفسیر جن کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ قیمت للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام

طبع جدید۔ بڑی تقطیع۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

تاریخ ملت حصہ دوم
خلافت راشدہ

تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات مستند قدیم وجدید عربی تاریخوں کی بنیاد پر صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب کالجوں اور اسکولوں کے کورس میں داخل ہونے کے لائق ہے کتاب کی ترتیب کے وقت اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے قیمت ٹے

مسلمانوں کا عروج اور زوال

اس کتاب میں اولاً خلافتِ راشدہ اس کے بعد مسلمانوں کی دوسری مختلف حکومتوں، ان کی سیاسی حکمت عملیوں اور مختلف دوروں میں مسلمانوں کے عام اجتماعی اور معاشرتی احوال و واقعات پر تبصرہ کرکے ان اسباب و عوامل کا تجزیہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے غیر معمولی عروج اور اس کے بعد ان کے حیرت انگیز انحطاط و زوال میں مؤثر ہوئے ہیں۔ قیمت عہ

منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی

REGISTERED No L 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) **محسن خاص**:- جو مخصوص حضرات کم سے کم اڑھائی سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) **محسنین**:- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔

ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبۂ برہان کی اہم مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) **معاونین**:- جو حضرات بارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) **احبا**:- چھ روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) برہان کی ضخامت کم سے کم اسّی صفحے ماہوار اور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

(۶) قیمت سالانہ پانچروپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۷) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ برہان قرول باغ دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
عتیق الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں غلامی کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی اور تحقیق سے کی گئی ہے۔ قیمت ؎ر

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام

اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہر آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متصوفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے قیمت عہ؎ر

سوشلزم کی بنیادی حقیقت

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں کے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریریں جنھیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے مع مبسوط مقدمہ از مترجم قیمت ؎ر

اسلام کا اقتصادی نظام

ہماری زبان میں پہلی عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کرکے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے۔ طبع ثانی میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں۔ ان اضافوں کے بعد کتاب کی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب سنہ ۴۲ء کے سیٹ میں بھی دی گئی ہے۔ قیمت ؎ ہے

سنہ ۱۹۴۰ء

نبی عربی صلعم

تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت عہ؎ر

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں اور قرآن پاک کا صحیح منشا معلوم کرنے کیلئے شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ احادیث کی تدوین کس طرح اور کب ہوئی، یہ کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ قیمت عہ؎ر

غلامانِ اسلام

پچھتر سے زیادہ ان صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہاء و محدثین اور اربابِ کشف و کرامات کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل کے بیان پر پہلی عظیم الشان کتاب جس کے پڑھنے سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ قیمت ؎ر

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کی روشنی میں اصولِ اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواعِ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے ضابطہ ہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح کی گئی ہے۔ قیمت ؎ر

برہان

جلد سیزدہم　　　　　　　　　　شمارہ (۲)

شعبان المعظم ۱۳۶۳ھ مطابق اگست ۱۹۴۴ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

وادریغا! مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ نے چند ماہ کی شدید علالت کے بعد ۱۳ر جولائی بروز پنجشنبہ داعی اجل کو لبیک کہا اور اس جہانِ آب وگل کو خیرباد کہکر اپنے "رفیق اعلیٰ" سے جاملے۔ مولانا کی عمر ابھی ایسی کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن تبلیغ کے کام میں انہماک کے باعث آپ نے اس مقدس اور ضروری فریضۂ اسلام کے علاوہ ہر چیز کو قطعاً فراموش کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ سینکڑوں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مرض الموت میں بھی جبکہ آپ پر عالم سکرات طاری تھا اور ضعف ونقاہت اور مرض کے پے بہ پے حملوں کے باعث آپ کا جسم ناتواں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہوکر رہ گیا تھا۔ جو کوئی شخص آپ کی مزاج پرسی کرتا اور مرض کی کیفیت دریافت کرتا آپ اس پر خفگی کا اظہار کرتے اور فرماتے تھے "میرا مرض تم لوگ ہو جو تبلیغ کے فرض سے غافل ہو۔ بس اس کے سوا مجھے کوئی اور بیماری نہیں"

آپ درحقیقت فنانی التبلیغ تھے۔ ہر آن اسی کی دھن تھی۔ یہی ایک خیال اور یہی ایک جذبہ تھا جو سیماب کی طرح ان کو بے چین اور متحرک رکھتا تھا۔ علم اور اخلاص کا حقیقی پیکر تھے۔ دل خشیۂ ربانی سے معمور تھا۔ تقریر اگرچہ رسمی فصاحت وبلاغت سے عاری تھی۔ مگر غایت اخلاص وللہیت کی وجہ سے ایک ایک لفظ جو دل سے نکلتا تھا سننے والوں پر تیرو سنان کا کام کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی پوری زندگی اتباع سنت کا کامل نمونہ تھی۔ مولانا مرحوم کی ان صفات کا ہی یہ اثر تھا کہ آپ نے چند سالوں میں ہی اصلاح وتبلیغ کے میدان میں وہ کچھ کر دکھایا ہے جو سالہا سال میں بڑی بڑی جماعتیں بھی نہیں کر سکتیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں مولانا کے مراتب ومدارج بیش از بیش بڑھائے اور آپ اپنے پیچھے جو کام چھوڑ گئے ہیں۔ آپ کے جانشین مولانا محمد یوسف صاحب اور ان کے اعوان ورفقا ان کاموں کو باحسن وجوہ قائم وبرقرار رکھ سکیں رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ ونعمہ بالطافہ الخاصۃ

اخبارات سے معلوم ہوا ہوگا کہ جس دن حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے قید ہستی سے نجات پائی۔ اسی کے دوسرے دن ہمارے رفیقِ اعلیٰ مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی تقریباً دو سال کے بعد قیدِ فرنگ سے رہا ہوئے۔ مولانا نے یہ طویل اسارت کا زمانہ جس صبر واستقلال اور ہمت ومردی سے گذارا ہے وہ ہمارے بہت سے زعماء قوم کے لئے آئینہ عبرت وبصیرت ہے۔ اس عرصہ میں آپ کی نوجوان بھتیجی کا انتقال ہوا خود آپ کی بڑی اور عزیز ترین بچی مہینوں بیمار ہوکر مراد آباد میں زیر علاج رہی۔ پھر خود آپ کو درد سر کا نہایت شدید عارضہ ہے۔ بارہا اس کے شدید دورے پڑے اور انھوں نے قوتِ بینائی کو خصوصاً اور عام صحت کو عموماً بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان وجوہ کی بنا پر آپ کے بزرگوں مخلص دوستوں اور عزیزوں نے شدید اصرار کیا کہ پیرول کی درخواست دیکر چند روز کیلئے باہر آجائیں۔ مولانا اگر یہ درخواست دیتے تو غالب امید تھی کہ منظور ہوجاتی لیکن آپ نے

ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور حکم الٰہی پر صابر و قانع رہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا کے اس کارنامۂ عزیمت کو قبول فرمائے اور ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی بیش از بیش خدمات کی توفیق عطا ہو۔

جو قارئین برہان کاغذ کے کنٹرول کے سلسلہ میں حکومتِ ہند کے نئے ہنگامی قانون سے باخبر نہیں ہیں انھیں آج اپنے عزیز برہان کو نئے لباس اور تراشیدہ قد و قامت میں دیکھکر سخت اچنبا ہوگا۔ ان حضرات کی اطلاع کے لئے گذارش ہے کہ حکومتِ ہند نے ۱۲ر جون ۱۹۴۴ء سے ایک عجیب و غریب قانون (Paper Control (Economy) Order) کے نام سے جاری کیا ہے، رسالوں کی اشاعت کے سلسلہ میں اس قانون کا منشاء یہ ہے کہ یکم اپریل ۱۹۴۴ء سے پہلے کے چھ مہینوں میں کسی رسالے کی ضخامت کے مجموعی صفحات کی جو مقدار ہو اس کو چھ پر تقسیم کیا جائے اور حاصل تقسیم کے صرف ۳۰ فی صدی حصہ پر رسالہ شائع کیا جائے اس مقدار میں ایک صفحہ کا اضافہ بھی قانونی طور پر ناجائز قرار دیا گیا ہے اس قانون کے مطابق اب برہان ۸۰ صفحوں کی جگہ سفید کاغذ کے صرف ۲۴ صفحات پر شائع ہو سکتا ہے اور بس۔

ناظرین برہان اور جو اصحاب ندوۃ المصنفین سے وابستہ ہیں ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ موجودہ جنگ کے پریشان کن اور انتہائی صبر آزما حالات میں بھی ہم اپنی وضع کو بہر حال کس طرح نباہتے رہے ہیں۔ برہان کی جو ضخامت جنگ سے پہلے تھی وہی ان حالات میں بھی قائم رہی اور اسکے باوجود نہ کاغذ کی نوعیت بدلی۔ نہ سالانہ چندے میں ایک پیسے کا اضافہ ہوا اور پھر اسی کے ساتھ بفضلہ تعالیٰ ہماری زبان پر کبھی کوئی کلمۂ اضطراب و تشویش بھی نہیں آیا۔ ہم یہی سب کچھ کر سکتے تھے اور یہی ہم نے کیا۔ لیکن اب معاملہ ہی دوسرا ہے۔ حکومت کا قانون عذاب کی صورت میں مسلط ہے نہ جائے نہ رفتن نہ پائے ماندن۔ رسالے، کتابیں، پریس سب اس قانون سے جکڑ دیئے گئے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہولناک اور تاریک ترین صورت کب تک قائم رہتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بحالتِ موجودہ اس قانون نے برہان اور ندوۃ المصنفین دونوں کو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے لیکن ہم یقین کی پوری قوت کے ساتھ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس خدا نے برہان اور ندوۃ المصنفین کے وجود اور استحکام کی ہر منزل پر ہمیں اپنی نوازشوں اور کرم سے نوازا ہے وہ ان نازک ساعتوں میں بھی ہمیں تنہا نہیں چھوڑ دے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ مشکلات کے یہ بادل بہت جلد چھٹ جائینگے اور جدید ولولۂ کار کے ساتھ تمام کام اسی معیار پر آجائیں گے۔

سر دست برہان کے لئے اخباری کاغذ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور حکومت کی پالیسی کے موجودہ رخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید چکنے کاغذ پر شائع ہونیوالے رسالوں کو نیوز پرنٹ (News print) کوٹہ ملجائیگا۔ جیسے ہی اجازت ملے گی۔ برہان پہلے کی طرح ۸۰ صفحوں پر شائع ہونے لگے گا۔ کیا بعید ہے کہ اس سے اگلا نمبر ہی پورے صفحات پر شائع کیا جا سکے۔

ندوۃ المصنفین کی مطبوعات کے سلسلہ میں یہ صورت ہو کہ ۱۹۴۳ء میں جتنا کاغذ خرچ کیا گیا ہے، موجودہ قانون کے ماتحت اب اس کا صرف ۳۰ فیصدی خرچ کیا جا سکیگا۔ ۱۹۴۴ء کی ایک ضخیم کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" پہلے ہی شائع ہو چکی ہے بعض کتابیں پریس میں ہیں اور بعض زیرِ کتابت ہیں۔ توقع ہے کہ ۱۹۴۴ء کی کتابوں کا مکمل سیٹ یا اس کا بڑا حصہ اختتام سال تک حضرات ممبران کی خدمت میں پیش کیا جا سکے گا۔

عصری علمِ کلام

از مولانا یعقوب الرحمن صاحب عثمانی لکچرار دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

اس دورِ اضطراب و فتن میں مریض علم کلام کو صحت و تندرستی سے ہم آغوش کرنے یا اس کے جسدِ قدیم میں تازہ روح پھونکنے کے لئے ایک ایسے مسیحا کی ضرورت ہے جو اپنے قلمِ معجز رقم کے ذریعہ ذہن و دماغ سے ان تمام اعتراضات و شکوک کو محو کردے جن کی وجہ سے اس مفید اور اہم علم کو اہلِ علم نے گوشۂ جمود و خمود میں ڈالدیا ہے۔ سنجیدہ اہلِ علم اور قوم و ملت کا درد رکھنے والے بظاہر اس سے متنفر نظر آتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بازارِ علم کا یہ وہ کھوٹا سکہ ہے جس کا چلن بند ہو چکا ہے۔ اور قافلہ سالارِ علم نے منزل تک سفر کر کے اس کے بے ضرورت اور غیر مفید ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا ہے۔

اس کے سوائے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری مذہبی تاریخ۔ ماضی قریب و بعید میں علم کلام کے جائز و ناجائز۔ مفید و مضر ہونے کے متعلق بحث و نظر سے دوچار ہو چکی ہے اور ماہرینِ علوم و فنون اور رہنمایانِ قوم و ملت کی علمی اور قلمی صحبتیں علم کلام قدیم و جدید کی ضرورت و عدم ضرورت اور بحث و نظر کی ردّ و قدح سے پُر رونق ہو کر ماند ہو چکی ہیں تو گذشتہ تاریخ کو دہرانا اور سوالات و جوابات کی بازگشت بے سود معلوم ہوتی ہے۔

لیکن حال اور مستقبل ماضی کا تابع نہیں ہے بلکہ ماضی کے آئینے کے ذریعہ چھپی ہوئی حقیقتوں کے انکشاف کے ساتھ اُلجھے ہوئے مسائل کا حل معلوم کر کے حال و مستقبل کی تعمیر زندہ قوموں کو کامیابی و کامرانی کی ضمانت عطا کرتی ہے۔ کٹھن منزل رہرو کو اکثر تھکا دیتی اور مایوسی عطا کرتی ہے۔ لیکن کبھی پُر عزم مسافر کے لئے منزل کی انھیں سختیوں میں زندگی اور قوت کا وہ نشان ملتا ہے جس کے بعد منزلِ مقصود تک پہنچنا یقینی ہو جاتا ہے کسی علم کی ضرورت دلائل کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ احتیاج و ضرورت کے بعد قدرتی طور سے دلائل و براہین پیدا ہوتے ہیں۔ قدیم بحث و جدل کی عظام رمیم اور موجودہ سکون و جمود سے قطع نظر کر کے آپ غور کریں اور سوچیں کہ علمِ کلام کی ضرورت پہلے کس وجہ سے ہوئی تھی کیا ہمارے اس زمانے میں اس ضرورت کی وجہ اور اس علم کی احتیاج کے اسباب باقی نہیں رہے۔ اس سوال کا جواب ہی آپ کو علم کلام کی بنیادی ضرورت سے آشنا کر سکتا ہے۔ اور بنیادی ضرورت کا وجود ہی اس وقت علمِ کلام کی انتہائی ضرورت کا یقین پیدا کر سکتا ہے۔

انسان کو ہر زمانے میں لباس کی ضرورت ہے۔ ہم جوانی میں بچپن سے زیادہ اور بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ لباس کے ضرورتمند ہیں اس پر اصرار کہ جوانی میں بچپن ہی کا لباس پہنیں گے بچپنا ہے اور بڑھاپے میں

جوانی کے زمانے کا بھڑک دار لباس کم عقلی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بچپن کے لباس کو لغو اور بے کار اس معنی میں نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے زمانے میں بھی بیکار و لغو تھا یا جوان ہو کر لباس کی وضع قطع اور عمومی شکل وصورت کو لغو کہہ کر ہم اس کی نوعی صورت یا بنیادی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ کرتا پاجامہ بہر حال اپنی نوعی صورت و شکل پر رکھکر نشو و نما پائے ہوئے جسم کے مطابق بنایا جاتا ہے۔ کسی مکان کی بنیاد (فونڈیشن) پر ہم مکان بناتے ہیں۔ ضرورت کے بڑھنے گھٹنے یا نئی احتیاج پیدا ہونے کے وقت ہم اس مکان کی بنیاد نہیں اکھیڑ دیتے بلکہ اس میں توسیع یا ترمیم واضافہ کر کے راحت وآرام مہیا کرتے اور احتیاج کو دور کرتے ہیں۔ بے شک کبھی ان تمام بنیادوں سے قطع نظر کر کے ایک نئے فونڈیشن پر نئی طرز کا مکان بھی بناتے ہیں جبکہ ہماری مطلوبہ ضرورتوں کے دور کرنے میں قدیم بنیادیں آڑے آرہی ہوں اور کوئی صورت ایسی ترمیم واصلاح یا توسیع کی باقی نہ رہی ہو کہ ان بنیادوں کو کام میں لا سکیں لیکن جب تک قدیم بنیادوں کا بے سود ہی نہیں بلکہ دشمنِ مقصود ہونا متیقن نہ ہو جائے اس وقت تک ایسا کرنا وقت ومحنت ہی کی بربادی نہیں بلکہ مال و جائداد کی تباہی کے ساتھ حماقت بھی ہے۔

انسانی ضرورتیں انسانیت کے ساتھ ساتھ باقی رہتی ہیں۔ ہاں زمانے اور حالات کے لحاظ سے ان کی صورت وکیفیت میں ضرور فرق ہو جاتا ہے۔ زندگی اور تمدن کی تمام احتیاجات کا یہی حال ہے آئیے ہم اس روشنی میں اس امر پر غور کریں کہ آخر علمِ کلام کی ضرورت واحتیاج کا سرچشمہ کہاں اور کیا ہے۔

علمِ کلام کی احتیاج کا سرچشمہ

یہ ایک سادہ اور بدیہی حقیقت ہے کہ اسلامی تعلیم معقول اور اقتضار فطرت کے مطابق ہے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اصول مذہب سے عقل کے تعلق کو منقطع کر دینے کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک وہ علم جو اصول اسلام کے لئے دلائلِ عقلیہ پیش کرے، یا شبہات وشکوک کو عقلی طریقہ سے دور کرے کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ ان میں کچھ تو وہ لوگ ہیں جن کو تصوف سے سابقہ ہے اور یہ تصور جمائے ہوئے ہیں کہ علم کلام محض لفاظیاں یا عقل کے تیر چلانے کا نام ہے۔ نیز دلائلِ عقلیہ سے کسی قسم کا اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ صرف متصوفین ہی مذہب کے حقیقی سائنسداں ہیں جو حضور قلب سے اصل حقیقت کو معلوم کر سکتے ہیں اور علم کلام کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور کچھ ایسے ہیں جو علمِ کلام کی ضرورت کو تو محسوس کرتے ہیں لیکن قدیم علمِ کلام کی جگہ ایسے نئے علمِ کلام کے قائل ہیں جس کی بنیاد اور اصول قدیم علمِ کلام سے بالکل الگ ہو۔ ان کے نزدیک قدیم علمِ کلام یکسر بیکار اور ناقابلِ التفات ہے۔ کیونکہ شکوک وشبہات پہلے فلسفہ یونان کی راہ سے آئے تھے قدیم علمِ کلام نے اسی راہ سے جوابات دیئے۔ حالیہ شکوک اور اعتراضات علوم جدیدہ کے ذریعے آتے ہیں اور اب اسی راہ سے جوابات کی ضرورت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علوم جدیدہ بالخصوص سائنس کی بنیاد تجربہ پر ہے اور تجربہ کا رد تجربہ ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ محض ذہنی اور عقلی دلائل سے۔

علاوہ ازیں علم کلام کے جواز و عدم جواز کی بحث تو اسی وقت پیدا ہو چکی تھی جب قدیم زمانے میں مسلمانوں نے اس کی بنیاد رکھی اور اس پر جدید تعمیر کی افراط و تفریط نے فقہا و محدثین اور معتزلہ کو دست بگریبان کر دیا تھا۔ متکلمین نے اعتدال پیدا کیا۔ غزالی اور رازی نے اعتزال سے پاک کر کے اسکی جان بچالی اور صحیح تربیت کر کے بقائے دوام عطا کیا تھا۔

لیکن خود ہندوستان میں جدید علم کلام کی ضرورت پر بحث جاری رہی ۔مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا شبلی۔ سرسید احمد خاں کے خیالات پڑھ کر اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ علم کلام جدید کی ضرورت اور عدم ضرورت پر کافی لکھا گیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تذکرہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

"ایک بزرگ کہ درس و نظر میں معقولات کے لحاظ سے آج کل مخصوص امتیازی درجہ رکھتے ہیں ایک دن اسی لب و لہجہ میں جو ان بزرگوں کے لئے مخصوص ہے۔ آج کل کے انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی مذہب سے بے خبری اور الحاد و بے خبری کی شکایت کرنے لگے میں نے کہا یہ شکایت کم از کم آپ لوگوں کی زبانی تو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ میرے خیال میں تو آپ اور وہ دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ اور ایک ہی مشرب و مسلک کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی قدامت و اولیت کی رعایت کرتے ہوئے ان کو آپ کا چھوٹا بھائی کہا جائے۔ آپ یونانیوں کے حلقہ بگوش۔ وہ یورپ کے پرستار۔ قرآن وسنت سے آپ بھی دور و مہجور وہ بھی بے خبر و نفور بلکہ سچ پوچھئے تو ایک لحاظ سے آپ وہ فضیلت رکھتے ہیں۔ آپ کے ائمہ و پیشوا فلاسفۂ یونان ہیں جن کا قدم ذہنیات ضالہ سے آگے نہ بڑھا۔ ان کے معبودان علم فلاسفر یورپ ہیں جنھوں نے بہر حال دنیا کے آگے تجربہ و استقرار اور کشفیات علمیہ کا دروازہ کھولا۔ ان میں کا ایک لڑکا جو اسکول کی پانچویں کلاس میں سائنس اور طبیعات کی ریڈر پڑھتا ہے۔ شاید آپ کے مدارس کے ان منتہیوں سے زیادہ صحیح راہ پر ہے جو صدرا اور شمس بازغہ سے بھی آگے پڑھ چکے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ صاحبوں میں مترجمین اور ناقلین عرب تھے جنھوں نے یونانیات کو عربی کا جامہ پہنا کر مقدس بنایا تھا اور معتزلہ و اخوان الصفا وغیرہم پیدا ہو گئے جنھوں نے مصطلحات و عبائر یونانیات کو علوم دینیہ میں امتزاج و خلط کیمیائی کے ساتھ ملا دیا۔ لیکن ان بیچاروں کو یہ اتفاقات اب تک نصیب نہیں ہوئے۔ معاملہ سرسید اور ان کے خوشہ چینان غیر معترف، و مقلدین غیر مقر، یا مجتہدین فی المذہب سے آگے نہیں بڑھا۔ اگر ان میں بھی کوئی اس ڈھب کا نکل آتا۔ تو آپ دیکھتے کہ ان کے مباحث خاصہ آپ کے امور عامہ سے تو ضرور بازی لیجاتے

کم از کم آپ حضرات کو تو اس معاملہ میں خاموش ہی رہنا چاہئے۔

محتسب چوں خود خورد معذور دارد مست را

لیکن اس تحریر میں کچھ آگے چل کر مولانا آزاد کا ارشاد ہے کہ اور یہ جو کچھ کہا تو معلوم رہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنھوں نے معقولیت قدیمہ کے یکقلم بے کار ہونے کا شور مچا رکھا ہے اور اصلاح نصابِ تعلیم کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ اس تمام دفتر کو بالکل غرق مئے ناب کر دیا جائے۔ کیونکہ اس عہد کے ہر کلمہ اصلاح کی طرح اس کلمے میں بھی سچ کے ساتھ جھوٹ مل گیا ہے اور اس بارے میں میرا خیال دوسرا ہے

مولانا شبلی اپنی کتاب علم کلام حصہ اول میں لکھتے ہیں۔

"لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں (یعنی قدیم علم کلام بیکار ہے) علم کلام کا جو حصہ آج بیکار ہے پہلے بھی ناکافی تھا اور جو حصہ اسوقت بکار آمد تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہیگا کیونکہ کسی شے کی صحت اور واقعیت زمانے کے انقلاب و استداد سے نہیں بدلتی"

بہرکیف اس دور کے مبصرانِ علم بھی علمِ کلام قدیم کو بالکل بے سود تو تصور نہیں کرتے البتہ قدیم علم کلام میں ترمیم و توسیع چاہتے ہیں۔

مخالفین علمِ کلام کو یہ امر فراموش نہ کرنا چاہئے کہ وہ امور ذیل کو مخلوط کر دیتے ہیں۔

(۱) اسلامی مسلمہ اصول و عقائد کو عقل کے مطابق ثابت کرنا۔

(۲) عمومی شکل میں ان تمام اعتراضات کے جوابات دینا جو غیر مسلموں کی جانب سے کئے جاتے ہیں۔

(۳) حقائق اسلام اور اسرارِ دین کے چہرے سے نقاب اٹھانا اور رازدار دین بنا دینا۔

علم کلام کا موضوع اول و دوم ہے تیسری چیز یعنی رازہائے سربستہ سے واقفیت اور کنہ تک پہنچ جانا نہ یہ علم کلام کا دعوی ہے اور نہ اس کا موضوع۔

علمِ کلام کی مخالفت میں کبھی آپ سنجیدہ مجلسوں میں یہ شعر سنیں گے۔

گر باستدلال کارِ دیں بدے

فخر رازی رازدارِ دیں بدے

لیکن افسوس کہ اس شعر کے بے سمجھے پڑھنے والوں نے اتنا سمجھنے کی زحمت نہ کی کہ اس شعر سے زیادہ سے زیادہ یہ ہی معلوم ہوا کہ رازہائے حقیقت تک رسائی دلائل عقلیہ کے بس کی بات نہیں۔ یا کارِ دیں استدلال پر موقوف نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ اس علم کی ضرورت نہیں ہے۔ یا اس کی ضرورت گھٹ گئی ہے۔ کیا تمام مسلمانوں کی واحد ضرورت یہی ہے کہ وہ سب کے سب رازدار دین بن جائیں۔

اس سے کم اور کوئی احتیاج نہیں ہے۔ اگر ہم آپ کے احترام کی وجہ سے یہ تسلیم یا فرض بھی کرلیں تو کیا اسلام کی اہم ترین ضرورت تبلیغ اسلام نہیں ہے۔ کیا یہ راستہ بغیر دلائل عقلیہ طے ہو سکتا ہے۔

اول تو سائنس اور تصوف دونوں ہی حقائق تک پہنچ جانے کے مدعی نہیں ہیں اور نہ اس دعویٰ پر قطعی اور یقینی دلیل قائم ہے۔ اس کے سوا اگر آپ غائر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے کہ سائنس اور تصوف دونوں ہی تجربے اور مشاہدے کے باوجود عقلی دلائل سے مستغنی نہیں ہیں۔ قدم قدم پر وہاں بھی اسی عقل سے مدد لی جاتی ہے جس کو بعض بے بصر لوگ بے ضرورت خیال کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ علم کلام کی بنیاد جن مسلّمہ اصول پر قائم ہے یعنی اسلامی عقائد و تعلیمات معقول اور فطری ہیں۔ یہ اصول کبھی فراموش نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اثبات مدعیٰ کے طریقوں میں تبدیلی اور تجدید ہوتی رہے اور یہ ہی تجدید قدیم و جدید علم کلام میں امتیاز پیدا کرتی ہے لیکن اس میں بنیادی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ اسی بنیاد پر طریقہ تفہیم اور اسلوب تعقل میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ عالمگیر اور دائمی مذہب کے لئے اس قسم کا تنوع ضروری تھا۔ چنانچہ قرآن کریم نے توحید، حشر و نشر کو جن متنوع طریقوں سے سمجھایا ہے وہ خود اس پر دال ہیں کہ مذہبِ اسلام صرف فلسفیوں کا مذہب نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے آیا ہے۔ ہر درجے اور ہر طریقے کا انسان اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے موافق جداگانہ راہوں سے سمجھ سکتا ہے اور یہ تفہیم کے مختلف اسلوب آپس میں ایک دوسرے کی تردید نہیں کرتے بلکہ ایک ہی بنیاد اور اصول کی تائید کرتے ہیں۔

اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کا آخری اور مکمل مذہب ہے اور اب قیامت تک کوئی دوسرا مذہب نہ آئیگا یہ خود مذہبِ اسلام کا دعویٰ بھی ہے اور واقعہ بھی لیکن سوال یہ ہے کہ تمام بنی نوع کو تبلیغ کیونکر ہو۔ امت مسلمہ کے علمار کرام اور مشائخین عظام پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کی تبلیغ کریں اور جو غلط شکوک و شبہات غیر مسلموں میں پیدا ہو چکے ہیں۔ ان کو دور کریں یہ ہی وجہ ہے کہ ہارون الرشید کے والد خلیفہ مہدی نے سب سے پہلے علما اسلام کو حکم دیا تھا کہ مذہب اسلام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کے جوابات کیلئے کتابیں لکھی جائیں۔

مروج الذہب مسعودی میں ہے۔

وکان المھدی اول من امر الجدلیین من اھل البحث من المتکلمین بتصنیف الکتاب علی رد الملحدین۔	سب سے پہلے مہدی نے علمار متکلمین کو جو بحث و مناظرہ مخالفین سے کرتے تھے حکم دیا کہ ملحدین کی کتابوں کا جواب لکھا جائے۔

پھر جب کبھی علمار کرام نے اس قسم کی سعی کی بہت سے غیر مسلم مسلمان ہو گئے اور غیر قوموں کو اسلامی تعلیم کو سمجھنے کا موقع ملا۔

ابنِ خلکان لکھتے ہیں "ایک مرتبہ مجوسیوں کی ایک جماعت ابوالہذیل سے مباحثہ کرنے کیلئے آئی تو ابوالہذیل نے سب کو لاجواب کردیا۔ ان میں کا ایک شخص میلاس تو اسی وقت دائرہ اسلام میں شامل ہوگیا ان کے ہاتھ پر تین ہزار اشخاص مسلمان ہوئے"۔

مولانا شبلی علمِ کلام حصہ اول میں لکھتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے۔ سندھ کے راجہ نے ہارون الرشید کو ایک خط لکھا کہ مسلمانوں نے اپنا مذہب تلوار کے زور سے پھیلایا ہے اگر اسلام دلائل و براہین سے ثابت ہو سکتا ہے تو آپ میرے پاس کسی عالم کو روانہ فرمائیں وہ مجھے قائل کردے گا تو میں مسلمان ہوجاؤں گا۔

علماءِ کرام کا یہ فرض ہے کہ ایک طرف وہ غیر مسلموں کو اسلامی دائرہ میں لانے کی سعی کریں اور دوسری طرف جن کو اسرارِ دین اور مذہب کی حکمتوں کا علم نہیں ان کو اس نعمتِ عظمیٰ سے آشنا بنائیں تاکہ غیر مسلم میں ایمان پیدا ہو اور مسلمان مومن بنیں جن کا ایمان صرف تقلید تھا وہ بذاتِ خود اس امر کا بھی ایقان و اطمینان حاصل کرلیں کہ اسلام مذہب حق ہے اور نجاتِ نوعِ انسانی اسی پر منحصر ہے۔ افہام و تفہیم رفع شکوک اور ردِّ اعتراضات کا نام لیتے ہی علمِ کلام کا تصور پیدا ہوجاتا ہے۔

امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں۔

کلّ من سلمت فطرتہ علم انّ الکلام لیس الا تقریر ھذہ الدلائل ودفع الاسئلۃ والمعارضات عنھا۔	ہر سلیم الفطرت انسان جانتا ہے کہ علمِ کلام ان دلائل کے ثبوت اور شکوک و شبہات کے دور کرنے ہی کا نام ہے۔
وانت لو فتّشت علم الکلام لم تجد فیہ الا تقریر ھذہ الدلائل والذبّ عنھا و دفع المطاعن والشبہات القادحۃ فیھا۔	اگر آپ غور و تامل کریں تو معلوم ہوجائے کہ علم کلام میں دلائلِ حق کو بیان کیا جاتا ہے اور ان شکوک و شبہات کو رد کیا جاتا ہے جو دلائل کو مجروح کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان کے پاس سوائے عقل کی روشنی کے اور کیا ہے جس کے ذریعہ دوسروں کو قائل کرسکے یا غیروں کو مطمئن بنا سکے۔

عارفِ اسرارِ شریعت متکلم اسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب تقریر دلپذیر میں فرماتے ہیں۔

(۱) "جوہرِ عقل و دانش جو ہر انسان کو کم و بیش عنایت ہوا ہے اس لئے دیا گیا ہے کہ اس سے حق و باطل کو پہچانیں اور نیک و بد کو جانیں"۔

(۲) چاند سورج میں اگر نورِ شعاع ہے تو انسان میں نورِ عقل ہے نورِ شعاع کا اگر

زمین و آسمان منور ہوتا ہے تو نور عقل سے کون و مکان زمین و زمان منور ہوتا ہے۔ پھر وہ (نور شعاع) اگر صورت دکھاتا ہے تو یہ (نور عقل) حقیقت کو کھولتا ہے"۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ کے صاحبزادے سلمہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کی ہے۔ ابو سعید کہتے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان اللہ تعالیٰ لما خلق العقل فقال لہ اقبل فاقبل ثم قال لہ ادبر فادبر ثم قال لہ اقعد فقعد فقال اللہ تعالیٰ طوبیٰ لمن رزقتک ایاہ بک اعطی وبک اٰخذ وبک اعبد وبک اثیب وبک اعاقب۔

جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا فرمایا تو اس سے کہا آگے بڑھ وہ آگے بڑھی پھر عقل سے فرمایا پیچھے ہٹ وہ پیچھے ہٹی پھر عقل سے فرمایا بیٹھ وہ بیٹھی۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اس کے لئے خوشخبری ہو جسکو میں نے تجھے عطا کیا۔ تیری ہی وجہ سے میں عطا کرونگا۔ تیری ہی وجہ سے مواخذہ کرونگا۔ تیری ہی وجہ سے میں پوجا جاؤنگا۔ تیری ہی وجہ سے میں ثواب دونگا اور تیری ہی وجہ سے میں عذاب دونگا۔

دوسری روایت میں ہے۔

لما خلق اللہ تعالیٰ العقل فقال لہ اقعد فقعد ثم قال لہ قم فقام ثم قال لہ ادبر فادبر ثم قال لہ تکلم فتکلم ثم قال لہ ابصر فابصر ثم قال لہ اسمع فسمع۔ قال وعزتی وجلالی وعظمتی ما خلقت خلقاً ھو اکرم منک بک اعبد وبک اعرف وبک احمد وبک اٰخذ وبک اعطی وبک اعاقب وبک اثیب۔

جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا فرمایا تو کہا بیٹھ وہ بیٹھی پھر اس سے فرمایا کھڑی ہو وہ کھڑی ہوئی پھر اس سے کہا پلٹ وہ پلٹی پھر اس سے فرمایا بات کر وہ بولی پھر اس سے کہا دیکھ، اس نے دیکھا پھر اس سے فرمایا سن۔ اس نے سنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قسم میری عزت وعظمت و جلال کی کہ میں نے تجھ سے زیادہ مرتبہ کی کوئی چیز پیدا نہیں کی تیری وجہ سے میں عبادت کیا جاؤں گا۔ جانا جاؤں گا۔ تعریف کیا جاؤں گا۔ مواخذہ کرونگا۔ انعام دونگا۔ عذاب دونگا۔ ثواب دونگا۔

قال بعض الفقہاء نحن لا نقول بان العقل جوھرٌ او عرض لکن العقل سببٌ واٰلۃٌ لحصول المعرفۃ ودرک الاشیاء۔

بعض فقہا نے فرمایا ہم یہ نہیں کہتے کہ عقل جوہر ہے یا عرض ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عقل معرفت کے حصول کا سبب اور ادراکِ اشیاء کا آلہ ہے۔

(تمہید۔ ابو الشکور سالمی)

اس سے انکار نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی شبہ ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامات نیز خود ان کا نمونۂ عمل یقیناً تبلیغ کے راستے میں غیروں اور اپنوں دونوں کے لئے اطمینان و ایمان پیدا کرنے والا ہے لیکن اول تو اس دور کی طرح ہمیشہ ایسے نمونۂ عمل شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں اور سواد اعظم کی رہنمائی ان پر موقوف کر دینا خلاف مصلحت و عقل ہے۔ دوسرے خود کرامات اور روحانی اثرات اجتماعی حیثیت سے مفید نہیں۔ کثرت سے انسانی طبائع انفرادی مختص طبیعتوں کے لحاظ سے آزادانہ عقل سے پرکھ کر کسی امر کی صحت و واقعیت کا علم حاصل کرنے پر مفطور ہیں۔ نیز انسانی طبائع کا انفرادی اختلاف ہر ایک کی ہدایت کے راستے بھی مختلف قرار دیتا ہے۔

الغرض نوعی حیثیت سے انسان عقل اور دلائل ہی سے مطمئن ہو سکتا ہے اس لئے ہر زمانے میں علم کلام کی ضرورت ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ دورِ حاضر میں عقل و آزادیٔ خیال کارفرما ہے۔ اولیاء کرام صحیح معنی میں شاذ و نادر ہیں۔ بالخصوص ایسے اولیاء اللہ جن کا تصوف غیر مسلموں کو مسلم اور مسلمانوں کو مومنِ کامل بنا دے کس قدر ہیں؟ آپ خود ہی فیصلہ فرمائیں۔ غیر مسلموں کو اسلام سے مزید برگشتہ بنا دینے والے اور مسلمانوں کو کافر قرار دینے والوں کا راج ہے۔ درحقیقت ہم اپنی اس بے راہ روی اور غفلت کے پردے میں تبلیغ اسلام کے فرض سے روگردانی کر کے علم کلام کی اہمیت کو گھٹانے کے عادی ہو گئے ہیں۔

اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایک منزل ایسی ہے جہاں عقل و دلائل ختم ہو جاتے ہیں اس جگہ براہین سے اطمینان قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ تب بھی یہ منزل بدون منزلِ عقل سے گزرے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ ایک دم اچک کر آسمان پر پہنچنا چاہیں ناممکن ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی میں مثالوں اور نظائر کے ذریعے عقل سے اپیل نہیں تو اور کیا ہے۔ اُلجھے ہوئے اسلامی مسائل کو عقل ہی کے ذریعے تو حل کیا گیا ہے۔ توحید و نبوت کو آپ کس طرح سمجھتے ہیں؟ خود فیصلہ فرمائیں۔ بیشک صرف عقل کافی نہیں ہے الہام وحی کی بنیادی ضرورت مسلّم ہے۔ لیکن الہام وحی کے بعد مسائل و صول کو عقل سے سمجھنے کی سعی شجر ممنوعہ نہیں ہے بلکہ عین تعلیم اسلامی ہے۔

اگر شاذ و نادر مسائل اسلام کو آپ عقل اور دلائل سے مستثنیٰ بھی کر دیں تب بھی کیا اکثر اصولِ اسلام عقلِ انسانی کے ذریعے نہیں سمجھے جا سکتے۔ جن چیزوں میں عقل کے دخل کو تم گناہ تصور کرتے ہو کیا ان کے مبادی اور مقدمات جن کے بعد تم کسی نتیجے پر پہنچتے ہو بدون عقل اور دلائل عقل کے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ تم اگر منطق و کلام کی اصطلاحات سے پرہیز کرو تو کیا غیر شعوری طور سے تم اور تمہارا دماغ ذہن و عقل ما اس کے بنائے ہوئے معیار ہی کے ذریعے نتائج اخذ نہیں کرتا۔

اہلِ علم و فن نے اس کے سوا کیا کیا ہے کہ انھیں چیزوں کے نام رکھ دیئے ہیں۔ ان کی تقسیم و تشریح کر دی ہے۔ تاکہ زیادہ وضاحت اور اطمینان سے انسان کام لے سکے اور غلطیوں سے بچ سکے ورنہ عقل

فکر، نظر، کلام، منطق، فطرتِ انسانی میں داخل ہیں۔ افسوس کہ ہم دلائلِ عقلیہ یا عقل سے کام لینے کو عبدیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ فنِ تصوف اور اہل اللہ کے طریقوں کے مغائر تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ خود عبادت، عبدیت، تصوف سب میں ہم کو قدم قدم پر عقل ہی کے ذریعہ دلائل اخذ کرکے غیر شعوری اور غیر اصطلاحی طریقوں پر دن رات کام کرنا ہوتا ہے۔ پھر یہ کیا ہے کہ تم نے علمِ دین اور علمِ کلام میں تضاد ٹھیرالیا ہے۔ ہم کو اپنے خیالات کی دنیا کو از سرِ نو جگانے اور اپنے تصورات پر نظرِ ثانی کرنے کی زحمت گوارا کرنی چاہیے۔

امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں۔

ان عنیتم ان الصحابۃ لم یستعملوا الفاظ المتکلمین فمسلم لکنہ لا یلزم منہ القدح فی الفقہ البتۃ وان عنیتم انہم ما عرفوا اللہ تعالیٰ ورسولہ بالدلیل۔ فبئس ما قلتم۔

اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ صحابہ نے علماء علم کلام کے اصطلاحی الفاظ استعمال نہیں کئے تو ہم مانتے ہیں لیکن محض اصطلاحی الفاظ استعمال نہ کرنے سے اسی طرح علم کلام ناجائز نہیں ہوسکتا جس طرح مثلاً فقہ کے اصطلاحی الفاظ بھی صحابہ نے استعمال نہیں کئے تو اس کی وجہ سے علم فقہ کو رد نہیں کیا جاسکتا اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے خدا تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بے دلیل (بے سمجھے) مان لیا تھا تو یہ ایک بہتان ہے۔

أفتریٰ ان الکلام یذم لاشتمالہ علیٰ ہذہ الادلۃ التی ذکرہا اللہ او لاشتمالہ علیٰ دفع المطاعن والقوادح عن ہذہ الادلۃ۔

علم کلام برا علم ہے۔ ایسا کہنا ایک بہتان ہے کیونکہ علمِ کلام ان دلائل و براہین پر مشتمل ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر فرمایا ہے اور علم کلام ان اعتراضات کی تردید کرتا ہے جن سے اسلامی اصول کو مجروح کیا جاتا ہے۔

آخر میں یوں فیصلہ فرماتے ہیں۔

ما أری ان عاقلاً مسلماً یقول ذلک ویرضیٰ بہ۔

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی عقلمند مسلمان اس علم کو بُرا کہنے پر راضی ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ علمِ کلام چونکہ خالص یونانیات اور مذہبیاتِ عقلی سے مخلوط ہوگیا۔ اس لئے محدثین اور فقہاء جو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے مسائل کو دیکھنے کے عادی تھے۔ اس علم سے بدظن ہوگئے۔ اور جب عقل و نقل میں جنگ چھڑ گئی تو ہر جماعت کے انتہا پسند اپنی اپنی صفوں کو سیدھا کرکے برسرِ پیکار ہوگئے۔ ایسی صورت میں اعتدال باقی نہ رہا۔ اور اس عقل و نقل کی جنگ میں ہر دو جانب سے اپنے اپنے سرمایۂ علم کو ایک دوسرے کی تردید بلکہ مٹانے کی سعی میں صرف کرنے لگے۔

عقل کے انتہا پسند معتزلہ کی صورت میں نمودار ہوئے اور نقل کے علمبرداروں کو ان کے زندقہ اور الحاد کا فتویٰ صادر کرنا پڑا۔ ایک قلیل جماعت ایسی بھی تھی جنھوں نے جنگ کے زمانہ میں بھی فکر ونظر سے کام لیکر اعتدال پیدا کرنے کی سعی کی اور اختلافات کی اس ہماہمی میں اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی۔ یہ لوگ دونوں جانب کے انتہا پسندوں کے رہنما تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام فخر الدین رازیؒ کو بعض علماءِ سلف کے ان بیانات کے متعلق جن سے علمِ کلام والوں کی کھلی تردید ہوتی ہے یہ راز فاش کرنا پڑا۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

واما تشدید السلفِ علی الکلام	لیکن سلف کی علمِ کلام کی مخالفت میں شدت
فمحمولٌ علیٰ اهل البدعة۔	درحقیقت اہلِ بدعت کے لئے ہے۔

اہلِ بدعت سے مراد وہی لوگ ہیں جنھوں نے اعتدال اور حقیقت سے ہٹ کر علمِ کلام کے مضامین میں یونانیت کو دینیات پر غلبہ دیا تھا۔

اس کے سوا علمِ کلام سے مخالفت کی بڑی وجہ ہمارے جدید حالات وضروریات کا اقتضاء بھی ہے چنانچہ علمِ کلام کے ذکر کے ساتھ ہی ہمارا ذہن قدیم علمِ کلام اور اس کی خصوصیات کی طرف ملتفت ہو جاتا ہے فقہاء ومحدثین کا خلاف متکلمین اسلام اور معتزلہ کی جنگ وجدل۔ روحِ اسلام پر خالص یونانیت کا تغلب وتصرف۔ ذات وصفاتِ خداوندی کے متعلق لفظی اور عقلی چہ میگوئیاں شرح مقاصد شرح مواقف امورِ عامہ خیالی جیسی سخت خشک درسی کتب کا پیچیدہ طرز بیان وغیرہ سامنے آجاتا ہے اسی تصور کے بعد جب ہم ایک لمحے کے لئے اپنی عصری مذہبی ضرورتوں اور وقتی احتیاج کا خیال کرتے ہیں۔ نیز موجودہ زمانے کے بدلے ہوئے رنگ نئے طرزِ درس۔ افہام وتفہیم کے جدید سلیس اور آسان طریقوں پر غائر نظر ڈالتے ہیں۔ تو فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ علم وقتی ضرورت کے تحت دنیا میں آیا تھا اور اب جبکہ ماضی کے نشانات کے ساتھ ساتھ وہ ضرورتیں اور احتیاجات بھی فنا ہو گئیں تو اس علم کا جنازہ بھی نکل گیا ہے۔ ہماری نسلوں کے پاس نہ اب اتنا وقت ہے کہ موجودہ ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ان بے کار بحثوں کی سخت پیچیدہ کتابوں کو مغز پاشی کر کے زندہ کریں اور نہ موجودہ حالات میں اس کی ضرورت۔ اس لئے ہم بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ علمِ کلام کم ازکم اس زمانے میں فضول ہے۔ اس علم کی جگہ دوسرے کار آمد وزندہ علوم کو پڑھایا جائے تو بہتر ہے۔ تاکہ ہم علوم جدیدہ میں کمال حاصل کر کے زندہ قوموں کی صفوں میں کھڑے ہو سکیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جدید علمِ کلام کی ضرورت یقینی ہے اور قدیم علم کلام میں ترمیم و اضافہ لابدی اور سنجیدہ علماء اس پر متفق ہیں کہ ایک ایسے علم کی ضرورت ہے جو جدید طریقے پر نئے نئے اعتراضات کے جوابات دے سکے۔ اور جدید غلط فہمیوں کو اسلامی تعلیم کے چہرے سے دور کر سکے

عقلی طریقے پر اصول اسلام کو سمجھائے۔ قدیم علم کلام کی پیچیدہ در پیچیدہ بحثوں کی جگہ سلیس اور علمی نصاب مرتب ہو۔ ان دوراز کار بحثوں کو خارج کر کے جو اس زمانے میں بجائے مفید ہونے کے مضر ہیں۔ ان مضامین کو شامل کیا جائے جن کی اس زمانے میں ہم کو ضرورت ہے۔ غرض قدیم اور جدید مفید علم کلام کی بحثوں کو ترتیب دے کر عصری علم کلام کو مدون کیا جائے۔

علم کلام کی تدوین میں پہلے سے ایک نقص چلا آتا ہے وہ یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کیلئے علم کلام اور غیر مسلموں کے لئے علم کلام کو الگ الگ نہیں کیا۔ اس اصول پر بعض قدیم مصنفین نے تصنیفات کی تھیں۔ چنانچہ یعقوب کندی نے پارسیوں کے رد میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے نصاریٰ اور یہودیوں کی تردید میں رسالے لکھے۔

لیکن اصولی طور سے علم کلام کو دو الگ الگ حصوں میں مدون نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس کی ضرورت پہلے بھی اور اس زمانے میں بھی شدید ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ عقل مسلم اور غیر مسلم کی الگ الگ نوعیت کی نہیں ہوتی۔ عقلی اعتراض ایک مسلم کو بھی ہو سکتا ہے اور غیر مسلم کو بھی۔ اور اگر جواب معقول دیا جائے اور خالص عقلی طریقہ سے کسی مسئلہ کو مبرہن کیا جائے تو دونوں کے لئے یکساں طور سے مفید ہوگا۔ لیکن طریقۂ تفہیم و استدلال کے اعتبار سے ایک مسلم اور غیر مسلم میں فرق ہو جاتا ہے نیز مسلم اور غیر مسلم کے اعتراض اور شبہات میں اپنی اپنی نوعیت کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ مسلمان وہ اطمینان چاہتا ہے جس سے پہلے ایمان موجود ہے۔ مسلمان پہلے بہت سے ایسے اصول اسلام کے تسلیم کر چکا ہے جس کے بعد بہت سے وہ شبہات جو اس کے ذہن و دماغ میں وقتی طور سے آئے ہیں۔ معمولی سی عقلی تفہیم یا دینی اسرار و حکم کے ذریعہ دور ہو جاتے ہیں یہاں بنیاد الہام و وحی ہے۔ دلائل عقلیہ اس کی تائید میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ غیر مسلم کے لئے بنیاد ہی عقل اور دلائل عقلیہ ہیں اس کا ایمان و ایقان دلائل پر موقوف ہوتا ہے اس لئے اور بہت سے دیگر مصالح کی وجہ سے علم کلام برائے مسلم اور علم کلام برائے غیر مسلم کی بنیادی تقسیم کے ساتھ اگر عصری کلام کو مرتب کیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ دونوں قسم کے علم کلام میں اصولی فرق ہو جاتا ہے۔

آپ غور کریں اگر مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے ایک ہی طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کا نتیجہ بدیہی ہوگا جو آج علم کلام قدیم کے متعلق ہمارے سامنے ہے اور ہمارا خیال ہے کہ قدیم زمانے میں جو کچھ متکلمین و محدثین کے درمیان غلط فہمیاں اور اختلافات ہوئے ان کی بنیادی وجہ یہ اختلاط طُرُق ہے اگر ہم دونوں کا طریقہ الگ الگ قائم کر کے دونوں سے ان کے محل و مصرف کے مطابق کام لیں تو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

علم کلام کا وہ حصہ جو غیر مسلموں کے لئے ہو وہ خالص عقلی دلائل اور تحقیقات جدیدہ کی

مدد سے اس طرح آراستہ کیا جائے کہ اصل تعلیم اسلام اور مسئلے میں بھی کوئی فرق نہ آنے پائے۔ مقصود بھی مسئلے کو توڑ موڑ کر یا اصولِ اسلام میں تراش خراش کر کے مسائل و اصول اسلام کو وقت کے مطابق بنانا نہ ہو بلکہ اصل مسئلے اور اصول کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھ کر دلائل عقلیہ اور تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں اثبات ہو۔ اس حصۂ کلام کو عصری تبلیغی علم کلام سے موسوم کیا جائے۔ بہرکیف اس حصۂ علم کلام میں عقلیات اور تحقیقات کا غلبہ ہوگا۔ اور علم کلام کا وہ حصہ جو مسلمانوں کے لئے ہو۔ اس میں غلبہ دلائل سمعی اور شرعی کا ہو لیکن دلائل عقلیہ ثانوی حیثیت رکھیں۔ اسرارِ دین اور حِکَمِ شرعیہ کو فاش کیا جائے۔ اس کا نام عصری تفہیمی علمِ کلام رکھا جائے۔ اس میں علم اسرارِ دین کو شامل کر کے پر اثر بنایا جائے۔ غالباً تفہیمات یا تفہیم کا لفظ اس خصوص میں اہلِ علم کے لئے نیا نہ ہوگا۔

ہم نے عصری علم کلام کی تدوین و ترتیب کے طریقے کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ اور اس کی دو حصوں میں بنیادی تقسیم بتائی ہے۔ اس طریقہ کار سے علم کلام کو مفید ترین اور زندہ کیا جا سکتا ہے۔ اور سینکڑوں پیچیدہ اور دشوار مباحث و اختلافات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ علمِ کلام قدیم عصری علمِ کلام کی تدوین و ترتیب میں بہت بڑی بنیادی مدد دے گا۔ بہت سے مباحث ہم کو لب و لہجے اور طریقۂ تفہیم و درس میں تجدید پیدا کرنے کے بعد تیار اور بنے بنائے ملیں گے۔ محنت اور وقت دونوں میں بچت کے ساتھ منزلِ مقصود کا سفر مختصر اور آسان ہو جائے گا۔ اور جدید متکلمین اسلام اور قدیم متکلمین دونوں سے ہم کو بڑی مدد ملے گی۔ بڑا کام ان مباحث کا احتیاط کے ساتھ انتخاب اور عمدہ جدید ترتیب و تدوین ہے اور یہ ہی ہمارا مقصد عصری علمِ کلام سے ہے۔ عنوانِ عصری علمِ کلام۔ ہم نے بہت غور و خوض کے بعد اختیار کیا ہے اور جدید علمِ کلام سے پرہیز کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں اربابِ نظر اور صاحبانِ ذوق غالباً اس کو پسند فرمائیں گے۔

عصری علمِ کلام کی بنیاد آپ سنجیدگی سے غور فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے یہ ایک حقیقت ہے کہ علمِ کلام کی اساس مذہب اسلام کے اس دعوی پر قائم ہے کہ وہ

"معقول اور فطری مذہب ہے"

یعنی مذہب اسلام اور اس کے اصول و احکام عقلِ سلیم کے مطابق اور قابلِ فہم ہیں۔ اور فطری قوتوں کے اقتضار کے مطابق ہونے کی وجہ سے انسانی فطرت کے خلاف نہیں۔ وہ مذہب جو بلا تخصیصِ نسل و ملک تمام نوعِ انسان کی رہنمائی کے لئے آیا ہو معقول اور فطری ہی ہو سکتا ہے۔ غیر فطری مذہب فطرتِ انسانی کے لئے ایک بوجھل زنجیر اور جبری حکم ہوتا ہے اور یہ ہی حال اس مذہب کا ہوتا ہے جو عقلِ سلیم کے غیر مطابق اور نا قابلِ فہم ہو اس کا جبری مذہب ہونا بدیہی ہے۔ اسلام کا یہ دعوی قرآنِ کریم اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے جو اس مذہب کی تعلیمات اور اصول کے

اساس ہیں۔ لیکن اس دعویٰ کے ساتھ ہی کہ اسلام عقلِ سلیم کے مطابق اور فطری مذہب ہے۔ ہمارے سامنے وہ تمام اعتراضات اور شکوک آجاتے ہیں جو عقل انسانی کی طرف سے اس مذہب کے احکام اور اصول پر کئے جاتے ہیں یا خود مسلمان یا غیر مسلم کے دماغ میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ شکوک و شبہات ایمان و اطمینان کی دنیا کے دشمن ہیں۔ ان کی تخصیص مسلم دماغ یا غیر مسلم دماغ سے نہیں کی جا سکتی یہ جس طرح بعض اوقات ایک مسلم کے دل و دماغ کو پراگندہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک غیر مسلم کو مذہب اسلام کے متعلق بڑی بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا رکھکر رہنمائی اور ہدایت سے بھی روک سکتے ہیں۔ بلکہ دشمن بنا کر قوموں کو باہمی فتنوں اور فسادوں میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ اس لئے علمِ کلام ایک طرف تو اپنے اس دعویٰ کی تفہیم اپنی تعلیم سے کرتا ہے کہ اسلام معقول اور فطری مذہب ہے۔ اس کی نشات کسی ناروا عصبیت اور بے جا تخصیص کے تحت نہیں ہوئی۔ دوسری طرف ان اعتراضات اور شکوک کو رفع کرتا ہے۔ جو غلط طور پر عقلِ سلیم کے آڑے آگئے ہیں اور جن سے یہ ایقان مجروح ہوتا ہے کہ اسلام عقلِ سلیم کے مطابق اور فطری مذہب ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ کھرے اور کھوٹے اچھے اور برے کو سمجھنے کے لئے خداوند تعالیٰ نے انسان کو نور عقل دیا ہے۔ لیکن اس نور کو بجھانے اور مقابلے کے لئے شکوک و شبہات اور اعتراضات کی ظلمت بر سرِ پیکار ہے۔ یہ ظلمت ایمان و اطمینان کی دشمن ہے فتنوں اور جہالتوں کی پرورش کرتی ہے اس لئے رہنمائی اور سچائی کے متلاشی کے لئے علمِ کلام کی ضرورت زندگی کی دوسری تمام ضرورتوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ علمِ کلام کی اس اساس اور بنیاد کا قرآنِ کریم پر غور و خوض کی نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے اور پھر اس کی اہمیت اور ضرورت کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔

علم کلام کی اساس قرآنِ کریم کی روشنی میں

مذہب اسلام نے نورِ عقل سے کام لینے کی ہدایت کی ہے اور تدبر و تفکر کی دعوت قرآنِ کریم نے جا بجا دی ہے۔ توحید عبادت نبوت حشر و نشر کو دلائل عقلیہ سے سمجھایا ہے۔ ان لوگوں کو جنھوں نے عقل کی آنکھ بند کرلی ہے اور محض آبا و اجداد کی کورانہ تقلید پر ضد اور اصرار کرتے ہیں سخت برا کہا ہے۔ اس قسم کے مضامین کلام اللہ میں اس کثرت و تنوع کے ساتھ موجود ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں۔

الحمد للہ کے ساتھ ہی رب العلمین کہکر اُن دیکھے خدا تک رسائی کا ذریعہ عقل ہی کے توسط سے سمجھ میں آتا ہے۔ تعریف صرف اللہ ہی کے لئے ہے آخر کیوں۔ یہ دعویٰ کس طرح صحیح ہے جبکہ دنیا کی ہر خوبصورت۔ کمال والی چیز کی تعریف کی جاتی ہے اس لئے تعریفیں تو لاکھوں کروڑوں اشیاء کے لئے ہیں صرف خدا ہی کی تعریف کہاں رہی؟

عقل ہی رازدار ہے کہ رب العالمین کہکر ایک ایسی ذات کی طرف متوجہ فرمایا جو دنیا کے تمام کمالات کا سرچشمہ ہے اور ہر چیز کی بقا اور حیات کی پرورش کر رہی ہے۔ آخر خوبصورت برتن عمدہ قسم کی مٹی کی تعریف، کاریگر اور اس مٹی کے بنانے والے، اس کی پرورش کرنے اور اس کی بقا کا سامان مہیا کرنے والے کی تعریف نہیں تو اور کس کی ہے؟ ہاں الفاظ و عبارتیں بہت ہیں اور ظاہر بین اور سطحی نظر سے مطالعہ کرنے والے کے لئے قابلِ تعریف چیزوں کی کثرت ہے لیکن مفہوم و معنی تو ایک ہی ہیں اور اس کثرت ظاہری کے پیچھے وہ ہی ایک حقیقت اور راز پوشیدہ ہے کہ الحمد للہ رب العالمین تعریف صرف اسی ذات کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ پھر یہ سوال کہ آخر وہ ذات جس کے لئے تعریف خاص ہے کہاں ہے؟ جس کو تم اللہ کہتے ہو کون ہے؟ کیا انسانی فطرت کی اس تشنگی کو عقل ہی کے ذریعے نہیں بجھایا گیا کہ وہ رب العالمین ہے۔ تم اللہ نہ کہو یہ تمہاری ضد ہے، خدا نہ کہو ہٹ دھرمی ہے۔ لیکن کیا تمہاری توانائی میں ہے کہ کائنات کے سلسلہ کی جو پرورش ہو رہی ہے روزِ روشن سے زیادہ نمایاں اس حقیقت کا انکار کر سکو۔

ذرّے سے لیکر ہمالیہ پہاڑ تک، قطرے سے لیکر سمندر تک، پتھر سے لیکر انسان تک غرض زمین و آسمان کی تمام کائنات کے وجود اور وجود کی بقا کے سامان اور قدرت و فطرت کے محکم انتظامات کا انکار کیا انسان کر سکتا ہے؟ علوم و فنون کی تمام طاقتیں دنیائے سائنس و فلسفے کی تمام توانائیاں کیا سلسلۂ ربوبیت کا انکار کر سکتی ہیں؟ اگر نہیں تو نورِ عقل ہی کو تو دعوت دی گئی ہے کہ غور و خوض کرے کہ رب العالمین کون ہے۔ عقل ہی نے تو ہمیں سمجھایا کہ اس پروردگار کائنات کا نام قرآن نے اللہ رکھا ہے۔

قرآنِ کریم نے تمام بنی نوعِ انسان کو خطاب کیا۔ یا ایھا الناس اعبدوا اے بنی نوعِ انسان عبادت کرو۔ لیکن کیوں عبادت کریں۔ کس کی عبادت کریں۔ ان سوالات کا حل ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون نے عقل اور دلائل عقلیہ ہی سے تو کیا ہے یعنی کائنات کے پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے آباؤ اجداد کو پیدا کیا ہے جن کی تم نسل ہو عبادت کرو۔ لعلکم تتقون ہی نے تو اس سوال کا جواب دیا کہ کیوں عبادت کریں۔ عبادت سے ہماری اس زندگی میں کونسا گوہر مقصود حاصل ہوگا۔ یعنی عبادت سے تم متقی ہو جاؤ گے۔

متقی ایک خاص لفظ ہے اس کے معنی میں حیرت انگیز اور عجیب و غریب وسعت ہے۔ زبانِ اردو کا معمولی استعمال شدہ متقی ہی نہیں بلکہ اس مفہوم سے کہیں زیادہ اس لفظ کے دامن میں معانی پوشیدہ ہیں۔ حقائق چھپے ہوئے ہیں۔ اپنے محسن، اپنے خالق کی شکر گزاری انسانی فطرت کو جو نکھار اور جس قسم کا جوہر عطا کرتی ہے اس کو متقی کا لفظ ٹھیک ادا کرتا ہے۔ غرض

قرآنِ کریم کا لفظ لفظ اس قسم کے عقلی ربط کو اسلامی احکام سے اس طرح وابستہ بتاتا ہے کہ احاطہ ممکن نہیں۔

یہ تو ایک سادہ ربط تھا جس کو علومِ عقلیہ، منطق و فلسفے کے مقدمات و نظریات سے جو الجھی ہوئی اصطلاحات معلوم ہوتی ہیں۔ تقریبی وحدت کا تعلق محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کریم میں لوکان فیہما آلہۃ الا اللہ لفسدتا سے توحید کی فنی عقلی دلیل کا ذکر واضح طور سے سمجھ میں آتا ہے ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتو بسورۃ من مثلہ سے نبوت پر فنی عقلی دلیل کی شہادت ملتی ہے۔ قل یحییہا الذی انشأہا اول مرۃ سے حشر و نشر یا معاد پر فنی عقلی دلیل کا ثبوت ظاہر ہے۔

غرض مذہب اسلام نے احکام و اصول میں عقل کو اچھوت نہیں قرار دیا بلکہ اس کے احکام سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ وہ معقول و فطری مذہب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات کی فضیلت پر اسلام نے زور دیا ہے جن میں عقلی مطالب ہیں۔ سورۂ اخلاص۔ آیۃ آمن الرسول اور آیۃ آیۃ الکرسی کی جس قدر فضیلت ہے ظاہر ہے وہ آیتیں جن میں احکامِ شریعت (جزئیات ہیں) چھ سو آیتوں سے بھی کم ہیں باقی تمام قرآن۔ توحید و نبوت کے عقلی ثبوت اور بت پرستی اور شرک کی عقلی مذمت پر مشتمل ہے۔ صانع عالم یا خدا کے وجود کے دلائل سے تو قرآن کریم بھرا ہوا ہے۔ نیز ملائکہ اور انبیاء کرام کی زبان سے قرآنِ کریم نے دلائل عقلیہ کو اکثر جگہ بیان کیا یا حکایت کی ہے۔

غرض اگر اس بنیاد و اساس کے لحاظ سے غور کریں تو ہر وہ مسئلہ اور اصول جو شکوک و شبہات سے پاک نہ ہو بلکہ اپنے دامن میں اعتراضات اور غلط فہمیاں لئے ہوئے ہو، علمِ کلام کی حدود میں آجاتا ہے۔ عصری علمِ کلام کی یہی اساس ہے اور اس اساس کا ثبوت ہم کو قدمار میں ملتا ہے غیر مسلموں کو تبلیغ ہو یا مسلمانوں کو تفہیم۔ خالص عقلی بحثیں ہوں یا علم اسرار دین سب ہی علم کلام کے سمندر میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے موجودہ دور میں علمِ کلام کی بے پایاں وسعت کو آپ محسوس کر سکتے ہیں۔

امریکہ میں مشرقی علوم کی اشاعت

از جناب مولوی حافظ رشید احمد صاحب. بی. اے

مندرجہ ذیل مضمون امریکن یونیورسٹی بیروت کے ایک پروفیسر حتیٰ فلپ خوری کی تحقیقات کا نتیجہ ہے جو "الہلال قاہرہ" میں شائع ہوا تھا۔ صاحب موصوف ریاستہائے متحدہ امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی کے علوم مشرقی کے پروفیسر رہ چکے ہیں اسی وجہ سے ذیل کی معلومات ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہیں۔ اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امریکہ جیسے دور افتادہ براعظم میں جس کا مشرقِ قریب کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے آبا و اجداد کے علوم کی اشاعت کے لئے کس قدر انتھک کوششیں ہو رہی ہیں۔ کیا اہلِ بصیرت ان حقائق کو چشمِ بصیرت سے دیکھیں گے۔ ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں علوم مشرقیہ کا چرچا اور ذوق و شوق اس قدر نہیں جس قدر یورپ میں ہے۔ اس کی وجہ بڑی حد تک جغرافی بعد، تجارتی اقتصادی اور سیاسی تعلقات کا فقدان ہے۔ تاہم علومِ مشرقیہ کی تعلیم و اشاعت کا جذبہ وہاں بالکل معدوم نہیں ہے بلکہ کمتر پیمانہ پر وہاں بھی یورپ کی طرح مشرقی علوم کی تعلیم و اشاعت کا زبردست انتظام ہے۔

چونکہ مشرقِ قریب کے ساتھ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سیاسی اور اقتصادی تعلقات اس طرح قائم نہیں ہیں جس طرح کہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی کے تعلقات ہیں اس لئے سوائے مذہبی جذبات کے اور کوئی محرک نہیں جو انھیں مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرے۔ وہی نوجوان طلبار جو عیسائیوں یا یہودیوں کے مذہبی پیشوا بننا چاہتے ہیں اپنی مقدس کتابوں کے تعلق سے سرزمین مشرق کی تاریخ، لٹریچر اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کا قصد کرتے ہیں۔ انھیں میں وہ طلبار بھی شامل ہیں جو بلادِ اسلامیہ، چینی اور جاپانی ممالک میں مذہبی تبلیغ و اشاعت کا کام سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان مقامات کے باشندوں کی زبان، مذہبی رسوم اور ان کے لٹریچر سے بخوبی واقف ہوں مگر اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ امریکن کالجوں کے مشرقی شعبہ کے تمام طلبار مذہبی نقطۂ نگاہ سے ان علوم کی تحصیل کرتے ہیں بلکہ ان میں متعدد طلبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مقدس مقامات کی سیر و سیاحت یا مشرقِ قریب میں تجارتی سلسلہ قائم کرنے یا امریکن سفیر و قونصل بننے کے لئے ان علوم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چند

طلبا ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان مشکل علوم پر محض علمی اور طبعی ذوق کی وجہ سے توجہ دیتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سیاسی اور تجارتی تعلقات مشرق اقصی (جزائر فلپائن۔ چین، جاپان) کے ساتھ بہ نسبت مشرق قریب کے زیادہ مستحکم اور قوی ہیں مگر دیگر علوم مشرقی کی بہ نسبت امریکن طلبا کی توجہ سامی علوم و فنون کی طرف بہت زیادہ ہے جس کی وجہ وہ تاریخی تعلقات ہیں جن کی وجہ سے فلسطین ہیں لاکھ امریکن یہودیوں اور دس کروڑ امریکن عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔

تعلیم و اشاعت کے وسائل امریکہ میں علوم مشرقیہ کی تعلیم و اشاعت کے چار بڑے ذرائع ہیں۔ مدارس رسائل۔ کتب خانے۔

مشرقی مدارس اس قسم کے مدارس دو طرح کے ہیں۔

(۱) وہ مدارس اور شعبہ جات جن کا یونیورسٹیوں سے تعلق ہے۔

(۲) وہ مدارس جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ہے اور اس کے ساتھ مشرقی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

سب سے پہلے یونیورسٹیوں کے مدارس کا ذکر ہوگا۔

مشرقی شعبہ جات امریکن یونیورسٹیوں میں مشرقی علوم کی تحصیل کے لئے مختلف شعبہ جات موجود ہیں جن میں صرف گریجویٹ شامل ہو سکتے ہیں۔ ایسا طالب علم وہاں ایک یا دو سال تک تعلیم حاصل کرتا ہے اس کے بعد وہ ایم اے کی ڈگری کا مستحق ہوتا ہے اور اگر وہ ایک سال اور تحقیقات میں مصروف رہے تو اسے ڈاکٹری کا ڈپلوما بھی مل جاتا ہے۔ امریکہ میں کم از کم تیس یونیورسٹیاں ایسی ہیں جن میں علوم مشرقی کا باقاعدہ انتظام ہے۔ ان میں زیادہ اہم اور قابل ذکر یایل۔ ہارورڈ۔ کولمبیا۔ جونسن ہپکنس۔ پسلوانیا۔ اور شکاگو، کے جامعات ہیں۔ ہر ایک جامعہ میں مشرقی شعبہ کے ماتحت مشرقی زبانوں اور سامی علوم مثلاً۔ سریانی، عبرانی اور عربی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نیز اردو۔ فارسی۔ سنسکرت، پہلوی۔ جاپانی۔ چینی اور ترکی لٹریچر کی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام ہے۔

ہارورڈ کالج ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سب سے پرانا ہارورڈ کالج ہے۔ جس کی بنیاد ۱۶۳۶ء میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز پر پڑی۔ اس کے کئی پرانے گریجویٹوں نے مذہبی پیشہ اختیار کیا۔ اس وجہ سے اس کالج کے پرانے دستور العمل میں عبرانی زبان اور مشرق کی تاریخ قدیم کا درس شامل تھا۔ مگر مشرقی شعبے باقاعدہ طور سے سالِ گذشتہ کے آغاز ہی میں منظم ہوئے ہیں۔ اس بارے میں کولمبیا اور یایل کے جامعات نے سب سے پہلے قدم اٹھایا۔ ہارورڈ آج تک مشرقی علوم کی تحصیل کا اہم امریکی مرکز شمار کیا جاتا ہے وہاں عربی کے پروفیسر ڈاکٹر جیمس جیوٹ (James Jewett) ہیں انھوں نے امریکن یونیورسٹی بیروت میں بھی درس دیا ہے اور سبط ابن الجوزی کی کتاب "مرآۃ الزمان" بھی انھوں نے طبع کرائی تھی۔

ہارورڈ کے دوسرے مستشرق جارج فٹ مور (G.Fout Moore.) ہیں جو سامی لٹریچر کے سب سے بڑے امریکی عالم سمجھے جاتے ہیں۔ ایک پروفیسر لیو وینر (L. Wiener.) ہیں جنھوں نے عربی تمدن کا ہسپانوی قوم گاتھ کے ساتھ تعلق کے عنوان پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔

یایل یونیورسٹی کے مشرقی پروفیسر ڈاکٹر البرٹ کلے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف ایک جدید نظریے کے بانی ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ شمالی شام اور لبنان سامی قوم کا گہوارہ تھا۔ ڈاکٹر ٹاری بھی وہاں عربی زبان کے ایک معتبر فاضل سمجھے جاتے ہیں۔ یایل میں ایک عمدہ عجائب خانہ مشہور امریکن دولتمند مسٹر مورگن کی مالی امداد سے قائم کیا گیا ہے جس میں سامی تمدن کے متعلق نادر اشیاء موجود ہیں۔

امریکن اساتذہ

مشرقی شعبوں میں تمام اساتذہ امریکن، عیسائی اور یہودی مستشرقین ہیں۔ بعض پروفیسر جرمنی کے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ مشرقی ممالک کا کوئی عالم اس منصب پر متعین نہیں ہے۔ عام طور پر یہ اساتذہ جرمن یونیورسٹیوں کے فارغ شدہ ہیں اور خاص کر لیزگ اور برلن ان کا تعلیمی مرکز ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کی جامعات کا تعلیمی دستور العمل اور طریقہ تعلیم اصولاً جرمنی مدارس کے پروگرام کے مطابق رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جرمنی ہی کی تالیف کردہ کتابیں بھی نصاب میں داخل ہیں۔ چنانچہ عربی نحو میں سوسن کی مرتب کردہ کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ اور سریانی سبق کے لئے بروکلمن کی تالیف کردہ کتاب داخل نصاب ہے۔ اسی طرح اشوری زبان کی تعلیم دلیتس کی کتاب سے دی جاتی ہے اور قبطی زبان کی تعلیم کے لئے سینڈوروف کی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔

امریکن مستشرقین عربی زبان میں گفتگو اور تحریر پر اچھی طرح قادر نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ مصر و شام کی سیاحت بھی کر آتے ہیں پھر بھی ان کا تلفظ درست نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک مستشرق نے ایک مرتبہ تعارف کے بعد سب سے پہلے یہ سوال کیا کیا آپ "نخو" سے شناسا ہیں؟"

اس نے نحو کا تلفظ خائے معجمہ سے کیا۔ کیونکہ ان لوگوں کے لئے ہائے حطی سے تلفظ ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم اس قسم کی خامیوں کے باوجود یہ لوگ عربی زبان کے کتابی لٹریچر تاریخ اور فلسفہ زبان (فیلالوجی) کے زبردست ماہر ہوتے ہیں۔ عربی اشتقاق اور فلسفہ زبان پر انھیں اس قدر مہارت ہوتی ہے کہ اس بارے میں میرے خیال میں شام و مصر کا کوئی عالم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سامی زبانوں کا سلیبس

چونکہ کولمبیا یونیورسٹی کا مشرقی شعبہ سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ منظم ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ قارئین کرام کے سامنے اس کے اہم اسباق کا سلیبس تحریر کروں جو اس کے شائع کردہ پروگرام سنہ ۱۹۲۱ء سے ماخوذ ہے۔ (شعبوں کی ترتیب حروف ابجد کے لحاظ سے ہے)۔

سامی زبانیں

الف۔ عبرانی زبان۔ (۱) قدیم عبرانی زبان کے قاعدے اور اصول۔ (۲) تلمود کا انتخاب (۳) عہد متوسط کے فلاسفر۔

ب۔ سامی تحریرات۔ (۱) فینقی خط کی تشریح اور حروف تہجی کی تاریخ۔ (۲) شنجری آرامی تحریر کی تشریح۔ (خط سند اور حمیری کے کتبوں کی تشریح۔

ج۔ اشوری اور سومری۔ (۱) زبان کے ابتدائی قواعد۔ (۲) نحو۔ (۳) تکوین اور غلفمیش کے قصوں کی خواندگی۔ (۴) قانون حمورابی۔ (۵) بابلی، اشوری اور سومری کے منتخب لٹریچر کا پڑھنا۔

د۔ عربی۔ (۱) صرف ونحو کے قواعد اور عام خواندگی۔ (۲) ابن خلدون کی خواندگی اور تشریح۔ (۳) قرآن شریف۔ (۴) عربی زبان جو مصر و شام میں مروج ہے۔

نوٹ:۔ عربی۔ عبرانی۔ چینی وغیرہ مروج زبانوں کے اسباق میں شام کو ہر خواہشمند طالب علم شریک ہو سکتا ہے۔

ہ۔ سریانی۔ (۱) نحو اور بائبل مقدس کے سریانی ترجمہ کی خواندگی (۲) سیر القدیسین۔ (۳) شعر و نظم۔

و۔ حبشی زبان۔ حبشی زبان کی گرمر اور منتخب خواندگی۔

نوٹ:۔ (مذکورہ بالا زبانیں سامی زبان کی قدیم شاخیں ہیں۔)

ز۔ تاریخ مشرق۔ (۱) مغربی ایشیائے قدیم کی تاریخ فارسی عہد تک۔ (۲) عربی تمدن کا نشوونما اور اسلام کا زمانۂ عروج (۳) موجودہ ترکی اور مصر کا دور احیاء اور ان کا اجتماعی اور سیاسی انقلاب۔

ع فیلالوجی یا سامی ادبیات کا فلسفۂ زبان۔

ط۔ مصری زبان۔ قبطی زبان کے قواعد جو قدیم زمانہ میں مروج تھے۔ اس کے بعد اسی دستور العمل میں آرین اور ہندوستانی زبانوں کا نصاب اور سلیبس بھی مندرج ہے۔ چنانچہ سنسکرت، پالی وغیرہ زبانوں کے متعدد شعبے قائم ہیں۔ زردشتی (جو ایران کا قدیم مذہب تھا اور جس کو پارسی قوم مانتی ہے)۔ بدھ مذہب اور تاریخ ہندوستان اور تاریخ ایران کی تعلیم کا انتظام بھی ان شعبہ جات میں موجود ہے۔ نہ صرف اسی پر اکتفا کیا گیا ہے بلکہ ارمنی۔ ترکی، چینی، جاپانی زبانوں کی تعلیم اور ان کا نصاب و سلیبس، مشرقی شعبہ جات کی طرف سے تیار کیا گیا ہے۔ الغرض کولمبیا یونیورسٹی ان تمام اسباق کا ہر اس طالب علم کے لئے انتظام کرتی ہے جو ان کی تحصیل کا ارادہ رکھتا ہو۔

مذکورہ بالا دستور العمل سے ہمیں اس وسیع اور خاص طریقے کا پتہ چلتا ہے جس پر امریکہ کے مستشرقین گامزن ہیں اور جس کی قدر و قیمت شام و مصر کے لوگ اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔

(باقی آئندہ)

ادبیات

دعوتِ عمل

از جناب روش صدیقی

جنتِ دیدہ بہ اندازِ دگر پیدا کر
حسن آباد ہو جس میں وہ نظر پیدا کر

کب سے پامال ہیں یہ ترک و طلب کی راہیں
عشق کی ایک نئی راہ گذر پیدا کر

منتظر ہیں ابھی تیرے لئے لاکھوں جلوے
تو ذرا وسعتِ دامانِ نظر پیدا کر

فلکِ عشق کے ٹوٹے ہوئے تاروں کی قسم
اک نئی انجمنِ شمس و قمر پیدا کر

دل پژمردہ، محبت کو نہیں ہے درکار
اس گلستاں کے لئے اک گلِ تر پیدا کر

کیا ہوا گر تری راتیں رہیں بیگانۂ خواب
حسن بیدار ہو جس سے وہ سحر پیدا کر

جاوداں جن سے بنے انجمنِ نیم شبی
وہ ستارے کبھی اے دیدۂ تر پیدا کر

درِ جاناں پہ اگر حسرتِ سجدہ ہے تجھے
عرش جس کے لئے جھک جائے وہ سر پیدا کر

کوئی منزل جسے بیزارِ سفر کر نہ سکے
وہ تمنا، وہ تقاضائے سفر پیدا کر

منتظر جن کے لئے دیر سے ہے دامنِ دوست
دل کے ٹکڑوں سے وہی لعل و گہر پیدا کر

عالمِ وعدۂ فردا جو ہے تو اے روش
اک نیا سلسلۂ شام و سحر پیدا کر

تبصرے

مانڈو | مترجمہ مرزا محمد بشیر صاحب ایم۔اے۔ تقطیع کلاں ۱۳۲ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر قیمت غیر مجلد عار پتہ انجمن ترقی اردو دہلی۔

مانڈو جو عام طور پر مالوہ کے نام سے مشہور ہے ہندوستان کی ایک قدیم ترین بستی ہے جس کے ابتدائی حالات وواقعات پر زمانہ قبل از تاریخ کی جہالت دنا واقفیت کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں لیکن اب محکمہ آثار قدیمہ کے ذریعہ تیرہویں صدی عیسوی تک کی تاریخ معلوم ہوگئی ہے اور فی الحقیقت مانڈو کا تیرہویں صدی سے اٹھارویں صدی ہی تک کا وہ درخشاں دور ہے جس نے اسے تاریخی اہمیت بخشی ہے اور مسلمان سلاطین ہی کی وہ پرشوکت پائیدار اور حسین عمارتیں ہیں جنھوں نے ہندوستان کے تاریخی شہروں میں اسے ایک لازوال اہمیت عطا کی ہے۔ انہی وجوہ سے جناب غلام یزدانی صاحب ایم اے ناظم محکمہ آثار قدیمہ حیدرآباد نے مانڈو سنگر اس کو فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور مانڈو دی سٹی آف جوائے کے نام سے ایک رپورٹ انگریزی میں مرتب کی جو ریاست دھار کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ مرزا محمد بشیر صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے، کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں مانڈو کی جغرافی اور طبعی کیفیات کا بہت مختصر بیان ہے۔ دوسرے باب میں فیروز تغلق کے عہد سے اورنگ زیب تک کے ان سلاطین کا تذکرہ ہے جنھوں نے مانڈو کو دارالحکومت قرار دیا تھا۔ یا وہ ان کے حدود سلطنت میں شامل رہا اور یا پھر کسی نہ کسی طرح انھیں مانڈو سے دلچسپی رہی تھی۔ تیسرے باب میں قدیم عمارات کا تذکرہ ہے۔ یہ باب بہت طویل ہے اور کتاب کے دو ثلث حصے پر پھیلا ہوا ہے لیکن بہت اہم اور مفید ہے۔ عمارات کا تذکرہ جائے وقوع کے لحاظ سے ترتیب وار ہے ہر عمارت کے ذیل میں اس کی فنی خصوصیات نیز اس کے عہد بہ عہد کے تغیرات اور موجودہ حالت پر وضاحت کے ساتھ کلام کیا ہے زیر نظر کتاب گو مانڈو کی مکمل تاریخ نہیں ہے تاہم کافی مستند معلومات فراہم کردی گئی ہیں جو آئندہ مورخین کیلئے ماخذ کا کام دے سکیں گی۔

دیوانِ بہرام | مرتبہ جناب مسلم ضیائی صاحب ایم۔اے۔ تقطیع کلاں، ضخامت ۱۲۷ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر۔ قیمت غیر مجلد عہ۔ پتہ انجمن ترقی اردو دہلی۔

امیر خسرو کے عہد سے دورِ حاضر تک اردو شاعری میں جتنی اصلاحات ہوئی ہیں اور موجودہ عہد میں اردو شاعری کی جو ترقی یافتہ شکل ہمارے سامنے ہے بے شبہ اس میں ہندوستان کی تقریباً تمام ہی قوموں کا حصہ ہے۔

انہی متحدہ کوششوں کی ایک کڑی ایک پارسی شاعر بہرام جی جاماسپ جی دستور کا مجموعۂ کلام دیوان بہرام ہے جسکی ترتیب وتہذیب جناب مسلم ضیائی کی رہینِ احسان ہے ابتدا میں مرتب کی جانب سے ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں بہرام جی کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز شعر وشاعری کا بہت مختصر سا تذکرہ ہے۔ بہرام جی نہ صرف اردو کے شاعر تھے بلکہ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے ان کا اردو کلام گو زیادہ بلند نہیں ہے لیکن اپنی قدامت کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے طبع آزمائی کا میدان غزل گوئی ہے جو اس دور کی مقبول ترین صنف تھی۔

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) **محسنِ خاص**:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم اڑھائی سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) **محسنین**:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔

ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی ۔نیز مکتبۂ برہان کی اہم مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ" برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) **معاونین**:۔ جو حضرات بارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) **احبّا**:۔ چھ روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) برہان کی ضخامت کم سے کم اسّی صفحے ماہوار اور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

(۶) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۷) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ برہان قرول باغ دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
عتیق الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں غلامی کے ہر ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی اور تحقیق سے کی گئی ہے قیمت ع

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام

اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہر آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متصوفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے قیمت عہ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں کے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریریں جنھیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے مع مبسوط مقدمہ از مترجم قیمت ع

اسلام کا اقتصادی نظام

ہماری زبان میں پہلی عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کرکے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے۔ طبع ثانی میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں۔ ان اضافوں کے بعد کتاب کی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب سنہ ۴۲ء کے سیٹ میں بھی دی گئی ہے۔ قیمت عہ

سنہ ۱۹۴۰ء

نبی عربی صلعم

تاریخِ ملت کا حصۂ اول جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرتِ سرورِ کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہمِ قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں اور قرآنِ پاک کا صحیح منشا معلوم کرنے کیلئے شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ احادیث کی تدوین کس طرح اور کب ہوئی، یہ کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ قیمت عہ

غلامانِ اسلام

پچھتر سے زیادہ ان صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہاء و محدثین اور اربابِ کشف و کرامات کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل کے بیان پر پہلی عظیم الشان کتاب، جس کے پڑھنے سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ قیمت عہ

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کی روشنی میں اصولِ اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواعِ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے ضابطہ ہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح کی گئی ہے۔ قیمت عہ

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی، قرول باغ

بُرہان

جلد سیزدہم   شمارہ (۳)

رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۴ء

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

واحسرتا! ابھی برہان کے صفحات پر مولانا محمد الیاس صاحب کاندہلوی کے ماتم میں ہمارے قلم کے آنسو خشک بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ ۲۴ راگست کی صبح کو اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہماری بزم علم و عمل کا ایک اور صدر نشین ہماری محفل سے رخصت ہوگیا۔ یعنی مولانا عبید اللہ سندھی نے چندروز کی علالت کے بعد پنجاب کے ایک مقام دینپور ریاست بھاولپور میں ۲۳ راگست کو وفات پائی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم ۱۰ رمارچ ۱۸۷۳ء کو پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ایک سکھ گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں خود اپنے غور و خوض اور تحقیق و تلاش کے بعد اسلام قبول کیا۔ پچیس سال کی عمر میں علم دین کی طلب کا شوق انھیں کشاں کشاں دیوبند لے آیا۔ جہاں آپ نے چھ سات سال قیام کرکے درس نظامی کی تکمیل کی اور اس سے فارغ ہوکر سندھ چلے گئے۔ یہاں کئی سال تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ایک مدت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو پھر دیوبند بلا بھیجا۔ جہاں وہ اپنے شفیق استاد کی نگرانی میں مختلف اہم اور ضروری کام انجام دیتے رہے۔ اس سلسلہ میں آپ حضرت الاستاذ کے حکم سے ۱۹۱۵ء میں کابل گئے اور یہاں افغانستان کے انقلاب میں براہِ راست حصہ لیا۔ سات سال تک اس ملک میں قیام فرمانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں آپ ماسکو آئے جہاں انقلاب کے ہاتھوں ایک نئی دنیا تعمیر ہورہی تھی۔ زارکا روس ختم ہوچکا تھا اور لینن کے فیض دم سے سوویٹ روس کے خاکی پتلہ میں جان پڑرہی تھی۔ مولانا مرحوم نے ان تمام حالات کا جائزہ بڑے غور و خوض سے لیا اور پھر ایک سال قیام کرنے کے بعد آپ ٹرکی تشریف لے گئے یہ وہ زمانہ تھا کہ یہاں خلافت کے نسخ کا اعلان ہوچکا تھا۔ اسلامی قوانین کے بجائے سوئٹزرلینڈ کا قانون نافذ کیا جارہا تھا۔ شیخ اسلام کو ترکی سے رخصت کردیا گیا تھا۔ عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کو رائج کیا جارہا تھا۔ غرض ہر پرانا نقش ایک ایک کرکے مٹایا جارہا تھا اور نوجوان ٹرکی کے نقشہ میں نئے نئے رنگ ابھر رہے تھے۔ مولانا نے تین ساڑھے تین سال تک یہاں مقیم رہ کر ان تمام عوامل و محرکات کا بغور مطالعہ کیا جو ٹرکی میں اس عظیم الشان انقلاب کا سبب تھے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ مولانا کے دماغ پر اس مطالعہ کا اثر اخیر تک بہت گہرا رہا۔

ساڑھے تین سال کے قیام کے بعد آپ ٹرکی سے حجاز آئے۔ جہاں آپ نے بارہ تیرہ سال

قیام کیا۔ لیکن اس مدت میں سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو کر ہمہ تن درس و تدریس اور مطالعہ و تحقیق میں مصروف رہے۔ یہاں اسلام کے مرکز میں یکسوئی کے ساتھ بیٹھکر مولانا نے اپنے مطالعۂ تحقیق و تفتیش۔ اور طویل تجربات و مشاہدات کی روشنی میں خاص ہندوستانی مسلمانوں کے استخلاص کے لئے ایک منظم لائحہ عمل مرتب کیا اور آخر کار حکومتِ ہند کے شرائط کو قبول کرکے آپ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان تشریف لے آئے۔

دنیا میں بڑی شخصیتیں ہمیشہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بعض تو وہ ہوتے ہیں جو صرف دل کی اچھائیوں کے مالک ہوتے ہیں اور بعضوں میں دماغ کی خوبیاں تو سب جمع ہوتی ہیں لیکن دل کی خوبیوں سے ان کو کوئی حصہ نہیں ملا ہوتا۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو بیک وقت دل اور دماغ دونوں کے قویٰ اور ملکات کے لحاظ سے ایک عظیم شخصیت کے مالک ہوں۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اسی تیسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے ایک طرف وہ علوم دینیہ و اسلامیہ کے بڑے عالم اور سیاسیات کے بلند پایہ مفکر تھے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت شاہ عبد العزیزؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمہم اللہ کی کتابوں پر عبور تام حاصل تھا۔ انداز فکر تقلیدی کے بجائے سراسر اجتہادی تھا۔ اور دوسری جانب وہ اللہ کے راستہ کے ایک ایسے سپاہی تھے جس نے زندگی کا لمحہ لمحہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ایک جذبہ تھا جو ہر آن انھیں بےچین رکھتا تھا۔ ایک تڑپ تھی جوان میں ۷۰ سے زیادہ کی عمر میں بھی بچوں کی طرح ہر وقت رواں دواں اور متحرک رکھتی تھی۔ عمدہ کھانا پینا۔ خواب و راحت شہرت و وجاہت، عشرت و آسائش، یہ تمام چیزیں ایسی تھیں کہ مولانا کے حاشیۂ تصور میں بھی ان کا کہیں دھندلا سا نقش نہیں ہوگا۔ وہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے اپنا ایک مخصوص پیغام رکھتے تھے جو ان کے عمر بھر کے غور و فکر اور عمیق مشاہدات و تجربات کا حاصل تھا

. . . . مولانا ہمارے

قافلے کے ایک ایسے میر کارواں تھے جو بڑھاپے میں نوجوانوں سے زیادہ جوش و خروش، چستی اور سرگرمی رکھتا تھا اور منزل مقصود کی طرف جس کے شوق جادہ پیمائی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ وہ راستہ کے نشیب و فراز کی ذرا پروانہ کرتا اور جس راہ کو حق سمجھتا اس پر اس تیز گامی سے چلتا تھا کہ قافلہ کے اچھے اچھے باہمت لوگوں کا شوق پیروی بھی ان کے عذر آبلہ پائی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی تمام تر جہد و مشقت۔ ریاضت و محنت اور مجاہدانہ سعی و کوشش میں بسر ہوئی لیکن اس کے باوجود اس کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی تعداد ہمیشہ محدود رہی۔ بہرحال حضرت شیخ الہندؒ کے فیض صحبت نے مولانا کے دل میں یقین کامل کی جو شمع روشن کردی تھی وہ آخر دم واپسیں تک پوری آب و تاب کے ساتھ منور رہی۔

اچھا! اے جانیوالے جا! تجھپر ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی طرف سے ہزار در ہزار سلام و رحمت، تونے اپنا سب کچھ قربان کرکے عمر بھر اسلام کی سربلندی کے لئے جد و جہد کی۔ اب یوم الدین کا مالک تجھکو اپنی بیش از بیش رحمتوں سے نوازے اور اپنے دامانِ مغفرت میں چھپالے۔ آمین۔

اقبال اور رومی

از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ لکچرر پنجاب یونیورسٹی لاہور

اقبال نے رومی سے کیا کچھ لیا؟ ـــــ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں صرف اس قدر سمجھنا ہوگا کہ رومی اور اقبال کے درمیان فکری طور پر کن کن باتوں میں مماثلت موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی جاننا ہوگا کہ اس فکری مماثلت کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کی نفسی ساخت اور ماحول میں کس حد تک یکرنگی پائی جاتی ہے؟ میرے خیال میں ان دو سوالات کا جواب میرے آج کے موضوع کا ضروری پہلو ہے۔

اقبال نے رومی سے جو جو خیالات لئے۔ ان کے تذکرے سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ خاص افکار، رومی کے علاوہ کہیں اور موجود نہیں۔ یا اقبال نے رومی کے سوا کسی اور مآخذ سے فیض حاصل ہی نہیں کیا۔ ایسا سمجھنا یقیناً غلط ہوگا کیونکہ اقبال و رومی کے بیشتر مشترکہ خیالات علیحدہ علیحدہ صورت میں بعض دوسرے صوفیوں اور فلسفیوں کے ہاں بھی ملتے ہیں کچھ فرق ہے تو صرف اسقدر کہ اقبال اور رومی اپنے مجموعی نظامِ فکر کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بعد قریب ہیں اور استفادہ اور کسبِ فیض کے لحاظ سے مجموعی طور پر اقبال نے رومی سے اس درجہ اثر قبول کیا ہے کہ ہم اقبال اور رومی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔

اقبال کے ماحول کے متعلق صرف اس قدر بتانا کافی ہے کہ جب اقبال نے فکر کی دنیا میں آنکھ کھولی۔ اور کائنات اور اس کے مسائل پر نظر ڈالی۔ تو اس وقت مغربی حکمت اور سائنس کا مادہ پرستانہ نظریہ علم و عمل کے ہر ہر پہلو پر غالب آچکا تھا۔ طبعی علوم کے انکشافات اور سائنس کی ایجادات کے زیر اثر مذہب، اخلاق اور روحانیت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ کانٹ۔ سپنسر اور مِل کے "این جہانی" تصورات اور ہیگل کی جدلی منطق نے مابعد الموت اور اس کے متعلقہ خیالات کے بارے میں شکوک پیدا کرتے ہوئے الحاد، دہریت اور حیوانیت کے لئے ذہنِ انسانی کے دروازے کھول دئے تھے، اس پر ڈارون کے نظریۂ ارتقا، فرائڈ کے نظریۂ جنس اور مارکس کے نظریۂ اقتصاد نے مذہب اور قدیم تمدن کا رہا سہا وقار بھی ختم کر دیا۔ اور چندے یہ نظر آنے لگا کہ انسانی زندگی کا سارا

نظام درہم برہم ہونے کو ہے۔ اور اس دنیائے کون و فساد میں خود غرضی، جدل اور ہوا و ہوس نے خلوص، ایمانداری اور صلح و آشتی کی جگہ لے لی ہے۔ اس کے علاوہ کل کی ایجاد نے انسان کو گوشت، پوست اور ہڈیوں کا بے روح مجموعہ قرار دے کر بدبخت انسان کو روٹی اور غذا تک سے محروم کرنے کی ٹھان لی ہے۔ زندگی مشکل تو تھی مرنا بھی مشکل ہوگیا۔ دنیا جیتے جی جہنم کی آگ میں جلنے لگی۔

ضعفِ ایمان اور بے اطمینانی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اقبال کی حیرت زدہ آنکھوں نے مغربی علوم پر نظر ڈالی۔ اور چاہا کہ اطمینان اور سکون کی کوئی ایسی شعاع دکھائی دے جس سے دل کے اندھیرے اور ظلمت کو دور کیا جاسکے۔ مگر فلسفہ و دانش کے ان مغربی ضیا خانوں سے اُسے وہ نور کی کرن نہ ملی جس کی اُسے تلاش تھی۔ ان حالات میں اقبال نے محسوس کیا کہ مغربی تہذیب سوزِ یقین سے محروم ہے۔ اہلِ مغرب کی حیاتِ اجتماعی تاجرانہ، عیارانہ اور بے سوز ہے۔ عالمِ انسانیت نظامِ مغربی کے استیلا اور اس کے اس جہانی تصور سے جگر چاک ہے۔ اس کے امن کی قبا پارہ پارہ اور اس کے سکون کا خرقہ تار تار ہے۔ اور اسے یقین ہوگیا کہ یورپ کی تہذیب ہی انسانی تہذیب کے صالح اور خوشگوار ارتقار کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس کو ایمان اور یقین کی مدد سے راستے سے ہٹانا بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا فرض ہے۔ اقبال نے اس نصب العین کی طرف بار بار اپنی شاعری اور نثری تصانیف میں اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے مقالاتِ مدراس میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس وقت دنیا کو سب سے زیادہ جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کو پھر سے روحانیت سے روشناس کرایا جائے۔ اور اس بات کا یقین پیدا کیا جائے کہ ذاتِ خداوندی موجود ہے۔ اور ان ستاروں کے پیچھے کئی "عوالم" اور بھی ہیں جن کا ادراک عقل کی ظاہر بین آنکھوں سے نہیں بلکہ کشف اور تجلی کی روشنی سے ہوسکتا ہے۔

اس دشوار اور عظیم الشان کام کی تکمیل کے لئے اقبال نے مولانا جلال الدین رومیؒ کو اپنا رہنما بنایا۔ وہ اقبال کے مرشد ہی نہیں بلکہ محبوب بھی تھے۔ اقبال کو رومی سے محض نطشے۔ برگسان اور کانٹ کی طرح کی فکری وابستگی ہی نہ تھی۔ بلکہ دونوں کے درمیان روحانی اور عاشقانہ رشتہ نظر آتا ہے۔ اسرارِ خودی سے لے کر ارمغانِ حجاز تک رومی ہی اقبال کے خضرِ راہ بنتے ہیں۔ وہی جاوید نامے کے زندہ رود کو آسمانوں کی طلسماتی فضا میں لے جاتے ہیں۔ اور ملاءِ اعلیٰ کے مکینوں سے ان کا تعارف کراتے ہیں اور جب یہ مریدِ ہندی مقصدِ زندگی کی تکمیل کر چکنے کے بعد اقوامِ مشرق کو آخری پیغام

دیتا ہے۔ تو اس وقت بھی یہی رومی ہاتف بن کر مژدۂ انقلاب سناتے ہیں۔ رومی اقبال کی نظر میں کلیم بھی ہیں اور حکیم بھی۔ مجدد بھی ہیں اور مصلح بھی۔ شریعت کے علم بردار بھی ہیں اور طریقت کے اسرار کشا بھی۔ غرض سب کچھ جن کی ہدایت سے عصرِ حاضر اپنی گم گشتہ روشنی اور تابانی کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔ اقبال کے اپنے الفاظ ہیں:۔

علاجِ آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن — اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحون

گستہ تار ہے تری خودی کا ساز ابتک — کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز ابتک۔

اقبال نے اپنے مرشد رومی سے بڑے بڑے افکار کے بارے میں جو استفادہ کیا۔ اس کے ذکر سے پہلے یہ سن لینا چاہیے کہ اقبال کے لئے رومی کی داستانِ حیات بھی بے حد جنوں انگیز اور ولولہ خیز ثابت ہوئی۔ علی الخصوص اس کا وہ باب جس کا تعلق شمس تبریزؒ کے عشق سے ہے۔ مولانا رومؒ کی زندگی کا نمایاں امتیازی وصف ان کا جذبۂ عشق، دردمندی اور سوز و گداز تھا۔ مولانا رومؒ کو شمس تبریزؒ سے مجنونانہ محبت تھی۔ اور اس حد تک تھی کہ ایک پل ان کے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

کہتے ہیں کہ جب ایک دفعہ شمسؒ کسی بات پر ناراض ہو کر قونیہ سے تبریز چلے گئے تو مولانا پر کھانا پینا حرام ہو گیا۔ آخر خود تبریز گئے اور منا کر لائے۔ شمس تبریزؒ نے مولانا کی زندگی میں انقلاب پیدا کیا۔ وہ پہلے ایک خشک اصولی اور منطقی تھے۔ لیکن شمس تبریزؒ کی ملاقات نے انھیں روحانی اور باطنی کمالات سے آگاہ کیا۔ بقول علامہ شبلیؒ "شمسؒ کی ملاقات سے پہلے مولانا روم کے شاعرانہ جذبات اسی طرح ان کی طبیعت میں پنہاں تھے۔ جس طرح پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ شمسؒ کی جدائی گویا چقماق تھی اور شرارے اُن کی پرجوش غزلیں"۔ رومی نے بہت سی نظمیں شمس تبریزؒ کے فراق میں لکھیں جن میں انتہائی درد اور بے قراری پائی جاتی ہے۔ مثلاً وہ نظم جس کے تین اشعار یہ ہیں۔

ساربانا! بار بکشا ز اشتران — شہر تبریز است و کوئے دلبران
فرِ فردوس است ایں پالیز را — شعشعۂ عرش است ایں تبریز را
ہر زمانے فوجِ روحِ انگیز جاں — از فرازِ عرش بر تبریزیاں

جب شمس تبریزؒ کا انتقال ہوا تو مولانا پر قیامت گذر گئی۔ مریدانِ با اخلاص اپنے

مرشد کے غم میں ہلاک اور خود مولانا صحرائے جنون میں آوارہ و پریشاں اور اصل محبت بھرے دل کو کسی اور محبوب کی تلاش تھی۔ اس لئے کہ بے کیمیائے مستی تبدیلِ غم محال است۔

آخر ایک اور بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ جن کا نام صلاح الدین زرکوب تھا۔ ان کی صحبت میں مولانا کو تسلی ملی۔ چنانچہ دیوان میں ان کی شان میں بھی غزلیں موجود ہیں۔ جن میں سے ایک غزل کے تین اشعار یہ ہیں:۔

مطربا اسرارِ ما را باز گو — قصہ ہائے جاں خزا را باز گو

ما دہاں بر بستہ ایم از ذکر او — تو حدیثِ دلکشا را باز گو

چوں صلاح الدین صلاح جان ماست — آں صلاح جانہا را باز گو

نو سال کے بعد صلاح الدین زرکوب کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور رومی کی جانِ دردمند کو پھر وہی قضیہ پیش آیا۔ یعنی وہی جنون و بے قراری با۔ آخر ان کے دوست اور مرید حسام الدین چلپی ان کے لئے باعثِ تسلی بنے۔ یہی وہ بزرگ ہیں جن کا ذکر مثنوی میں بار بار آتا ہے۔ غرض رومی کی زندگی میں دردمندی اور عشق کی جو فراوانی ہے اس سے کون متاثر نہ ہوگا؟۔ رومی کی اس مجذوبیت سے اقبال بھی بے حد متاثر ہوئے۔

دوسری چیز جس نے اقبال کو اپنے مرشد کا گرویدہ بنایا وہ عقل پرستی کے خلاف رومی کا جہاد اور جذبۂ عشق و ایمان کی طرف ان کی پرزور دعوت ہے۔ اسلام میں عقل پرستی کا مرض فلسفۂ یونان کے ذریعہ پیدا ہوا۔ سقراط اور افلاطون کے "این جہانی" خیالات نے حکمائے اسلام کو اسقدر متاثر کیا کہ ایک عرصے تک خود قرآن پر فلسفۂ یونان کی روشنی میں نظر ڈالی جاتی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفہ کے عام ہوجانے سے فکر اور دماغ کے آزادانہ عمل کو ترقی ہوئی لیکن اس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ قرآن نے مشاہدے، تجربے اور زندگی میں ہر ساعت تغیر اور انقلاب کی اہمیت پر جتنا زور دیا تھا وہ کمزور ہوگیا۔ اسلام نے روح اور ایمان کو ساری زندگی کی بنیاد قرار دیا تھا اور اس اصول کی حفاظت کے ساتھ ساتھ تسخیر کائنات کا جو سبق سکھایا تھا وہ سب کچھ سقراط کے

علمی اور مجرد حقایق کے غور و فکر میں گم ہو کر رہ گیا۔ ان عقل پرستوں کی تائید معتزلہ نے کی۔ جس سے خود مذہب اور خدا کی حقیقت معرض بحث میں آگئی۔ عقل پرستی کی اس یورش کا مقابلہ اشعریوں نے کیا۔ لیکن انھوں نے عقل انسانی کے کمالات سے ہی انکار کرنا شروع کر دیا۔ رومی سے پہلے امام غزالیؒ نے عقل پرستی کا کامیاب مقابلہ کیا۔ اور تصوف کو دین کے نظام میں داخل کرتے ہوئے مذہب کی وجدانی بنیاد کو مستحکم کیا۔ لیکن غزالی کی کڑی اور سخت تنظیم سے فکر آزاد اور تخلیق کی قوتوں کو بہت نقصان پہنچا۔ با ایں ہمہ غزالی استدلال اور منطقی قیاس کے یکسر مخالف نہ تھے۔ مگر اس کے برعکس انھیں صوفیوں کی زندگی کے بعض پہلوؤں سے کچھ رغبت نہ تھی۔ حکمتِ غزالی کی اسی خصوصیت کی وجہ سے غزالی اقبال کے محبوب حکما میں سے نہیں ہیں۔

رومی نے اس عقل پرستی کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ اور اگرچہ غزالیؒ اور دوسرے متکلمین عقل پرستوں کو کئی میدانوں میں شکست دے چکے تھے۔ لیکن چونکہ علم کلام کی بنیاد بھی بیشتر استدلال اور عقلی قیاس پر تھی۔ اس لئے متکلمین سے عقل پرستی کا کامیاب دفعیہ نہ ہو سکا۔ رومی عقل جزوی کے سرے سے مخالف ہیں وہ عقل کی متعدد اقسام میں سے صرف عقل عقل، عقل کل اور عقل ایمانی کے قائل ہیں۔ باقی سارے نظام کے منکر اور اس سے بیزار ۱۔ ان کے نزدیک عقل جزوی کی رسائی اصل حقیقت تک نہیں ہو سکتی کیونکہ عقل جزوی سراپا، وہم ظن اور شک میں ڈوبا ہوا ہے۔ عقل جزوی انتشار، بدگمانی خود غرضی اور نفسانیت کا مورث ہے۔ مگر جذبۂ ایمان، جمعیت، اطمینان اور محبت کا خالق۔ رومی استدلالی اور عقلی کیفیتوں پر وجدان اور جذبے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عرفان اور ایمان کا مرکز دل ہے نہ کہ دماغ۔ ان کے خیال میں زیرکی ابلیس کا خاصہ ہے اور عشق آدم کا زیور۔ ان کے نزدیک اہلِ تن کے علوم بے حقیقت مگر اہلِ دل کا علم یار مونس ہے۔ مجذوبیت کے بعد رومی کے فکر کا یہی پہلو اقبال کے لئے سب سے زیادہ جاذب توجہ ثابت ہوا۔ اور سب سے زیادہ انہی افکار کے بارے میں اقبال نے رومی کی خوشہ چینی کی ہے۔

تیسری چیز جسے ہم فکرِ رومی میں بہت نمایاں پاتے ہیں وہ رومی کا نظریۂ فقر ہے۔ اسلام میں تصوف کے عناصر ابتدا سے ہی موجود چلے آتے ہیں۔ اور گو کہ ابتدائی زمانہ کے صوفی بہت ہی برگزیدہ لوگ تھے۔ اور ان کی تعلیم کسی طرح مذہب اور عملی زندگی کے متخالف نہ تھی مگر رفتہ رفتہ نوافلاطونی خیالات اور بعض دوسرے نظام ہائے فکر کی آمیزش سے، تصوف میں دنیا سے

بیزاری کا عنصر بطور ایک سیاسی عقیدے کے شامل ہوگیا۔ جس سے توکل، تقدیر، فنا اور ترک دنیا کی طرح کے مسائل کی غلط تعبیر پیدا ہوئی۔ یہ فلسفۂ زندگی جس قدر جذبۂ حیات کا قاتل ہے۔ اسی قدر اسلام کی عملی تعلیم کے منافی بھی ہے۔ مولانا جلال الدین رومی نے خود صوفی ہونے کے باوجود اس طرز زندگی بلکہ اس نظریۂ زندگی کے خلاف پرزور آواز بلند کی۔ اور توکل، جبر، کسب اور دین و دنیا کے باہمی تعلق پر پیہم اور مسلسل، نہایت موثر اور دلنشین پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

افسوس ہے کہ رومی کی یہ تعلیم آہستہ آہستہ پھر ابن عربی کی سوفسطائیت میں ڈوب کر رہ گئی اور اگرچہ مثنوی رومی کا مطالعہ صدیوں سے جاری تھا۔ اور اب تک ہے۔ مگر رومی کے خیالات کی روح رومی کی وفات کے بعد غائب ہوگئی، یہ شرف اور خوش بختی اقبال کے نصیب میں تھی کہ اس کی بدولت رومی کے فکر کو دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔ اور پھر سے اس راہبانہ تصوف کے خلاف ردِ عمل ہوا۔ جس کا سب سے بڑا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی ترکِ زندگی کا نام ہے۔

اقبال نے رومی فقرِ غیور کو اپنی جدید اجتماعی زندگی کی ضرورتوں کے لئے بہترین کیمیائے سعادت پایا۔ چنانچہ سلطانی اور خدمت گری، سروری اور چاکری دونوں حالتوں میں ان کے نزدیک یہ فقر توازن اور اعتدال کا ترازوئے مستقیم بن سکتا ہے۔

اِن عناصر سہ گانہ کے بعد میں مختصراً رومی اور اقبال کے (Idealism.) یعنی نوعِ آدم کے ممکن عروج اور "مردِ کامل" کے متعلق دونوں کے مشترکہ خیالات کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ اقبال آدم خاکی کے ارتقائی عروج کے قائل ہیں۔ رومی بھی انسان کو ارتقائی مخلوق قرار دیتے ہیں۔ اقبال اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ آخرکار انسان ماہِ کامل بن کر رہیگا اور خاکیوں کا فروغ نوریوں سے زیادہ ہوجائے گا۔ نہیں نہیں اس سے بھی آگے گذر کر خدائی فضا کے حریم قدس میں داخل ہوجائے گا بلکہ اپنی اصل سے جا ملے گا۔ رومی کے نزدیک روح کو بقائے دائمی حاصل ہے۔ پیکرِ خاکی کی شکست انسانی تکمیل کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی یہی اقبال کے خیالات ہیں۔ رومی موت کو زندگی کا دروازہ خیال کرتے ہیں۔ اقبال بھی موت کو نئی زندگی کی صبح قرار دیتے ہیں۔ رومی انسان کے شخصی بقار کو ممکن خیال کرتے ہیں۔ اقبال بھی یہی استدلال کرتے ہیں۔

غرض یہ اور اس قسم کے بیسیوں مسائل ہیں جو اقبال اور رومی میں مشترک ہیں۔ جن کی پختگی کے لئے ممکن ہے کہ اقبال کے سامنے بعض دوسرے ماخذ بھی ہوں لیکن مجموعی نظام فکر کے

اعتبار سے اقبال نے رومی ہی کے سرچشمۂ فیض سے استفادہ کیا ہے۔

اقبال اور رومی کی مماثلتوں کے اس تذکرے کے بعد کچھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے بعض اختلافی پہلوؤں کا تذکرہ بھی کیا جائے۔ میرے خیال میں اقبال اور رومی کے درمیان سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اقبال کا نقطۂ نظر اپنے دعوے اور تعلیم کے برعکس، محض علمی اور نظری ہے یعنی رومی کے نزدیک جو بات حق الیقین کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال کے نزدیک وہ زیادہ سے زیادہ علم الیقین کی سطح تک آسکتی ہے۔ رومی اور اقبال کی عملی زندگیوں میں جو فرق نظر آتا ہے۔ وہی فرق ان دونوں کے نقطۂ نظر میں بھی ہے۔ اقبال کو جو شکایت رازی اور غزالی سے ہے وہی شکایت ہم کمتر درجے پر اقبال سے کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال سارے دعوے کے باوجود استیلاء، جوش، قوت اور تخلیق کا شاعر ہے۔ جس کے غلو میں بعض اوقات اس کی روحانیت محض سایہ اور عکس بن کر رہ جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب بڑی چیز ہے۔ مگر اسقدر نہیں جس قدر جنگ و پیکار اور خودی کی نمود۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے ابلیس کو بعض اوقات یزداں سے کاندھا ملاتے اور چشمک زنی کرتے دیکھتے ہیں۔ اقبال کا جذباتی اور فکری پہلو مضبوط ہے مگر رومی جذباتی اور جمالیاتی کیفیتوں کے مالکِ کل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رومی کے نَے نامے کے مقابلہ میں اقبال کے پختہ کلام میں ایک بند بھی ایسا موجود نہیں جو رومی کی جمالی کیفیتوں کی برابری کر سکے۔ اقبال کی خودی کا تصور انفرادی اور اجتماعی ہے مگر رومی کے نزدیک خودی کا مفہوم تصوف کے عام معانی کے قریب قریب ہے۔ میں نے اس موقع پر رومی اور اقبال کے جو اختلافات نمایاں کئے ہیں۔ ان سے مقصود صرف اسی قدر ہے کہ اقبال فکرِ رومی کے سمندر کا شناور ہونے کے باوجود اپنے ماحول کے مرعوب کن تصورات سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکے۔ کیونکہ زندگی اپنے حوالی اور گرد و پیش سے کلیۃً منقطع نہیں ہو سکتی۔ یہ حضرت اقبال کے روحانی کمالات کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے شک اور ضعفِ ایمان کی اس خوفناک فضا سے نکل کر آج سے سات سو سال پہلے کی ہواؤں میں سانس لینے کی کوشش کی اور انسانیت کی تکمیل کے لئے ماضی کو حال کے ساتھ پیوند دے کر مستقبل کی دیواریں کھڑی کر دیں۔

میں خیال کرتا ہوں کہ رومی کی ایمانی حکمت کے سمندر میں ابھی بے شمار موتی موجود ہیں جن کے حصول کے لئے غواصی کا طریقہ رومی کے مرید مگر ہمارے مرشد اقبال نے ہمیں سکھا دیا ہے۔

مآخذ

(۱) اقبال کے منظوم کلام کے علاوہ Six Lectures.

(۲) Dr Abdul Hakim Metaphysics of Rumi.

(۳) مضمون۔ اقبال رومی ــــــ اور نٹشے

(۴) عبدالمالک آروی ــــــ اقبال کی شاعری۔

(۵) میر ولی اللہ کا منتخب مثنوی

(۶) قاضی تلمذ حسین۔ مرآۃ المثنوی

(۷) شبلی۔ سوانح مولانا روم۔

امریکہ میں مشرقی علوم کی اشاعت

ازجناب مولوی حافظ محمد رشید احمد صاحب ارشد بی اے

(۲)

مستشرقین کا تبحر علمی یہ مستشرقین عربی لٹریچر کے زبردست ماہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ عربی زبان کو مستقل حیثیت سے مطالعہ نہیں کرتے ہیں بلکہ سامی زبانوں کی ایک شاخ کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں اور یہ لوگ کسی شخص کو عربی زبان میں اس وقت تک ماہر نہیں سمجھتے۔ جب تک وہ دوسری سامی زبانوں کا ماہر نہ ہو۔ اسی وجہ سے ان کی گفتگوؤں اور تقریروں میں کسی مشرقی عالم کا نام سننے میں نہیں آیا۔ اور نہ وہ ان میں سے کسی کا نام حوالۃً پیش کرتے ہیں۔ بلکہ یہ لوگ اپنی تالیفات میں بھی کسی مشرقی فاضل کی تصانیف کا اقتباس درج کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ گویا اس لحاظ سے وہ یورپین مستشرقین کے ساتھ ایک علیحدہ "عالم عربی" میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس میں کسی مشرقی عالم کا تعلق نہیں ہے۔

یہ مستشرقین عربی زبان کے کسی طالب علم کو سامی زبان میں اسوقت تک ڈگری نہیں دیتے جب تک کم ازکم وہ سریانی اور عبرانی کا ماہر نہ ہو۔ جب میں نے کولمبیا یونیورسٹی سے استعفار دیا تھا۔ اس وقت میرے دو یا تین شامی دوستوں نے اس بات کی خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ان کے نام یونیورسٹی کے ارباب اقتدار کے پاس بھیجدوں تاکہ شعبہ علوم مشرقیہ میں معلم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوسکے مگر چونکہ مجھے ان کی ناکامی کا پورا یقین تھا اس لئے میں نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ ان کی قابلیت عربی زبان تک محدود تھی۔

کولمبیا کی علمی تحقیقات کولمبیا کے مشرقی شعبہ کے صدر ڈاکٹر رچرڈ غوتھل (R. Gothil) ہیں جنھوں نے جرمنی میں اور جامعہ ازہر کے ایک استاد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہاں ہر ایک طالب علم سے جو ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنا چاہتا ہے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کسی خاص مضمون پر کوئی کتاب تالیف کرے جس کے ذریعہ ریسرچ اور تحقیقات علمیہ کے جدید اصول کے مطابق اس کی قابلیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ ذیل میں ان میں سے چند ایسے طلبار کے نام اور ان کی تالیفات کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

جنھوں نے انگریزی زبان میں عربی لٹریچر پر محققانہ کتابیں تحریر کیں۔

(۱) تاریخ غزہ، از مایر۔ (Mayer.)

(۲) تاریخ صیدا ر - از اسلین۔ (Eiselin.)

(۳) تاریخ صور - از فلیمنگ۔ (Fleming)

(۴) آرام و اسرائیل - از کریلنگ۔ (Kreling.)

(۵) ترجمہ کتاب الفرق بین الفرق - از مسز سیلی۔ (Mrs. Seely)

(۶) سامی اصول کا اشتقاق - از مسٹر ہرو ٹز۔ (Hurwits)

علاوہ ازیں اور کئی مفید ادبی و تاریخی کتابیں ایسے طلبار نے تحریر کی ہیں۔

پنسلوانیا یونیورسٹی فلاڈلفیا میں سامی زبان کے پروفیسر موریس جسٹرو تھے جنھوں نے اشوری اور بابلی مذہب و تمدن سے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں، ان کی آخری تالیف "بغداد کے لوہے کے سکوں" پر تھی۔ آپ نے اپنی ایک کتاب میں صیہونی خیالات کا مضحکہ اڑایا ہے۔ کیوں کہ پروفیسر مذکور یہودی ہونے کے باوجود صیہونی تحریک کے مخالف تھے۔ اس یونیورسٹی میں اشوری، اور بابلی اشیا نیز خطوط مسیحی کے نمونوں کا ایک عمدہ عجائب خانہ ہے جس کا ثانی امریکہ میں اور کوئی نہیں۔

شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر جمیس برسٹڈ تعلیم دیتے ہیں۔ آپ نے سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء کے ایام سرما میں مصر، شام اور عراق کی سیاحت کی تھی۔ اب آپ مشرقی شعبہ کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر ایسا انتظام کر رہے ہیں۔ جس کا مقابلہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کوئی دوسری یونیورسٹی نہیں کر سکے گی۔ ان انتظامات کی تکمیل امریکہ کے مشہور کروڑپتی مسٹر راکفلر کی مالی امداد سے ہوگی۔ جامعہ شکاگو کے سابق چانسلر مشہور مستشرق مسٹر ہارپر ہیں جنھوں نے "قانون حمورابی" کو (جو قدیم بابل کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے) شائع کیا اور انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔

کیلے فورنیا یونیورسٹی میں پروفیسر پوپر قابلِ ذکر ہیں جو آج کل "تغری بردی" کی مشہور تاریخِ مصر کی اشاعت میں منہمک ہیں۔

ان یونیورسٹیوں کے مشرقی شعبوں میں عام طور پر طلبار کی تعداد کم ہوتی ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے مشرقی شعبے میں جو غالباً سب سے بڑا خیال کیا جاتا ہے طلبار کا سالانہ اوسط تیس ہے۔ ایسے طالب علم اکثر نوجوان مرد ہوتے ہیں۔ لیکن بعض نوجوان خواتین بھی شریک درس ہوتی ہیں۔

مذہبی مدارس | ولایات متحدہ امریکہ میں فلسفہ الہیات اور مذہبی تعلیم کے لئے ۲۳۔ اعلیٰ مدارس موجود ہیں۔ جن میں سے ایک کیتھولک کالج دار السلطنت واشنگٹن میں ہے۔ یہودیوں کے دو کالج نیویارک اور اوہیو میں قائم ہیں۔ اس قسم کے اکثر مدارس میں مذہبی اور مشنری تعلیم کے علاوہ مشرقی ممالک کے مذہب تاریخ اور ادبیات کا درس بھی داخلِ نصاب ہیں۔ ان مدارس میں سے اہم کالج ہارٹفورڈ کی مذہبی درسگاہ ہے۔ اس کی شہرت مشہور امریکن مستشرق مسٹر میکڈ انلڈ کی وجہ سے ہے جو مذہبِ اسلام کے زبردست عالم سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے بھی پروفیسر مذکور سے موسمِ خزاں کی ایک رات میں ملاقات کی تھی۔ اس وقت آپ اپنی لائبریری میں بیٹھے ہوئے مطالعۂ کتب میں منہمک تھے۔ آپ کی عمر اس وقت ستر برس کی تھی۔ ڈاڑھی سفید ہو گئی تھی۔ اور لب و لہجہ سکاٹ لینڈ کے باشندوں کی طرح تھا۔ کیونکہ آپ کی پیدائش امریکہ میں نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے ان سے موجودہ مشغلہ کے متعلق استفسار کیا تو آپ مجھے کتب خانہ کے ایک گوشہ میں لے گئے جہاں کتابوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ آپ نے بجلی کے لیمپ کے بٹن کو دبا کر روشنی کی تو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ انبار "الف لیلہ" کے مختلف اڈیشنوں اور تراجم کا مجموعہ تھا۔ اتنا بڑا مجموعہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ اس میں مصری مطبع یسوعی بیروت۔ مطبع ادبیہ بیروت اور دیگر مطابع کے اڈیشن اور فرنچ۔ انگریزی۔ جرمنی و دیگر زبانوں کے تراجم سب موجود تھے۔ مجھے یاد ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ الف لیلہ کے ہر ایک اڈیشن کا ایک ایک نسخہ ان کے پاس موجود ہے۔ بعد ازاں انھوں نے فرمایا کہ وہ آج کل الف لیلہ کے مؤلف یا مؤلفین کی شخصیتوں اور ان کے مقامات افسانہ کا بغور مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ مقصد قصوں کے طرزِ بیان، مواد اور اس کی ترتیب نیز دوسری ادبی کتابوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

پروفیسر مذکور کے پاس چند عربی اجزا و اوراق بھی پڑے ہوئے تھے جن میں ایک نصیری فاضل نے نصیری خیالات کی تشریح کی تھی۔ جب میں نے ان اوراق کو اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ پروفیسر مذکور نے اپنے قلم سے اس پر بہت سے نوٹ اور حواشی سرخ سیاہی سے لکھ رکھے تھے جس سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ صاحب موصوف نے ان اوراق کا ناقدانہ نظر سے مطالعہ کر رکھا ہے۔ جب میں ان کے پاس سے نکل کر آیا تو یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر یہ شخص مشرق میں سالہا سال تک صرف الف لیلہ کے مطالعہ میں منہمک نظر آتا تو سب لوگ یہی سمجھتے کہ وہ اپنی زندگی بیکار تباہ کر رہا ہے۔

دوسرے دن صبح کو میں نے ان کے رفیق ڈاکٹر ورل (Worrel.) سے ملاقات کی جو پہلے "امریکن سکول آف اورینٹل ریسرچ" کے منتظم تھے۔ ڈاکٹر موصوف شام و فلسطین کی عام بول چال کی زبان اور اس کے اشتقاق و انقلاب کی تاریخ مرتب فرما رہے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جو شخص اپنی تمام محنت اور وقت اس کام کے مطالعہ کے لئے صرف کرے اور اس موضوع کو فیلالوجی، اجتماعی تاریخی۔ غرضکہ تمام پہلوؤں سے پایۂ تکمیل کو پہنچائے تو تم سمجھ لو کہ اس نے عربی لٹریچر کی زبردست خدمت کی۔ ان کی اس گفتگو سے شام و مصر و عراق کے ان ادبار کی جماعت میرے ذہن میں آئی جو اس قسم کے مطالعہ کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی۔ اس مدرسہ کے ایک استاد ڈاکٹر لیوس پاٹن (Lewis Paton) ہیں جنھوں نے شام و فلسطین کی قدیم تاریخ مرتب کی ہے۔ ہارٹفورڈ کا مدرسہ ایک دولتمند محسن مسٹر کینیڈی کی یادگار ہے۔

مشرقی انجمنیں ولایات متحدہ امریکہ کے مستشرقین کی ایک بڑی انجمن ہے جس میں ایسے تمام فضلاء پروفیسر لوگ شامل ہیں جو مشرقی علوم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس انجمن کا نام "امریکن مشرقی مجلس" (American Oriental Society.) ہے۔ اس کے ارکان کئی سو ہیں جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا سالانہ جلسہ کسی ایک یونیورسٹی میں منعقد ہوتا ہے جس میں وہ مضامین پڑھے جاتے ہیں جو ارکان کی خاص تحقیقات کے نتائج ہوتے ہیں۔ یہ مضامین بعد میں انجمن کے اپنے رسالہ میں شائع ہو جاتے ہیں۔ اسی قسم کی انجمنیں تقریباً یورپ کے ہر ملک مثلاً انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا، اطالیہ، ہالینڈ میں قائم ہیں۔ اسی طرح کلکتہ میں "بنگال ایشیاٹک سوسائٹی بھی قائم ہے اور یہ امر قابل اطمینان ہے کہ ایسی انجمنیں باہمی تعلقات قائم کرنے میں بہت مفید ثابت ہو رہی ہیں۔

اس وقت میرے سامنے "امریکن مشرقی مجلس" کی دو شاخوں کی رپورٹ ہے۔ مشرقی شاخ کے اجلاس کرسمس کی تعطیلات میں "جانس یونیورسٹی میں ہوئے اور مغربی شاخ کے جلسے جامعہ وسکنسن میڈیسن شہر میں منعقد ہوئے۔ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی شاخ کے جلسوں میں اکسٹھ ارکان شریک ہوئے جن میں نو خواتین تھیں۔ اس کے جلسہ پانچ مرتبہ ہوئے اس کے صدر ڈاکٹر ٹلکوٹ ولیمز مشہور امریکن صحیفہ نگار تھے جو اسّی سال قبل لبنان کے ایک موضع عبیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے جو مضمون پڑھا اس کا عنوان "اسلامی خلافت" تھا۔ اس سال جو ارکان منتخب کئے گئے تھے ان کی تعداد ۱۳۱ تھی۔ اس انجمن کے اعزازی اراکین میں ہنری مور سابق سفیر ترکی اور ولیم ٹافٹ سابق صدر جمہوریہ اضلاع متحدہ امریکہ بھی شامل تھے۔

ان مضامین کے عنوانات سے جو وہاں پڑھے گئے تھے علوم مشرقیہ کے متعلق امریکن قوم کی کوششوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بعض مضامین حسب ذیل تھے۔

(۱) کتاب سفر ایوب میں شتر مرغ کا ذکر۔

(۲) جزائر فلپائن کی عام زبان۔

(۳) قدیم مصری زبان کی علامتیں اور اس کے مقابلہ میں سامی زبان کی علامت۔

(۴) ان بخور کی کیمیائی ترکیب اور اجزاء نباتی جن کا ذکر تورات میں ہے۔

(۵) حشتین قوم کی زبان۔

(۶) طوفانِ نوح کے بعد کی قوس قزح۔

(۷) زراعت سے متعلق کلدانی روزنامچہ۔

(۸) وہ آیتیں جن کا ترجمہ سفر میں غلط کیا گیا ہے۔

(۹) "حمو" کا اشتقاق۔

(۱۰) تالمود میں طب۔

(۱۱) سامی زبان میں ادارۃ المضارعہ۔

ولایات متحدہ امریکہ کے دورانِ اقامت میں سوائے حالتِ مجبوری کے اس انجمن کے جلسوں سے میں کبھی غیر حاضر نہیں رہا۔ اس بنا پر مجھے ان کی معلومات سے مستفید ہونے کا بہت موقع ملا۔ اور مجھے اپنے ملک کی تاریخ، زبان، فلسفہ اور مذہب سے متعلق ایسی معلومات حاصل ہوئیں۔ جو اُن کی امداد کے بغیر معلوم ہونی بہت مشکل تھیں۔ مجھے بہت افسوس رہا کہ کوئی ہمارا مشرقی بھائی اس انجمن کا رکن نہیں ہے۔ حالانکہ صرف مشرقی علوم سے دلچسپی کا اظہار اس کی رکنیت کی شرط رکھی گئی تھی۔

اس انجمن کی یہ کوشش بھی تھی کہ یہ انجمن حکومتِ امریکہ سے ایک ایسا عام مشرقی مدرسہ قائم کرنے کے متعلق گفت شنید کرے جس میں طلباء کو مشرقی ممالک میں سفارت اور قونصلوں کے منصب کے لئے تیار کیا جائے۔ پریذیڈنٹ ولسن کی حکومت نے اس تجویز پر رضامندی کا اظہار کیا تھا مگر معلوم نہیں بعد میں حکومت کا کیا طرزِ عمل رہا۔

دوسری انجمن "انجمن تشریح و تفسیر تورات" ہے جس میں مذکورہ بالا انجمن کے اراکین بھی شامل ہیں۔ اس انجمن کا دائرہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان لسانی۔ تاریخی۔ اور مذہبی

مباحث تک محدود ہے جن کا تعلق تورات یا بائبل سے ہے۔ نیویارک اور شہر فلاڈلفیا میں مستشرقین کی ایک اور مختصر سی انجمن ہے۔ جہاں اس کے ارکان کسی ایک رکن کے گھر مہینے میں ایک مرتبہ تعارف اور تبادلہ خیالات کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اور ان جلسوں میں علمی مباحث اور نئی مشرقی کتابوں کے مطالعے اور تبادلہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میں نیویارک کی ایسی ایک انجمن کے جلسوں کے منظر کو فراموش نہیں کر سکتا جب اس کے ارکان شام کو آتے تھے اور ان میں سے ہر ایک بقدر استطاعت کتابیں رسالے یا اوراق ہی اٹھائے ہوئے چلا آتا تھا۔

مشرقی رسائل | امریکن مشرقی انجمن" کا ایک ایک سہ ماہی رسالہ شائع ہوتا ہے جس میں اراکینِ انجمن کے مقالات اور لیکچر شائع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ یایل یونیورسٹی میں چھپتا ہے اور اس طرز پر مرتب ہوتا ہے جس طرز پر یورپ کی مشرقی مجالس کے سہ ماہی رسائل شائع ہوتے ہیں۔

ایک رسالہ "صحیفہ سامی لغات" ہے جو جامع شکاگو کے شعبہ مشرقیات کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ ایک اور اہم مشرقی رسالہ "انجمن تفسیر تورات" کی طرف سے بھی شائع ہوتا ہے۔

ان رسائل میں مضمون نگار کسی خاص مضمون پر نہایت جانفشانی اور صحیح تحقیقات کے بعد جو جدید علمی اصول پر مبنی ہوتی ہیں کوئی مقالہ سپرد قلم کرتا ہے تاکہ تعلیم یافتہ اور فضلاء ان کی تحقیقات سے مستفید ہوں۔ یہ مقالات عام مذاق کے نہیں ہوتے ہیں بلکہ مشرقی علوم سے گہری دلچسپی رکھنے والا ہی ان کو سمجھ سکتا ہے۔ نیویارک میں دوسری قسم کا عام پسند ایک مصور رسالہ بھی شائع ہوتا ہے جسے کافی امداد حاصل ہے۔ یہ رسالہ مشرق کے اجتماعی اور سیاسی معاملات پر عوام کی دلچسپی کے لئے عام فہم مضامین شائع کرتا ہے (اور تمام دنیا میں کافی مقبول ہے) اس رسالے کا نام "ایشیا" ہے۔

کتب خانے | دار الخلافہ واشنگٹن میں "کانگریس لائبریری" ہے جو امریکہ میں سب سے بڑی لائبریری ہے۔ نہ صرف عمارت اور ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے بلکہ کتابوں کے ذخیرے کے لحاظ سے بھی یہ عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ اس کی مستحکم عمارت، نقش و نگار اور گلکاریوں کی وجہ سے نہایت خوبصورت اور روح افزا ہے۔ ملک کے قانون کے مطابق ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر مطبوعہ کتاب کے دو تین نسخے اس کتب خانہ کو پیش کئے جاتے ہیں۔ جنگِ عظیم کے بعد جب میں اس کتب خانہ میں گیا تو اس وقت "الہلال قاہرہ" کے بہت پرچے وہاں محفوظ دیکھے۔ میرا گمان غالب یہ ہے کہ اس کتب خانے میں مشرقی کتابوں کا ذخیرہ امریکہ کے دیگر کتب خانوں سے

بہت زیادہ ہے۔

نیویارک کی پبلک لائبریری بھی بہت بڑی ہے۔ اس کے مشرقی شعبہ میں تیس ہزار کتابیں ہیں۔ یعنی امریکن یونیورسٹی بیروت کے کتب خانے سے بھی زیادہ اس میں مشرقی علوم کی کتابیں موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ مصر، شام، حجاز، عراق، ارمینیا ممالک فارس اور دیگر مشرقی ممالک کے اخباروں اور رسائل سے تبادلہ کرتا رہتا ہے۔ موسم گرما کی تعطیلات میں میں نے بیشتر وقت اس کتب خانہ میں مشرقی کتب کے مطالعہ میں گذارا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ شعبہ کتب مشرقیہ کا منتظم ہر اس نئی کتاب کے خریدنے پر آمادہ ہوگیا جس کا نام میں نے اس کے سامنے پیش کیا۔ ان کتابوں کے پہلے صفحہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کتابوں کی بڑی تعداد ایک دولتمند یہودی یعقوب شف کی عطا کردہ ہے۔

ان کتب خانوں کے علاوہ ہر بڑی یونیورسٹی میں ایک کتب خانہ ہوتا ہے جس کے ضمن میں مشرقی شعبہ بھی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مشرقی اشیاء کے عجائب خانے بھی ملحق ہوتے ہیں لیکن یہ عجائب خانے لندن پیرس اور برلن کے عجائب خانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

میرے علم میں امریکہ کے کتب خانوں میں کوئی نادر قیمتی قلمی کتاب نہیں آئی۔ البتہ ابن عساکر کی تاریخ دمشق کا ایک نسخہ کولمبیا یونیورسٹی میں اور سریانی زبانوں کی بائبلوں کے قدیم ایڈیشن واشنگٹن کی کیتھولک یونیورسٹی میں موجود ہیں۔

ادبیات

جاگ

جناب روش صدیقی

جاگ ! اے نرگسِ میخانہ فروز

درِ دولت پہ گل افشاں ہے نسیمِ سحری
ہیں نقیبانِ ادب منتظرِ جلوہ گری
کوکبِ صبح ہے بیتاب پریشاں نظری
جاگ ! اے نرگسِ میخانہ فروز

☆

بوسۂ پا کے لئے جاگ اٹھی ہے شبنم
نکہتِ گل اسی حسرت میں رواں ہے پیہم
سب ہیں مشتاق کہ آنکھوں سے ملیں خاکِ قدم
جاگ ! اے نرگسِ میخانہ فروز

☆

شفقِ سرخ ہی کچھ منتظرِ دید نہیں !
چشمِ وارفتۂ دیدار ہے خورشید نہیں !
آنکھ کس کی سوئے کاشانۂ امید نہیں !
جاگ ! اے نرگسِ میخانہ فروز

☆

کوئی آوارہ ہے تیرے لئے تنہا نوں میں
کوئی سرگشتہ و حیراں ہے خیابانوں میں
ڈھونڈھتا پھرتا ہے کوئی تجھے ویرانوں میں

جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

☆

کیوں دلِ شیخِ حرم منزلِ بیتابی ہے
چشمِ صوفی، اثرِ گریہ سے عنابی ہے
آنکھ زاہد کی بھی گہوارۂ بے خوابی ہے
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

☆

خانقاہوں سے ہے اک تشنگیٔ عام قریب
ساحلِ بحر سے جیسے، شفقِ شام قریب
لبِ واعظ سے ہے اک حسرتِ بے نام قریب
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

☆

دیرِ مدرسۂ فکر و نظر برہم ہے
فلسفہ یوں تو ہے خاموش مگر برہم ہے
جام و مینا میں ادھر آتشِ تر برہم ہے
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

☆

شکن آلود سی ہے دانشِ حاضر کی جبیں!
کہیں زنجیرِ گماں توڑ نہ دے ضربِ یقیں!
منتظر ہیں، ترے رندانِ خرابات نشیں!
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

☆

اور وہ جنتِ امکاں، وہ ترا میخانہ!
ہے جہاں اور ہی تقدیرِ مے و پیمانہ!
ہمہ تن چشم ہے تیرے لئے بیتابانہ!
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

جہاں میں ہوں

جناب ماہر القادری صاحب

تمنا بھی دوئی کی اک نشانی ہے جہاں میں ہوں　　محبت خود حجابِ درمیانی ہے جہاں میں ہوں

یقیں کے آبشاروں کی روانی ہے جہاں میں ہوں　　سکوتِ گل میں طوفانِ معانی ہے جہاں میں ہوں

خموشی حاصلِ نازک بیانی ہے جہاں میں ہوں　　نگاہوں میں حدیثِ لن ترانی ہے جہاں میں ہوں

صفت خود ذات کو آئینہ دکھلاتی ہے رہ رہ کر　　تجلی کو بھی شوقِ پرفشانی ہے جہاں میں ہوں

نفس کی موج بھی بے اذن جنبش کر نہیں سکتی　　وہاں اک اک نظر کی پاسبانی ہے جہاں میں ہوں

ارادے ٹوٹتے ہیں آگہی مضبوط ہوتی ہے　　شکستوں سے طلوعِ کامرانی ہے جہاں میں ہوں

مری ہستی کو قربت کی فضا راس آ نہیں سکتی　　غمِ دوری ہی وجہِ زندگانی ہے جہاں میں ہوں

طلسمِ ہوش و مستی ہے نہ مجبوری نہ مختاری　　خود اپنی ذات سے بھی بدگمانی ہے جہاں میں ہوں

طبیعت ہے فسردہ پھر بھی ہونٹوں پر تبسم ہے　　ہجومِ غم میں جبرِ شادمانی ہے جہاں میں ہوں

مرا ہر شعر ماہرؔ شارحِ آیاتِ قدرت ہے
وہاں جذب و یقیں کی ترجمانی ہے جہاں میں ہوں

تبصرے

الدین القیم | از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن تقطیع خورد ضخامت ۲۲۷ صفحات طباعت وکتابت متوسط قیمت دو روپیہ۔ پتہ:۔ مکتبہ الفرقان بریلی۔

یہ دراصل مولانا کی ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو آپ وقتاً فوقتاً دینیات کے طلبہ کے لئے قلمبند کرتے رہے تھے۔ اسی بنا پر یہ اگرچہ بقامت کہتر ہے لیکن اس کے بقیمت بہتر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اس میں مولانا نے فلسفہ کے جدید اسلوب بیان کی روشنی میں بدلائل قطعی یہ ثابت کیا ہے کہ مذہب انسانی فطرت کا طبعی مطالبہ ہے۔ انسانی طبیعت میں عالم مابعد الطبیعیات کے متعلق جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب نہ فلسفہ کے پاس ہے اور نہ سائنس کے پاس۔ صرف مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جو ان سوالات کا تسکین بخش جواب دے سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ بتایا ہے کہ جھوٹے اور سچے مذہب کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے۔ اور ان کے علائم ونشانات کیا کیا ہیں۔ پھر آپ نے صفاتِ باری پر عموماً اور توحید پر خصوصاً مفصل ومدلل کلام کیا ہے۔ اور اس کے بعد مختلف مسائل مثلاً وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود، جبر واختیار۔ مسئلہ شفاعت۔ اجر وثواب۔ جنت ودوزخ۔ زہد وقناعت اعجاز قرآنی وغیرہ وغیرہ متعدد اسلامی اصول ومسائل ہیں جن کو مولانا نے عجیب وغریب حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز میں بڑی وضاحت اور صفائی سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ مومنین قانتین کے لئے ایمان کی پختگی کا۔ اور غیر مسلموں اور متشککین کے لئے نورِ بصیرت کے پیدا ہونے کا سبب ہوگا۔

چند ہم عصر | ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو۔ تقطیع متوسط کتابت وطباعت بہتر۔ ضخامت ۱۸۸ صفحات قیمت مجلد عہ پتہ:۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

مولوی ڈاکٹر عبد الحق صاحب ہمارے کاروانِ گذشتہ کے چند ہی بچے کھچے بزرگوں میں سے ہیں پچھلے دور کے بڑے بڑے لوگ جن میں کوئی شاعر تھا۔ کوئی ادیب ومصنف۔ کوئی قومی کارکن یا کوئی وکیل وبیرسٹر۔ مولوی صاحب موصوف کو ان میں سے متعدد اصحاب کے ساتھ صحبت رہی یا ایک گونہ تعلق رہا ہے۔ اس بنا پر ان حضرات کی نسبت مولوی صاحب کو جو معلومات حاصل ہیں وہ زیادہ تر خود اپنے مشاہدہ اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہیں اور اس لئے مستند اور لائق اعتماد ہیں۔ مختلف مضامین یا

تبصروں کی شکل میں یہ معلومات بکھرے پڑے تھے۔ مرحوم شیخ چاند صاحب نے ان کی اہمیت محسوس کرکے ان سب کو یکجا کرکے مرتب کردیا ہے۔ شیخ چاند مرحوم کی فرمائش کے مطابق مولوی صاحب اگر سرسید اور نواب عماد الملک پر بھی اسی نوع کے مضمون لکھ دیں تو ان دونوں صاحبوں کے بعض واقعات زندگی کے متعلق کچھ مزید روشنی پڑسکیگی۔

یوں تو ساری کتاب ہی ادبی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے دلچسپ اور مطالعہ کے لائق ہے تاہم منشی امیر احمد مینائی۔ سید محمود۔ مولوی چراغ علی۔ محسن الملک۔ مولانا حالی۔ سر سید راس مسعود اور میرن صاحب کے مضامین خاص طور پر بہت پر لطف اور دلچسپ ہیں۔

دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعرا از عبد الشکور صاحب ایم اے۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۴۸ صفحات کتابت وطباعت عمدہ قیمت عہ پتہ:۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

اس کتاب میں لائق مولف نے اردو شاعری کے دورِ قدیم وجدید کے چند منتخب ہندو شاعروں کے مختصر حالات کا اور کلام کا بھی بہت ہی مختصر انتخاب درج کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس پروپیگنڈہ کی تغلیط کیجائے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، چنانچہ شروع میں ۳۶ صفحات کا ایک مقدمہ بھی ہے جو محنت سے لکھا گیا ہے اور جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اردو ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان اور دونوں قوموں کے معاشرتی ارتباط واختلاط کی یادگار ہے۔ افسوس ہے کہ لائق مولف نے شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے انتخاب میں غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے۔ پھر بعض بعض شاعروں کے کلام کی نسبت جو بعض تنقیدی رائیں نقل کی ہیں وہ بھی کافی اور فیصلہ کن نہیں ہیں۔ ساحر اور کیفی دونوں کہنہ مشق اور پختہ کلام شاعر ہیں۔ فن کی واقفیت میں وہ قدیم اساتذۂ سخن کی یادگار ہیں، پھر ان دونوں کی نسبت انگریزی کے ایک نوجوان پروفیسر کی یہ رائے "کہ کوئی خاص رنگ نہیں۔ خیالات بھی ناہموار ہیں" کیا وقعت رکھ سکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ یا تو صرف انتخابِ کلام پر اکتفا کیا جاتا۔ اور اگر تنقید بھی کرنی تھی تو پورے کلام پر مفصل تنقید کی جاتی۔ دوسروں کے چند منتشر فقرے نقل کردینے سے کلام کا عیب وہنر معلوم نہیں ہوتا۔ بہر حال مجموعی اعتبار سے کتاب دلچسپ اور مطالعہ کے لائق ہے۔

کیفیہ از جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۳۸۰ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ے۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی۔

پنڈت کیفی ہماری زبان کے ان بلند پایہ ادیبوں اور محققوں میں سے ہیں جو جو کچھ لکھتے ہیں

تحقیق اور محنت سے لکھتے ہیں اور موضوعِ بحث پر خوب غور و فکر کرنے کے بعد قلم اٹھاتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب آپ کے ہی رشحاتِ قلم کا ایک ثمر خوش اثر ہے۔ اس کو بجائے ایک مستقل تصنیف کہنے کے "امالی کیفی" کہنا زیادہ موزوں ہے۔ اردو زبان اور اس کے ادب و انشار، عروض و تاریخ۔ شعر و نثر کے متعلق متفرق مضامین و مقالات ہیں جو ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہ سب مقالات نہایت پُر از معلومات، بصیرت افروز، اور مفید و سود مند ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ پر فاضل مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن ٹھوس ہے۔ یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ ہماری طرح پنڈت کیفی بھی امیر خسرو کو اردو زبان کا پہلا شاعر مانتے ہیں۔

جو برادرانِ وطن اردو کو خاص مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں ان کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ اردو کا پہلا غزل گو ایک ہندو ہی تھا جو تخلص بھی برہمن کرتا تھا۔ کیفی صاحب نے تو اس مقالہ میں یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے تسلط سے بہت پہلے اس ملک کے ہندو فارسی زبان کے عالم ہوتے تھے اور ان کے بیراکرت میں عربی فارسی الفاظ کافی مقدار میں شامل ہوتے تھے۔ اس تحقیق کو اگر اور ذرا وسیع کیا جائے تو اس سے عرب و ہند کے قدیم تعلقات پر بہت کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔ علاوہ بریں دوسرے مباحث جو اردو زبان کے حروف تہجی۔ فیلالوجی قواعد صرف و نحو۔ روزمرہ و محاورہ۔ محاسن و معائب کلام۔ معانی و بیان۔ عروض و انشار۔ املا، و مطابقات وغیرہ سے متعلق ہیں وہ بھی نہایت اہم۔ محققانہ اور بصیرت افزا ہیں۔ جن کا غور سے اور سمجھکر مطالعہ اردو زبان کے اساتذہ۔ طلبار اور ادبار سب کے لئے مفید اور ضروری ہے۔ عبارتوں اور املا سے متعلق فاضل مصنف نے جو مشورے دیئے ہیں ان سے ہر ایک کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے تاہم کیفی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی افادیت میں شبہ نہیں۔ ان پرانے افاضل کا دم غنیمت ہے کہ زبان کی ٹھوس خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ورنہ آج کل تو حال یہ ہے کہ ایک مزاحیہ افسانہ یا ڈرامہ لکھئے ادیب بنجائیے۔ اور عریاں و پریشاں خیالات کو ترقی پسند شاعری کا نام دے کر کسی رسالہ میں چھپوا دیجئے اور "انقلابی شاعر" کہلانے لگئے۔

REGISTERED No L.4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسن خاص:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم اڑھائی سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔

ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبۂ برہان کی اہم مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:۔ جو حضرات بارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبّا:۔ چھ روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) برہان کی ضخامت کم سے کم اسّی صفحے ماہوار اور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

(۶) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸؍

(۷) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ برہان قرولباغ دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

عتیق الرحمٰن عثمانی

برہان

جلد سیزدہم شمارہ (۴)

شوال المکرم ۱۳۶۳ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۴ء

فہرست مضامین

مولانا عبید اللہ سندھی

ایک تبصرہ[1] پر تبصرہ

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔ اے

دنیا میں جو لوگ کسی عقیدہ پر ایمان رکھتے یا کسی مذہب کو سچا مانتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک قسم تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے عقیدہ پر محض اس لئے ایمان رکھتے ہیں کہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے انھوں نے اس عقیدہ پر ایمان رکھنے والے گھرانہ میں جنم لیا ہے۔ اس عقیدہ کو سچا ماننے والے لوگوں کی گودوں میں پرورش پائی ہے۔ اور ایک ایسی سوسائٹی اور ایسے ماحول میں ذہنی تربیت و تعلیم کے مختلف مدارج طے کئے ہیں جو اس عقیدہ کا یقین رکھتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا ایمان "ایمانِ کامل" سہی۔ لیکن اگر وہ صرف اسی پر قناعت کرکے بیٹھ جائیں تو ان میں اس بات کی صلاحیت کم ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کی سچائی اس کے مخالفوں اور دشمنوں سے بھی منوا سکیں۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس عقیدہ کا بلند نظری۔ وسعتِ فکر اور تعمقِ خیال سے خود اپنے یا اپنے زمانہ کے طرزِ فکر کے ماتحت پوری طرح جائزہ لیتے ہیں عقل و فراست کی کسوٹی پر

---

[1] مطبوعہ معارف اعظم گڈھ۔ ستمبر ۴۴ء

اس کو خوب اچھی طرح پرکھتے اور اس کا کھرا کھوٹا معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان کے دل و دماغ اپنی تمام بیداریوں کے ساتھ اس عقیدہ کی صحت کا متفقہ اور قطعی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں تو اب وہ اس کو قبول کر لیتے ہیں اور خوش قسمتی سے قوتِ نظری کے ساتھ ان کی قوتِ عملی بھی تندرست اور پرجوش و سرگرم ہوتی ہے تو اب یہ لوگ عقیدہ اور عمل کی پختگی کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہیں کہ پہلی قسم کے لوگوں سے بمراحل آگے نکل جاتے ہیں اور صداقت پرستی کے درجات و مراتب میں ان کا مرتبہ سب سے اونچا اور بلند ہوتا ہے نبوت کی زبان حقیقت ترجمان نے۔

خیارکم فی الجاھلیۃ	جو تم میں جاہلیت میں سب سے بہتر ہے
خیارکم فی الاسلام	وہ اسلام میں بھی سب سے بہتر ہے۔

فرما کر اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی "فاروقیت" کا راز بھی ایک اسی نکتہ میں پنہاں ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام جس کو رب السموات والارض کی بارگاہِ قدس سے "رضیت لکم الاسلام دینا" کا طغرائے امتیاز و افتخار حاصل ہے۔ عقائد و اعمال کا ایک ایسا دلنواز و روح پرور مجموعۂ خوبی ہے کہ اس کو جس جہت سے دیکھئے حسن ہی حسن نظر آتا ہے اور اگر دیکھنے والا آئینہ ضمیر ہے تو ناممکن ہے کہ اس کی نظر تجسس اس کی جلوہ پاشیوں میں گم ہو کر نہ رہ جائے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

یہی وجہ ہے کہ عرب کے سادہ طبیعت مشرکین و اہلِ کتاب اسلام کی سادہ تعلیمات سے متاثر ہوئے اور حلقہ بگوش کلمۂ توحید بنے۔ عجمیوں کو ان تعلیمات کے اخلاقی اور علمی اثرات و نتائج نے رام کیا اور وہ اس کے صید زبوں ہوئے۔ فلاسفہ کو اسلام نے کھینچا۔ بہادروں کے سخت دلوں کو عمرو و خالد (رضی اللہ عنہما) کی جانبازیوں نے موم بنایا۔ سلاطین و امراء۔ اسلام کے "سکندر دماغ" فقیروں اور درویشوں کی شانِ بے نیازی و استغنا کو دیکھ کر اس کے آستانہ عقیدت و ارادت پر بے ساختہ جھک پڑے اور دنیا کے مظلوم و مجبور اور بے کس و مقہور انسان جن کے جسموں پر قیصریت و کسرویت کے دیو جان شکار نے اپنے دندان حرص و آز جما رکھے تھے۔ انھوں نے اسلام کی زبان سے انسانی حقوق کے احترام اور مساوات و برابری کا نعرہ سنا تو وہ سب اس کے جھنڈے نیچے جمع ہو گئے اور انھوں نے دعوتِ ربانی کو لبیک کہتے ہی اپنے سوکھے ہوئے بازوؤں اور لاغر و نحیف جسموں میں ایک ایسی طاقت محسوس کی کہ انھوں نے

دیکھتے دیکھتے قیصریت و کسرویت کے ناپاک جامۂ ظلم و ستم کی فضاء آسمانی میں دھجیاں اڑادیں۔ غرض یہ کہ ہر قوم اور ہر جماعت نے اسلام کی صداقت کو اپنے اپنے نقطۂ فکر اور رجحانِ ذہنی کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے اور اس کی سچائی پر ایمان لائی ہے۔ راہیں گو مختلف ہوں۔ منزل بہر حال ایک ہی ہے۔ عنواناتِ فہم و تعبیر میں رنگا رنگی و گوناگونی ہے لیکن "معنون" میں یکسانیت ہے۔

عبارا تنا شتیٰ و حسنک واحد

تاریخ اسلام کے ہر دور میں یہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوگا۔ تاریخِ انسانی کے طبعی ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسان کا طریقِ فکر اور اس کا اندازِ فہم و تدبر بھی ترقی پذیر ہوتا ہے اور وہ اپنے اسی طریقِ فکر کی روشنی میں ہر حقیقت کا جائزہ لیتا ہے۔ اسلام چونکہ عالمگیر اور آخری دینِ حق ہے اس لئے اس کو کوئی انسانی جماعت خواہ کسی طریقِ فکر سے جانچے۔ بہر حال اگر فطرت میں سلامتی ہے تو وہ ضرور اس کی صداقت کا اعتراف کریگی۔ اسی بناء پر متکلمین کے نام سے علماء اسلام میں جو جماعت ہر دور میں رہا ہے اس نے اسی بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اسلام کا پیغام اپنے زمانہ کے لوگوں تک ان کے استعدادِ فہم و فراست اور طریقِ فکر و تدبر کے مطابق ہی پہنچائیں۔

آجکل "اسلامی قدامت پرست" کا ایک عجیب و غریب شعار یہ بھی ہوگیا ہے کہ اب متکلمین اسلام کی ان مخلصانہ کوششوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور ان کے کارناموں کی وقعت کو کم کرنے کے لئے سرے سے "عقلیت" ہی کی مخالفت شروع کردی گئی ہے۔ حالانکہ اگر واقعہ ایسا ہی ہوتا تو امام شافعیؒ اور دوسرے علماء ایک مرتبہ علم کلام کی تحصیل کے متعلق عدم جواز کا فتویٰ دینے کے بعد پھر اس کے وجوب کا حکم نہ دیتے۔ [1]

---

[1] ظاہر ہے کشتی میں جیتنے نہ جیتنے سے کسی مذہب کی صداقت کا کیا تعلق ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود رکانہ نامی ایک عرب پہلوان نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی لڑنے کی فرمائش کی اور اس میں جیت جانے کو اس نے دلیلِ صداقت قرار دیا تو آپ اس پر بھی رضامند ہوگئے اور رکانہ کو پچھاڑ کر اس سے اپنی نبوت کا اقرار کرایا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ قبیلہ تمیم کے ایک وفد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر مفاخرت یعنی فخر میں مقابلہ کرنے کی دعوت دی تو آپ اس پر رضامند ہوگئے اور آپ نے وفد کے خطیب کے مقابلہ میں اپنے خطیب ثابت بن قیس کو اور ان کے شاعر کے مقابلہ میں اپنے شاعر حسان بن ثابت کو اشعار پڑھنے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرداران تمیم نے خطبہ اور اشعار سنکر کہا۔ بیشک آپ نبی اور موید من اللہ ہیں اور پھر سب مسلمان ہوگئے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی صداقت کو ثابت کر دکھانے کے لئے ایک مبلغ کو اپنے زمانہ کے تمام آلات اور ساز و سامان سے مسلح ہونا چاہئے اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کا یہ فعل سراسر اسلامی ہے۔ نہ کہ "تجدد"

ہمارے زمانہ میں مولانا عبید اللہ سندھی اسی نوع کے متکلم اسلام تھے۔ مزید برآں آپ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ متکلم ہونے کے ساتھ عالم عظیم و جلیل مجاہد بھی تھے۔

ہونا تو یہی چاہیے۔ لیکن بدنصیبی سے ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو اسلام کی عالمگیر حیثیت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر نا آشنا ہونے کے باعث دینِ قیم کی نسبت اجارہ دارانہ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے جاگیردارانہ ذہنیت رکھتا ہے۔ اس طبقہ کو نئے عنوان و تعبیر کا اختلاف بھی ناقابل برداشت ہے۔ اور یہ کسی ایسی چیز کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا جو ان کے اپنے محدود نقطۂ فکر سے ذرا بھی منحرف ہو۔ چنانچہ ان حضرات سے مولانا عبید اللہ سندھی کا اجتہادی فکر گوارا نہ ہو سکا اور انھوں نے مولانا مرحوم کی زندگی میں ہی تحریروں اور تقریروں میں اس کا علانیہ اظہار شروع کر دیا تھا۔

لیکن اگر اس سلسلہ کا ایک "علمی" شاہکار دیکھنا ہو تو دار المصنفین اعظم گڈھ کے ماہوار رسالہ معارف کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۴۴ء میں مولانا مسعود عالم ندوی کی وہ تنقید ملاحظہ فرمائیے جو " مولانا عبید اللہ سندھی پر ایک ناقدانہ جائزہ کے عنوان سے چھپی ہے۔

تنقید بری چیز نہیں۔ اور نہ مولانا عبید اللہ کے ساتھ ان حضرات کا یہ معاملہ تاریخ اسلام کا کوئی انوکھا اور نادر واقعہ ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے

غور کیجئے! امام احمد بن حنبل کو "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" کہنے کے جرم میں کن لوگوں نے دُرّے لگوائے تھے۔ امام مالک بن انس کو طلاق المکرہ لیس بواقع' کا اعلان کرنے کی پاداش میں کن حضرات نے ذلیل و رسوا کرایا۔ پھر ابن رشد پر جو تباہی آئی وہ کن کے فتاوی کا صدقہ تھا۔ امام ابن تیمیہ کو قید و حبس کی جو تکالیف برداشت کرنی پڑیں ان کے لئے سندِ جواز کا سامان کن حضرات کی تکفیر نے مہیا کیا۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی نسبت جہانگیر ایسے عادل بادشاہ کے اپنے تزک میں حد درجہ ناشائستہ الفاظ اور ان کو گوالیار کے زندان میں محبوس کرنا کس ذہنیت کا پتہ دے رہے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی بدعتِ ترجمۂ قرآن پر علماء کرام کے ایک طبقہ نے کیوں ہنگامہ برپا کیا تھا۔ یہاں تک کہ مسجد فتحپوری میں ان کے قتل تک کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ تحریک اتحادِ اسلامی کے بانی سید جمال الدین افغانی پر علماء مصر کے ایک گروہ نے کیوں عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور ان کے وہاں کے قیام کو ناممکن بنا دیا تھا۔ یہ تو خیر! آپ فرمائیں گے ارباب اغراض کے کارنامے تھے لیکن اس کو کیا کہیے گا کہ امام ابن تیمیہ جیسا امام وقت اور حافظ حدیث غزالیؒ ایسے اعتزال کش امام کو معتزلہ بلکہ باطنیہ فرقہ کی صف میں لیجا کر بٹھا دیتا ہے اور رئیس الطائفہ۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کو ملحد اور زندیق کے خطاب سے نوازتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اصحابِ عقل و نقل اور اربابِ اجتہاد و تنقید میں ہمیشہ کشمکش رہی ہے۔ اور سب آپس میں ایک دوسرے سے نبرد آزما رہے ہیں۔ اس بنا پر اگر آج بھی ایسا ہو تو اس میں نہ کوئی بُرا ماننے کی بات ہے اور نہ جائے حیرت و استعجاب ہے۔

لیکن اس بات کا سخت افسوس ہے کہ مولانا مسعود عالم نے مولانا سندھی پر جو تنقید کی ہے۔ اس میں مولانا کے افکار کو بالکل توڑ موڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ جس سے حقیقت کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ اور کہیں کی بات کہیں جا پہنچی ہے۔ علاوہ بریں یہ تنقید فاضل نقاد کی ایک ایسی ذہنیت کا پردہ فاش کرتی ہے جو ہمارے نزدیک خود تنقید کی مستحق ہے۔ اگر مولانا مرحوم حیات ہوتے تو وہ خود اس کا جواب لکھتے لیکن یہ تنقید ایسے وقت شائع ہوئی ہے جبکہ اس کی اشاعت کے ساتھ ساتھ معارف میں دو سطر کا مولانا کی وفات پر ایک تعزیتی نوٹ بھی ہے۔ اس بنا پر ہم اس تبصرہ پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ یہ بحث مولانا کے افکار و آراء سے ہے جن سے آج کل موافقانہ اور مخالفانہ بڑی دلچسپی لی جا رہی ہے اور جو عصرِ حاضر میں اسلام کی مشکلات کو حل کرنے سے متعلق ہیں اس لئے ہم اس پر تفصیلاً گفتگو کریں گے۔ تاکہ مولانا کے افکار اپنی اصل شکل و صورت میں لوگوں کے سامنے آجائیں اور وہ ان پر سنجیدگی، متانت، بلند نظری اور روشن دماغی کے ساتھ غور و خوض کر کے یہ معلوم کر سکیں کہ وہ مستقبل کی نئی دنیا میں جو ابھی انقلابات کی گود میں پرورش پا رہی ہے۔ مولانا کے دینی و سیاسی افکار سے اسلام کو سربلند کرنے کی راہ میں کہاں تک اور کتنی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔

شروع میں ہی اس کا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہم خود مولانا مرحوم کے سب خیالات اور تمام افکار و آراء سے من و عن متفق نہیں ہیں[1]۔ اور ایک مولانا سندھی کیا دنیا کا بڑے سے بڑا امام اور مجدد وقت بھی

---

[1] چنانچہ برہان میں کئی مرتبہ اس کا اظہار بھی ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر بھی بے محل نہیں ہوگا کہ یہاں دہلی میں جامع مسجد کے قریب مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی کا بڑا مکان ہے۔ جہاں جمعہ کی نماز کے بعد تقریباً وہ تمام ابنائے دارالعلوم دیوبند جو دہلی میں قیام پذیر ہیں جمع ہوتے ہیں اور مختلف مسائل و امور پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی بھی قیام دہلی کے زمانہ میں ہر جمعہ کو اس مجلس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور ہم لوگوں کو جستہ جستہ مقامات سے حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے تھے۔ مولانا کی عادت یہ تھی کہ وہ اصل مسئلہ کے متعلق خود پہلے ایک تقریر کر دیتے تھے اور پھر ہم لوگ نہایت آزادی اور بیباکی سے اپنے شکوک و شبہات یا اعتراضات بیان کرتے تھے تو مولانا ان کے جوابات کی تقریر کرتے تھے۔ مولانا کی پابندی وضع کا یہ عالم تھا کہ محض اس مجلس میں شرکت کے لئے جامعہ نگر اوکھلے سے جو دہلی سے سات میل کی مسافت پر ہے نماز جمعہ سے قبل تشریف لاتے تھے اور نماز عصر کے بعد یہاں سے (باقی صفحہ ۱۳۴ پر ملاحظہ ہو)

کوئی ایسا نہیں کہ سب لوگوں نے اس کے سب خیالات سے اتفاق کیا ہو۔ اس بنا پر اس تحریر کا مقصد مولانا کی خواہ مخواہ طرفداری نہیں بلکہ ان کے افکار و آرار کی ٹھنڈے دل سے تحقیق و تنقیح مقصود ہے۔ واللہ یھدی من یشاء۔

وعندی من الاخبار ما لو ذکرتہ اذا قرح المغتاب من ندم سنا

مولانا کی شخصیت چونکہ ہر کلام کے سمجھنے میں متکلم کی شخصیت کو سمجھ لینے سے بڑی مدد ملتی ہے اس لئے مناسب ہے کہ مولانا سندھی کے افکار و آرار پر گفتگو کرنے سے پہلے موصوف کی شخصیت کا ایک اجمالی جائزہ لے لیا جائے۔

مولانا کے افکار پڑھتے وقت بنیادی طور پر اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ یہ افکار ایک ایسے شخص کے ہیں جو پیدائشی مسلمان نہیں تھا۔ ایک سکھ گھرانہ میں پیدا ہوا۔ دنیوی اعتبار سے اچھی خاصی آرام کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اس نے مذہبی صداقت کی جستجو شروع کی اور جب اسلام کی صداقت اس پر روشن ہوگئی تو اب اس کے قبول کر لینے اور اس کے اظہار و اعلان میں اس نے کسی کی ذرا پرواہ نہ کی اسلام اس کو اتنا عزیز تھا کہ اس کی خاطر اس نے بوڑھی ماں کو چھوڑا۔ بہن اور ماموں سے منہ موڑا۔ کنبہ قبیلہ کو الوداع کہا۔ یہاں تک کہ اپنا وطن بھی ترک کر دیا۔ پھر اس نے صرف مسلمان ہونے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسلام کی اصل روح۔ اس کی تعلیمات اور اس کے اصول و فروع میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے اس نے علوم دین کی تحصیل شروع کی اور اسی سلسلہ میں وہ دیوبند آیا۔ یہاں اس نے علوم عقلیہ و نقلیہ میں کمالِ درک پیدا کیا۔ ذہن بیدار تھا۔ اور ذوقِ جستجو صادق۔ استاد حضرت شیخ الہندؒ جیسا ملا جو پیتل کو سونا۔ اور خاکِ سیاہ کو ہیرا بنا دے۔ پھر کمی کس چیز کی تھی۔ اس نو مسلم نوجوان نے وہ آب و تاب پیدا کی کہ اپنے ساتھیوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ اس کے علم و عمل۔ اخلاص و دیانت اور فہم و فراست کے

(بقیہ صفحہ ۱۳۳)

فارغ ہو کر واپس چلے جاتے تھے۔ نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ متعدد بار ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا کے پاس موٹر بس کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوئے ہیں تو وہ گرمی کے دنوں میں جامعہ نگر سے پیدل چل کر دہلی پہنچے ہیں اور پھر پا پیادہ ہی واپس گئے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ چہرہ کی بشاشت اور زورِ تقریر پر اس کا ذرا بھی اثر محسوس ہونے دیا ہو یا کسی سے اس کا ذکر کیا ہو۔ کیا آج بھی کوئی عالمِ دین ایسا ہے جو اس طرح کی مجاہدانہ زندگی بسر کرنے کا خوگر ہو۔ آہ! اب آنکھیں اس پیکرِ عزم کو ترستی ہیں۔

الی اللہ اشکو لا الی الناس انی
اری الارض تبقی والاخلاء تذھب

ثبوت کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اہم کاموں میں اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کا معتمد ترین ۔ دست وبازو بنا جو اپنے عہد کے صرف ایک نامور محدث نہیں تھے بلکہ عالم اسلام کے بلند پایہ مفکر بھی تھے اور جن کا دل و دماغ اسلام کو دنیا کی عظیم ترین طاقت بنانے اور ہندوستان میں ایک اسلامی انقلاب برپا کرنے کی فکر میں ہر وقت غلطاں وپیچاں رہتا تھا ۔ اسی غایتِ اعتماد[1] کا نتیجہ تھا کہ استاد نے اپنے اس نوجوان شاگرد کو اپنے سینہ کے رازہائے سربستہ کا محرم وامین بناکر کابل بھیجدیا ۔

کابل میں چند سالہ قیام کے بعد آپ ماسکو آئے ۔ یہاں اپنی آنکھ سے زار کی حکومت کے کھنڈروں پر سوویٹ روس کی جدید عمارت کو کھڑے ہوتے دیکھا ۔ یہاں ایک سال تک قیام کرنے کے بعد آپ ٹرکی آئے ۔ پھر حجاز پہنچے ۔ اور بارہ تیرہ سال یہاں کی خاک پاک میں بسر کرنے کے بعد ہندوستان آئے اور پانچ سال بعد بالآخر یہیں جان بجاں آفریں کے سپرد کرکے راہی عالم بقا ہوگئے ۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

یہ ظاہر ہے کہ مولانا ہندوستان سے کابل حضرت شیخ الہند کے بھیجے ہوئے گئے تھے اور ان کے ایک خاص مشن کے سفیر و مبلغ بنکر ۔ پھر وہاں کیا حالات پیش آئے کہ مولانا کو آخر کار افغانستان کی اقامت بھی ترک کرنی پڑی ؟ اس سلسلہ میں ایک بات بالکل ظاہر ہے اور خود مولانا نے بھی اپنی تقریروں میں اس کا بارہا ذکر کیا ہے کہ ان کو قیام افغانستان کی طویل مدت میں اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس پین اسلامزم کی بنیاد پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی عمارت قائم کرنا چاہتے تھے وہ اب ایک " دیوانہ کا خواب " ہوکر رہ گیا ہے ۔ اور جن سے توقع تھی کہ وہ مسلمانانِ ہند کی خستگی اور جراحتِ دل کی داد " دینگے وہ غریب خود ہندوستان کے بدنصیب مسلمانوں سے بھی زیادہ " خستہ تیغ ستم " ہیں اور سب کے سب اپنے اپنے ملکی و وطنی معاملات و مشکلات کے حل کرنے میں اس درجہ سرگرداں وپریشاں ہیں کہ انھیں اپنے کسی دوسرے ملک کے برادرانِ ملت کے معاملات پر غور کرنے اور ان سے دلچسپی لینے کی فرصت ہی نہیں ہے ۔ مولانا نے ٹرکی کے عزلِ خلافت سے پہلے ہی اس حقیقت کو روز روشن کی طرح محسوس کرلیا تھا ۔ لیکن بعد کے تجربات نے خود ہندوستان کے بھولے بھالے مسلمانوں کو بھی آخر کار اس حقیقت کا یقین دلادیا ۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بنہایت درد وکرب سے

---

[1] ہماری جماعت میں حضرت شیخ الہندؒ کے نامور تلامذہ کی نسبت یہ مشہور ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی حضرت شیخ الہندؒ کے دماغ تھے ۔ مولانا شبیر احمد عثمانی آپ کی زبان اور مولانا حسین احمد اور مولانا عزیز گل وغیرہا آپ کے دست و پا تھے ۔

محسوس کیا کہ انھوں نے ترکوں کی محبت میں اپنا سب کچھ کس طرح بے دریغ لٹایا اور خرچ کیا۔ لیکن ترک کے نوجوان نے اس کا کیا جواب دیا۔ یہاں تک کہ ان فیاضیوں۔ قربانیوں اور ایثار و فداکاری کے جواب میں ان غریبوں نے خود "غلامی" کے طعنے سنے اور ان کو بصد حسرت و افسوس کہنا پڑا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

مسلمانانِ ہند کے اس تلخ احساس کو ایک مرتبہ مولانا محمد علی مرحوم نے مصر میں تقریر کرتے ہوئے ایک نہایت بلیغ فقرہ میں ظاہر کیا تھا۔ مولانا نے فرمایا "اے مصر وادیِ نیل کے مسلمانو! خوب یاد رکھو۔ تمہاری سرزمین کو فرعون سے بھی نسبت ہے اور حضرت موسیٰ سے بھی۔ پس اگر تم کو حضرت موسیٰ پر ناز و فخر ہے تو تم ہمارے بھائی ہو۔ لیکن اگر تم فرعون کو اپنے لئے سرمایہ افتخار سمجھتے ہو تو ہم کو تم سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔" ترکی جس نیشنلزم کا شکار ہوا۔ مصر، عراق و عرب اور ایران و افغانستان بھی اسی نیشنلزم کے نخچیر تھے۔ اور اب اتحاد اسلامی کی بنیاد پر کام کرنے کے تمام امکانات خاکِ مایوسی و ناامیدی میں دفن ہو چکے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی جس ذہنِ بیدار، دماغ روشن اور ہمتِ بلند کے مالک تھے۔ اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ ان مایوسیوں میں ولولہ و عزم کار کے شعلوں کو سرد کر کے بیٹھ جاتا اور دل کو تسلی دینے کے لئے کسی خانقاہ میں بیٹھکر سبحہ گردانی پر قناعت کر لیتا۔ ایک سپاہی کا کام یہ ہے کہ وہ ایک مورچہ پر شکست کھاتا ہے تو اپنے لئے دوسرا مورچہ پسند کر لیتا ہے۔ اس کا اگر ایک ہتھیار کند اور ناکارہ ہو جاتا ہے تو وہ جھٹ دوسرے ہتھیار سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ زندگی جدوجہدِ مسلسل کا ہی نام ہے اور موت سکون کے سوا اور کچھ نہیں۔

مولانا کو قدرت نے جو دیدۂ بینا اور چشمِ حقیقت نگر عطا فرمائی تھی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ دریا میں طغیان و سیلاب کا تموج دیکھکر لبِ ساحل آنکھیں بند کئے بیٹھے رہنا اور پسرِ نوح کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پر بھروسا کرنا قرینِ دانشمندی اور شیوۂ مصلحت شناسی نہیں ہے۔ مولانا نے محسوس کیا کہ جنگِ عظیم نے دنیا کی تہذیب و تمدن کے نقشے بدل دیئے ہیں۔ ایشیا پر یورپ کے سیاسی اقتدار کا پنجہ مضبوطی سے جم گیا ہے۔ نظاماتِ کہن کی قبا پارہ پارہ ہو گئی ہے۔ پرانا فلسفہ۔ پرانی روایات اور پرانا اندازِ تخیل سب انقلاب کی طوفانی موجوں میں خس و خاشاک کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں۔ مولانا کی زندگی کا مشن صرف اعلاءِ کلمۃ اللہ اور دینِ حق کی سربلندی و سرافرازی تھا۔ اور اسی مقصد کو لیکر

وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تھے۔ لیکن یہ مقصد حاصل ہو تو کس طرح؟ اس کا جواب آسان نہیں تھا۔ البتہ ایک بات بالکل صاف طور پر واضح ہو گئی تھی کہ اگر مادیت کے اس بے پناہ فروغ کے وقت مسلمانوں نے پرانا مورچہ بدلکر کوئی نیا مورچہ نہیں بنایا تو ان کی موت یقینی ہے۔ قدرت کا اٹل فیصلہ ہے:
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ یعنی

خدانے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی — نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قدرت کا یہ فیصلہ سب کے لئے ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس میں مسلمان۔ یہودی عیسائی اور پارسی کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارکہ وحسنہ بھی آپ کے سامنے تھا کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال مکہ میں گذارے۔ پھر مدینہ کی طرف ہجرت کر کے اور وہاں مقیم ہو کر وہاں کے بااثر قبیلوں سے معاہدہ کر کے اسلام کی مخالف طاقتوں سے جنگ کی اور اور اس طرح مسلمانوں کو اس بات کا سبق دیا کہ کوئی عقیدہ خواہ کتنا ہی اچھا ہو اور اس پر ایمان رکھنے والے کتنے ہی مخلص اور فداکار ہوں بہرحال اس کو دنیا میں زندہ رکھنے اور طاقتور بنانے کے لئے پہلی شرط حسن تدبیر ہے۔ اگر کام حسنِ تدبیر کے ساتھ کیا گیا ہے تو پھر بدر و حنین کے معرکوں میں فرشتے بھی آتے ہیں اور جماعتِ حقہ کی مدد کرتے ہیں۔ اور اگر تدبیر میں فروگذاشت ہو جائے تو غزوۂ احد کی طرح اس کا خمیازہ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس بنا پر مولانا نے اس بات کا تو فیصلہ قطعی طور پر کر لیا کہ اب پرانے مورچوں پر جا رہنا عقل و مصلحت اور خود اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ لامحالہ دوسرا مورچہ بنانا ہے اور اس پر کھڑے ہو کر اسلام کی تمام مخالف طاقتوں کو دعوتِ مبارزت دینا ہے۔ لیکن یہ دوسرا مورچہ کیا ہو اور اس کی تشکیل کس طرح پر کی جائے؟ اس کے لئے ضرورت تھی کہ پہلے اسلام کی مخالف طاقتوں کا پوری حاضر حواسی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور ان تمام عوامل و موثرات کا دیدہ وری کے ساتھ مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے۔ جنھوں نے ان مخالف طاقتوں کے میگزین میں جادو کی سی تاثیر پیدا کر دی ہے اور جن کی وجہ سے وہ تمام دنیا پر چھاتی چلی جا رہی ہیں۔ اور ان کے بالمقابل "عراق و ہمدان" کا مسلمان غریب "نوائے سوختہ در گلو" اور "پریدہ رنگ و رمیدہ بو" ہو کر رہ گیا ہے۔

مولانا نے ان چیزوں سے واقفیت کے لئے آجکل کے ہمارے عام مفکرین و متکلمین اسلام کی طرح صرف اخبارات اور کتابوں کے پڑھ لینے کو کافی نہیں خیال کیا اور نہ ان کی ہمتِ مردانہ کبھی اس کو گوارا کر سکتی تھی۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ خود ان ملکوں میں جا کر جہاں نئے مادی فکر کے اسلحہ ڈھل رہے تھے۔

قریب سے ان کا مطالعہ کرنا چاہئے اور یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ان مادی افکار و نظریات کی ساخت میں کتنے اجزا اجزائے صالحہ ہیں جن کو خود ہمیں اختیار کرنا چاہئے اور کتنے اجزا اجزائے فاسدہ ہیں جن کو کاٹ کر ہم اپنے لئے امن و حفاظت کا سامان مہیا کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں نے تاریخ کے گذشتہ ادوار میں یہی کیا ہے اور اسی طرح وہ اپنی ہستی کو مختلف احوال و شئون میں برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ حقیقتوں سے آنکھ بند کر لینا اور اپنے خیالات کی تنگ اور محدود کوٹھڑی کو ہی کائنات کی وسیع فضا سمجھ لینا زندگی نہیں بلکہ موت کا پیغام ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکیگا حریفِ سنگ

لیکن یہ وہ نکتہ ہے جو اسلام کی نسبت جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والوں اور "سجۂ سجادہ" کو ہی عین اسلام سمجھنے والوں کے دماغ کی رسائی سے بہت بلند ہے۔

مسلمانوں نے پہلے بھی "خذ ما صفا دع ما کدر" پر عمل کیا ہے اور اب بھی اگر وہ اپنی ہستی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس پر عمل کرنے سے مفر نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ جذبہ تھا جس نے مولانا کو ترکِ افغانستان پر مجبور کیا۔ اور آپ یہاں سے روانہ ہو کر ماسکو آئے، ترکی پہنچے اور دوسرے یورپین ملکوں میں کچھ دن رہے۔ ماسکو میں اس وقت انقلاب کے ہاتھوں سے ایک نئے نظام فکر و تمدن کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ یہاں رہ کر ایک دیدہ ور مفکرِ اسلام کو غور کرنا تھا کہ وہ کیا کیا خرابیاں اور کمزوریاں تھیں جو زار کی شہنشاہیت کو گرد و غبار بنا کر لے اڑیں اور وہ کیا اسباب و عوامل ہیں جن کی وجہ سے انقلاب کامیاب ہوا۔ نیز یہ کہ اس انقلاب کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں اور دنیا کے مختلف گوشوں پر اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ اس کے محاسن کیا ہیں اور معائب کیا؟ پھر اس مفکر نے اس پر بھی غور کیا کہ اسی طرح کا اگر کوئی اسلامی انقلاب کسی ملک میں پیدا کیا جائے تو اس کی صورتِ حال کیا ہونی چاہئے۔ اور بنیادی طور پر اس کا خاکہ کیا ہوگا؟ اس مقصد کے لئے مولانا نے ماسکو کا قیام ایک سال تک کے لئے وسیع کر دیا۔ اور اس مدت میں وہاں کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا۔ جو لوگ اس انقلاب کے امام تھے ان سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے افکار و خیالات سے واقف ہو کر اس انقلاب کے پس منظر کا علم حاصل کیا۔ ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ اس کا کھرا کھوٹ معلوم کیا۔ عصری رجحانِ ذہنی کا بکمالِ دانشمندی جائزہ لیا۔ اور سب سے آخر میں اس کا کھوج لگایا کہ انقلاب کی اس عمارت میں کہاں کہاں رخنے ہیں۔ جن کو بند کر کے اس کو اپنایا جا سکتا ہے اور

اسلام کی حفاظت کے لئے اس کو ایک مضبوط و محفوظ قلعہ کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ترکی جو مسلمانوں کی امیدوں کا ایک آخری سہارا تھا۔ مولانا نے اس کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پھر ان سب تجربات اور افکار کو لئے ہوئے اسلام کے حرم محترم (حجاز) میں آکر مقیم ہو گئے۔ تاکہ جو کچھ بھی انھوں نے ان ملکوں میں دیکھا اور محسوس کیا تھا ان سب کو پیش نظر رکھکر مسلمانوں کی بحالی اور اسلام کی سربلندی کے لئے ایک مکمل خاکہ اور نظامِ فکر و عمل تجویز کریں جو نہ صرف کسی ایک ملک کے مسلمانوں کی حالت کو بدل دے۔ بلکہ اسلام کو دنیا کی عظیم الشان طاقت بنا دے۔

اگر کوئی اور جلد باز اور سریع الانفعال شخص ہوتا تو وہ ان حالات میں اعتدال کی راہ پر مشکل ہی قائم رہ سکتا تھا۔ یورپ کی مادیت کا فروغ۔ ترکی کا جدید انقلاب۔ روس میں اشتراکیت کی شاندار فتح۔ یہ سب چیزیں ایک ایسے شخص کو مرعوب و متاثر کرنے کے لئے کافی تھیں جو نہ کسی عربی مدرسہ کا مدرس تھا نہ کسی خانقاہ کا پیر طریقت تھا۔ نہ کسی اسلامی جماعت کا امیر تھا۔ اور نہ اس کے پیچھے مریدانِ باصفا کا ایک انبوہِ کثیر تھا۔ وہ ان تمام دینی اور مذہبی حیثیتوں سے بالکل الگ اور دور تھا۔ خود آزاد تھا اور اپنے دوش پر کسی کی مسئویت کا بار نہ رکھتا تھا۔ اس بنا پر بہت ممکن کیا بلکہ اغلب تھا کہ وہ عصرِ حاضر کے ان جھوٹے نگینوں کی آب و تاب سے مرعوب ہو کر کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھتا جو سراسر غیر اسلامی ہوتا۔ جو شخص اپنے خاندانی مذہب کو تمام عوائق و موانع کے باوجود تبدیل کر دینے کی جرارت کر سکتا ہے وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ نئے اختیار کردہ مذہب کا طوق غلامی بھی اپنی گردن سے اتار کر پھینک دیتا علی الخصوص جبکہ دنیا بھر کی خاک چھاننے کے بعد اس پر یہ حقیقت بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ اس مذہب کے پیچھے کوئی سیاسی طاقت بالکل نہیں ہے اور اب یہ صرف مسجد و خانقاہ کا مذہب بن کر رہ گیا ہے۔ جس کی بنا پر شاعرِ ملت اقبال کو کہنا پڑا تھا۔

به بندِ صوفی و ملا اسیری   حیات از حکمتِ قرآں نگیری
ز آیاتش ترا کارے جزیں نیست   کہ از یٰسیں او آساں بمیری

مولانا عبید اللہ سندھی کی سلامتِ فطرت صحتِ ذوق اور استقامت علی الاسلام کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہو گی کہ وہ ان تمام حالات و مشاہدات سے بنفس نفیس براہِ راست دوچار ہوتے ہیں اور پھر جو چیز قیامِ دیوبند کے زمانہ میں ان کے فکر کا مرکز تھی۔ یعنی قرآن و سنت اور حجۃ اللہ البالغہ وہی اب بھی مرکزِ فکر ہے۔ اس میں سرمو انحراف نہیں آیا ہے۔ چنانچہ وہ جس طرح حضرت شیخ الہند کے سامنے عقیدۃً و عملاً مسلمان تھے اسی طرح اب بھی مسلمان تھے۔ نماز روزہ کی پابندی اور روزانہ

قرآن مجید کی تلاوت وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اپنی ظاہری شکل وصورت اور عالمانہ وضع قطع میں بھی فرق نہیں آنے دیا۔[1]

مولانا کے افکار وآراء کا مطالعہ کیجئے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کو پڑھئے۔ جلوت وخلوت میں ان کی گفتگو میں سنئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہیگل اور مارکس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ لینن۔ ٹالسٹائی اور میکسم گورکی کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اگر تذکرہ ہے تو قرآن وسنت کا ہی، ذکر وبیان ہے تو حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شیخ الہند ہی کا۔ وہی ایک مرکز ہے جس کے اردگرد مولانا کے افکار گردش کرتے رہتے ہیں۔ وہی ایک سرچشمہ ہے جہاں سے ان تمام افکار کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ آپ مولانا کے استدلال واستنتاج سے اختلاف کرسکتے ہیں۔ ان کے نتائج غور وفکر کو غلط قرار دے سکتے ہیں لیکن یہ بہرحال ماننا ہی ہوگا کہ مولانا نے اپنے افکار کی بنیاد غلط یا صحیح مغرب کے کسی فلسفی کے اقوال وآراء پر نہیں رکھی ہے بلکہ ان کا اصل منبع وہی ہے جو ایک مسلمان کا ہونا چاہیے۔

مولانا نے یورپ کے جدید ذہنی رجحانات۔ نئے انقلابی جذبات کا جو مطالعہ کیا ہے وہ ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے کیا ہے اور مولانا یورپ کے جن ملکوں میں رہے ہیں اور وہاں کی مادی ترقیات کا مشاہدہ کیا ہے تو اس جاسوس کی طرح کیا ہے جو دشمن کے ملک میں اس کے انتظامات اور قلعہ بندیوں کا سراغ لینے آتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے ملک والوں کو ان سے آگاہ کرکے ان کے خلاف اپنے آپ کو مضبوط اور محفوظ بنانے پر آمادہ کردے۔

مولانا نے حضرت شیخ الہند کی معیت وصحبت میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور دوسری کتابوں کا بڑے تعمق نظر سے مطالعہ کیا اور بعض جگہ ان کا درس بھی دیا تھا۔ اس لئے مولانا کو ان پر عبور تام حاصل تھا۔ اور ان کتابوں سے خاص انس اور دلچسپی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا عہد مسلمانوں کے انحطاط کا عہد تھا۔ برائے نام مسلمانوں کی حکومت ضرور تھی۔ ورنہ درحقیقت شہنشاہیت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ اس وقت بھی قائم تھی اور مسلمانوں میں وہ تمام اعتقادی اور عملی کمزوریاں پائی جاتی تھیں جو آج ان میں موجود ہیں۔ اس بنا پر ضروری تھا کہ شاہ صاحبؒ

---

[1] اس سلسلہ میں یہ بات لائق ذکر ہے کہ مولانا ہندوستان میں آنے کے بعد برہنہ سر رہتے تھے۔ یہاں تک کہ نماز بھی بسا اوقات اسی طرح پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ دہلی میں جامع مسجد کے قریب ہم میں سے ایک صاحب نے مولانا سے اس کے متعلق استفسار کیا تو کچھ حسرت اور کچھ غصے کے لہجہ میں فرمایا "میری ٹوپی تو اسی دن اتر گئی جس دن دہلی کا لال قلعہ مجھ سے چھین لیا گیا اب یہ بے غیرتی کی بات ہے کہ میں اپنا قلعہ واپس لئے بغیر سر پر ٹوپی رکھوں"

لیے مجدد امت کی تصنیفات میں ان تمام خرابیوں کی اصلاح اوران کو دور کرنے کی تدبیروں کا تذکرہ ہونا۔ چنانچہ مولانا نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تصنیفات میں ان چیزوں کو پالیا اوران پر برابر غور کرتے رہے۔ اب ماسکو۔ ٹرکی اور دوسرے یورپین ممالک میں تجربات حاصل کرنے کے بعد قرآن کے مہبط اول (مکہ) میں آکر بیٹھے تو آپ نے قرآن اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ کی ہی رہنمائی میں موجودہ بین الاقوامی حالات میں اسلام کی مشکلات کا جو حل سوچا تھا اس کو علمی اعتبار سے مرتب کرنا شروع کردیا۔ ان افکار کا تعلق چونکہ اولاً ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا اس لئے جب آپ کو موقع ملا۔ آپ ان کو لئے ہوئے ۱۹۳۹ء میں ہندوستان آگئے اور یہاں ان کی تبلیغ واشاعت تادم آخر کرتے رہے۔

بات ذرا طویل ہوگئی لیکن مولانا کے افکار وآراء پر بحث کرنے سے قبل مولانا کی شخصیت کو اُجاگر کرنا ضروری تھا تاکہ قارئین کرام کو ان افکار کا پس منظر معلوم کرنے کے بعد خود افکار کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

مولانا کی شخصیت پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ مختلف ملکوں میں پھرتے رہنے اور وہاں کے حالات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے سے مولانا کے افکار میں جو اسلام کے احیائے متعلق تھے وقتاً فوقتاً تبدیلی ضرور پیدا ہوتی رہی لیکن ان کا بنیادی نقطۂ فکر جس کی اساس قرآن مجید اور ائمۂ اسلام کے افکار تھے کسی حالت میں نہیں بدلا۔ وہ عمر بھر اسلام کے لئے ہی زندہ رہے اسی کے لئے مجاہدانہ وار دنیا بھر کے مصائب برداشت کئے اور اسی پر ان کی وفات ہوگی۔

لیکن ہمارے دوستوں کے نزدیک وہ پھر بھی "یورپ کی مادیت کا لوہا ماننے والے" "ہندوستانی قومیت کے پرستار" "وطن پرست" اور خدا جانے کیا کیا ہیں۔ مولانا مسعود عالم کے نزدیک مولانا سندھی کی عمر بھر کی تگ ودو اور محنت وکاوش کا حاصل یہ ہے کہ "وہ اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجونِ مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں"۔ (ص ۱۷۳)

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے ایک جواب میں

جناب ناقد نے مولانا کو صرف یہی خطابات دینے پر کفایت نہیں کی۔ ایک جگہ (ص ۱۷۹) آپ ان کو ظالم اور اس بنا پر قرآن مجید کی وعید "وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون" کا سزاوار بتاتے ہیں۔ تنقید کی عدالت کے قاضی کا یہ فیصلہ بھی عجیب ہے کہ ایک طرف عبیداللہ سندھی جس نے ساری عمر اسلام کے لئے جہد ومشقتیں برداشت کیں "ظالم" اور دوسری طرف اقبال "عارف لاہوری" (ص ۱۷۸)

سچ ہے۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃٌ کما ان عین السخط تبدی المساویا

مولانا اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور اب ان کا معاملہ ان کے خدا کے ساتھ ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ مولانا ظالم ہیں یا ان کو ظالم کہنے والے خود ظالم ہیں۔ لیکن ہم یہ ضرور پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر "عارف" ہونے کے لئے عمل درکار نہیں ہے اور صرف حکیمانہ اشعار کہہ دینا اور لکھنا ہی کافی ہو تو مرزا غالب نے کیا قصور کیا تھا کہ ہم ان کو باوصف "بادہ خوری" مسائل تصوف کے بیان کرنے پر "ولی" نہ مان لیں۔ یہ صحیح ہے کہ "حُبُّكَ الشيءَ يُعمي ويُصِمّ" لیکن ایک عالم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ قرآن کا حکم ہے۔

لا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ	کسی قوم کا بغض تم کو بے انصافی پر
ان لا تعدلوا۔	مجبور نہ کرے۔

یہاں تک مولانا کی شخصیت سے متعلق گفتگو تھی اب آئندہ صحبت میں ہم مولانا کے افکار سے مفصل بحث کریں گے۔ (باقی آئندہ)

تلخیص و ترجمہ

قازان کے مسلمان

از سید محمد زاہد قیصر رضوی

روس کے وسیع ملک میں جس کو موجودہ عہد میں اپنے خاص سیاسی و اقتصادی نظام کے باعث کافی شہرت میسر آگئی ہے، بہت سی مسلمان قومیں قدیم زمانہ سے آباد ہیں اور مختلف شہروں میں منتشر طور پر سکونت رکھتی ہیں۔ ان مسلمان قوموں کا روس میں کب اور کیسے داخلہ ہوا؟ اس باب میں مورخین کا شدید اختلاف ہے۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ سب سے پہلے جس قوم نے روس میں آکر رہائش اختیار کی وہ بلگیرین قوم ہے، جو روس کے اقصائے شمال میں آباد تھی۔ اس وقت بلگیریا کی آبادی صرف ایک قوم پر مشتمل نہیں ہے بلکہ سسلیبی، ترکی، یورپین اور فینشین چار مختلف اقوام کا ایک مخلوط ہے جو ابتدائً گولیا اور یوریل کے ساحلوں پر فروکش ہوئی۔ مرور زمانہ سے آبادی میں اضافہ ہونے کے باعث بستیوں میں بھی وسعت ناگزیر تھی۔ آبادی کے پھیلاؤ کا اندازہ اس کے حدود اربعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ شمال میں روس کی سرحد، جنوب میں بحیرہ کاسپین، مشرق میں کوہِ یوریل اور مغرب میں نجنی نوو گروڈ کے قریب یوگا اور گولیا کے سنگم تک بلگیرین آبادیاں اور بستیاں پھیلی ہوئی تھیں اور صرف یہی ایک قوم ان تمام شہروں میں رہتی تھی جن میں بعد کو تاتاری، تازائی اور دوسری مختلف قومیں آباد ہوئیں۔

بلگیریوں کا پایۂ تخت بلگیریا تھا جو مغربی اور مشرقی تہذیبوں کا نقطۂ اتصال ہے۔ اسی وجہ سے بلگیرین قومیں مشرق و مغرب کے مابین ایک تمدنی رابطہ سمجھی جاتی تھیں۔ بلگیرین جفاکشی اور مستعدی میں بہت زیادہ مشہور تھے اور زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت میں بڑی محنت کرتے تھے روسی تاجر بلگیریا آتے تھے اور اپنی مصنوعات کے عوض وہاں کی تجارتی اشیاء لیکر واپس لوٹ جاتے تھے۔ بلگیریا کی تجارت کا بیشتر حصہ کھالوں کی عمدہ پائیدار اور خوش منظر اشیاء پر مشتمل ہوتا تھا۔ نیز بخارا کے راستہ سے ایران سے مشرقی ممالک کی مصنوعات بھی بلگیریا پہنچتی رہتی تھیں۔

بلگیریا میں اسلامی ممالک کی سرحد پر آباد ہونے اور تجارتی سلسلہ میں مشرقی ممالک اور مسلمانوں سے تعلقات اور آمد و رفت کے باعث تیسری صدی ہجری میں اسلام سے تاثر شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ملک کے تمام باشندے شرفِ اسلام سے بہرہ اندوز ہوگئے۔

بلگیرین قوموں کے مسلمان ہوجانے کے بعد ان کے تاجدار الماس خاں نے ایک قاصد دار الخلافہ بغداد روانہ کیا۔ اور خلیفہ سے درخواست کی کہ علماء و فقہا پر مشتمل ایک وفد بھیجدیجئے جو قوم کو مذہبی شعائر اور احکام اسلامیہ کی صحیح تعلیم سے آشنا کرسکے۔ نیز کچھ انجنیر کاریگر اور صناع روانہ کیجئے تاکہ ملک کے گرداگرد ایک مستحکم شہر پناہ بنادی جاسکے اور غیر مسلم سلاطین و ممالک سے ہم اپنا تحفظ کرسکیں۔ قاصد نے بغداد پہنچکر خلیفہ عباسی مقتدر باللہ کی خدمت میں وہ گرانقدر ہدایا پیش کئے جن کو بادشاہ نے خلیفہ کی نذر گذرانے تھے۔ خلیفہ نے بادشاہ کی درخواست کو قبول کیا اور جواب میں ایک قاصد روانہ کیا اور اس کے ساتھ چند مستند علماء و فقہا اور تعمیر کے لئے بہت سے ماہر انجنیر اور معمار روانہ کئے۔

یہ وفد ۱۱ر صفر ۳۰۹ھ مطابق ۲۱ر جون ۹۲۱ء کو بغداد سے روانہ ہوا اور بخارا و خوارزم کی راہ سے ۱۲ر محرم ۳۱۰ھ (۱۲ر مئی ۹۲۲ء) کو دار السلطنت بلگیریا میں داخل ہوا۔ ملکی باشندوں نے معزز مہمانوں کا پرجوش خیر مقدم کیا اور بہت سا چاندی سونا ان پر نچھاور کیا۔

بغداد سے آنیوالے اس وفد میں سب سے بہتر عالم علامہ احمد بن فضلان بغدادی تھے۔ خلیفہ نے ان کو روانگی کے وقت ہدایت کی تھی کہ سفر کی مفصل کیفیت بلگیریا اور اس کے قرب و جوار کے ممالک و اقوام کے حالات، ان کی عادات و خصائل، زبان و مذہب، معاشیات و اقتصادیات۔ معاشرتی خصائص اور دیگر اہم کوائف بسط و تشریح کے ساتھ لکھیں۔ نیز دن و رات کے گھٹنے بڑھنے کی تدریجی مقدار، غایت حزم و احتیاط اور غور و تدبر کے ساتھ قلمبند کی جائے۔ اس کے ماسوا روانگی کے وقت سے دار الخلافہ کی مراجعت تک کے پیش آمدہ اہم واقعات کی تشریحی یادداشت تیار کی جائے۔ ابنِ فضلان نے خلیفہ کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور بلگیریا، خوارزم، روس اور دیگر ممالک و اقوام کے تفصیلی حالات قلمبند کئے اور رسالہ ابن فضلان کے نام سے سفر کی ایک مکمل یادداشت مرتب کی۔ لیکن یہ سفرنامہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا اور ضائع ہوگیا۔

اس وفد کے ذریعہ سے بلگیریا اور بغداد کے مابین تعلقات کا آغاز ہوا، یہ خوشگوار تعلقات ہمیشہ قائم رہے اور ہمیشہ سلاطین بلگیریا خلفا سے اطاعت و نیازمندی کے ساتھ پیش آتے رہے۔ فی الحقیقت بغداد سے آمدہ وفد کے باعث بلگیریا کے باشندے اسلام کی صحیح روح سے آشنا ہوسکے اور ان میں

اسلامی تمدن و معاشرت نے اپنے گہرے نقوش مرتسم کئے۔ تمام ملک میں مذہبی علوم کا ذوق عام ہو گیا اور بلگیریا کی سرزمین سے بڑے بڑے جلیل القدر علما پیدا کئے۔ (محمود غزنوی کے استاد) شیخ احمد بلگیری۔ شیخ برہان الدین اور قاضی یعقوب بن نعمان جیسے اکابر علما کی بلگیریا ہی کی خاک پاک نے تربیت کی۔ ملک میں عربی تہذیب کے اتنے گہرے تاثرات تھے کہ وہ اپنی وطنی زبان کے املا میں عربی حروف استعمال کرتے تھے۔ اور ملکی رسم الخط عربی قرار دیدیا گیا تھا۔

بلگیریا کا یہ تابناک اسلامی دور تیرہویں صدی عیسوی کے وسط تک قائم رہا۔ بعدازاں ان میں انحطاط و زوال کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ حتی کہ پندرہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے بلگیرین اقوام کی جگہ تاتاری و قازانی اقوام آباد ہونا شروع ہوئیں۔ لیکن حملہ آور تاتاریوں نے بلگیریا کے نظم و ترتیب اور حیاتِ اجتماعی کو بحالہ برقرار رکھا۔ اور ان کے مذہب سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بدیں وجہ بلگیریا میں قومی حکومت کے زوال سے مذہب و دین نے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور قوم میں محکومانہ زندگی نے کوئی تغیر پیدا نہیں کیا بلکہ خود فاتحین نے ان سے مذہبی اثرات قبول کئے اور اسلام کے مقناطیس نے ان کو جذب کر لیا۔ اسی طرح بلگیریا کی اسلامی ثقافت قازانی حکومت کے عہد میں بھی تاراج نہیں ہوئی اور ملک کسی اجنبی تہذیب کے انقلاب سے آشنا نہ ہو سکا۔ قازان کے ترکوں میں بھی اسلامی جذبہ زیادہ شدید تھا اور وہ مذہب کو بہت عزیز رکھتے تھے شعائر اسلام کی ترویج میں انتہائی سرگرم تھے۔ چنانچہ ہر آبادی میں کم از کم ایک مسجد تعمیر کرنا ازحد ضروری سمجھتے تھے۔ مسجد کے قریب ایک مدرسہ ہوتا تھا جس میں وہ اپنے بچوں کو علوم دینیہ کی تعلیم دلاتے تھے۔

حکومتِ قازان میں شیخ الاسلام کو "سید" کے باعظمت لقب سے موسوم کیا جاتا تھا۔ "سید" حکومت کے معاملات میں بہت زیادہ دخیل ہوتا تھا۔ دوسرے ممالک سے قازان کے جو معاملات و معاہدات ہوتے تھے ان پر بادشاہ کے ساتھ ساتھ "سید" کے دستخط ناگزیر سمجھے جاتے تھے۔ پیچیدہ سیاسی ملکی معاملات میں اس کو سفیر بنا کر ممالک غیر میں بھیجا جاتا تھا۔ اعزاز کے اعتبار سے بادشاہ کو مستثنےٰ قرار دینے کے بعد "سید" کی شخصیت" سب سے زیادہ باا حترام و بااختیار خیال کی جاتی تھی۔ حتی کہ بادشاہ کے دارالسلطنت میں موجود نہ ہونے کے وقت وہی بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور ملک کا نظم و نسق اسی کے ذریعہ عمل میں آتا تھا۔ اسی کے حسب منشا تمام مذہبی امور انجام پاتے تھے اور وہ ان میں قطعاً آزاد تھا۔ حتی کہ بادشاہ کا استصواب بھی ضروری نہیں ہوتا تھا۔ الغرض

قازانی حکومت میں عوام اور حکومت دونوں "سید" کا اس کے جلیل القدر عہدے کے مناسب بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔

~~~~~~~~

۱۵۵۲ء میں جب جار رابع نے قازان پر اپنا تسلط و اقتدار قائم کرلیا تو قازانی مسلمانوں کے ساتھ اس نے سخت رویہ برتا اور ان کی مذہب و معاشرت کو تباہ و برباد کردینے اور اس کی بجائے اپنی تہذیب پھیلانے کی سخت جدوجہد کی۔ لیکن قازانی مسلمان گرنے کے بعد بہت جلد سنبھلے اور بہت ہی تھوڑے وقفہ میں حکومت کے حاکمانہ اثرات سے بالکل آزاد ہوگئے اور انھوں نے اپنے شکستہ نظام کی اصلاح کرنے میں سعی بلیغ سے کام لیا۔ لیکن حکومت ماسکو جار رابع کے اس ظالمانہ رویہ کو پسند کرتی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ مسلمان حکومت کی تہذیب کو قبول کرلیں۔ اسی وجہ سے عیسائی مبلغین جو تبلیغ عیسائیت کے لئے اسلامی ممالک میں بھیجے جاتے تھے۔ ان کو خاص طور پر قازان کی نشاندہی کردی جاتی تھی اور جار رابع اور حکومت ماسکو کی دلی خواہش سے ان کو مطلع کیا جاتا تھا، لیکن ان سب حالات کے باوصف مسلمانوں نے مذہبی احکامات و شعائر اسلام کا پورا پورا احترام اور حفاظت کی۔ اور علما کے اخلاصِ عمل اور جدوجہد سے اس میں کامیاب ہوئے لیکن علما کے یہ تمام تر تحفظات آنیوالے مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے، حکومت باوجود جدوجہد اپنی مساعی میں ناکام رہی تھی۔ اس لئے مسلمانوں سے ناقابل برداشت رویہ برتنا شروع کردیا۔ مسلمانوں نے بھی صبر و شکیب اور غایتِ تحمل سے کام لیا اور مجبور ہوکر خدا کے نام پر قازان سے ہجرت کرنا شروع کردیا اور کاسپین کے ساحل یورپ کی وادی قرمز و قازان کے بیابان اور ترکستان کے جس حصۂ زمین میں ان خانماں برباد مظلوم مسلمانوں کو رہنے کے لئے کوئی پر سکون جگہ مل سکی وہیں زندگی کے دن پورے کرنے کے لئے رہ پڑے۔ مسلمانوں نے پوری سترہویں صدی اور اٹھارویں صدی کے ابتدائی سنین اسی طرح کس مپرسی میں بسر کئے اور اسی مظلومیت و بے کسی میں ایک صدی سے زائد کا عرصہ اسلام و مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے غربت و بیاباں نوردی میں گذار دیا۔ یہانتک کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں روسی حکومت نے مسلمانوں کو کچھ سہولتیں اور مراعات دیں اور مسلمانوں نے روس کے مختلف شہروں میں موطن اختیار کرنا شروع کردیا۔ مسلمانوں نے پھر تجارت شروع کردی۔ اور ان کے تجارتی قافلے گویلاسے بخارا تک بکثرت آمدورفت کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی کے ربع اول میں مسلمان وہاں بہت دولتمند اور ایک اہم تجارتی قوم خیال کی جانے لگی تھی
~~~~~~~~

مسلمان اپنے ان تجارتی سفروں میں ایک بہت بڑا اہم علمی و مذہبی کام کرتے تھے۔ جب کوئی تاجر اپنے وطن سے تجارت اور کاروبار کے سلسلہ میں بخارا کا سفر کرتا تھا تو اپنے شہر کے طلبا میں سے ایک ذہین طالب علم کو اپنے ہمراہ سفر میں لیجاتا تھا اور استفادہ و تعلیم کے لئے بخارا کی کسی درسگاہ میں داخل کر دیتا تھا (اسوقت بخارا میں باوجود بہت سی کمزوریوں و نقائص کے چھوٹی بڑی درسگاہیں کافی تعداد میں موجود تھیں جن میں مذہبی اور دینی تعلیم بہت خوبی و عمدگی سے دیجاتی تھی) یہ طلبا تعلیم سے فارغ ہو کر جب وطن واپس ہوتے تھے تو اپنے قازانی مسلمان تاجروں کو جن کے کاروبار ایشیا اور یورپ میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے ان کے لئے اپنے سرمایہ سے بڑے بڑے مدارس کا انتظام کرنا ہوتا تھا ان تعلیم گاہوں میں جو طلبہ حصولِ تعلیم کے لئے آتے تھے ان کے جملہ اخراجات کے تکفل اور بیدرسہ کے دیگر مصارف کے ذمہ دار بھی قازانی تاجر ہی ہوتے تھے۔ بڑے شہروں کے علاوہ قصبوں، گاؤں اور چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھی اسی قسم کے مدارس اور تعلیم گاہیں موجود تھیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قازان اور اس کے ملحقہ اسلامی ممالک میں متعدد بڑی درسگاہیں قائم ہو گئیں تھیں اور چھوٹے چھوٹے مدارس تو بے شمار تھے۔ ان تعلیم گاہوں سے ہزاروں علما پیدا ہوئے۔ جن سے اصلاح و تبلیغ کا گرانقدر کام سرانجام کو پہنچا۔ اس نظامِ تعلیم سے قوم کو بہت فائدہ پہنچا اور ان درسگاہوں کے ذریعہ ایسے علما ملک کو میسر آسکے جنھوں نے تمام ضروری علوم میں واقفیت بہم پہنچائی لیکن صرف شرح شمسیہ اور عقائد نسفی ہی کے مباحث میں الجھ کر نہیں رہ گئے۔ اور محض شروح و حواشی کے لکھنے لکھانے اور انہی پر مناظروں میں عزیز عمریں ضائع نہیں کیں۔ بلکہ دوسرے ممالک میں پہنچے اور اپنے علم سے صحیح کام لیا۔

شاید یہ تعلیمی اسکیم ایک نئے آنیوالے دور کے لئے تمہید و مقدمہ کا کام دے اور بہت ممکن ہے کہ اس عہد نو کو پیدا کرنے والے انہی لوگوں کے فیض یافتہ ہوں جنھوں نے ان درسگاہوں سے ایک خاص نظریہ و فکر کے تحت علم سیکھا تھا۔

ادبیات

مجلسِ روحانیاں کے حضور

دیوبند کے ایک قبرستان میں جہاں مولٰنا محمد قاسم اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب وغیرہ کے مزارات ہیں

از جناب احسان دانش

اللہ اللہ اس زمیں کی کس قدر توقیر ہے
صرف روحوں کے لئے گنجائشِ تقریر ہے

میں تمہیں زندہ سمجھتا ہوں بایں وصفِ حیات
ہیں اِدھر کے کارِ ناممکن اُدھر کے ممکنات

روح سے آگے بدن پرواز کر سکتا نہیں
وقت کی تقلید میں انسان مر سکتا نہیں!

وقت کے پہیے کو کچھ پیچھے ہٹانا ہے مجھے
قوم کے ماضی کو مستقبل بنانا ہے مجھے

گرچہ میرے شعر کی ہندوستاں بھر میں ہے دھوم
نطق کے کوسوں ہیں ناگفتہ خیالوں کے ہجوم!

ہے دعاؤں کا ابھی محتاج میرا ہر عمل
میرے منصوبوں کے پودے ہیں ابھی بے پھول پھل

فکر ہے میرا فقط میری بلندی تک رسا
حد سے باہر ہے تصور سے پرے کا راستا،

بخشدی ناکارگی اس عالمِ اسباب نے
میری شیرینی میں تلخی جھونک دی احباب نے

ورنہ میں اور اس قدر دیوانۂ رنگ و نمو
میرے سر پر بولتا ہے میری قسموں کا لہو

میری امیدوں کے رستے الحفیظ والاماں
کچھ کمیلوں کے لہو ہیں کچھ چتاؤں کا دھواں

مولوی بزدل ہے صوفی کیفِ قوالی میں مست
شاعروں کے ظرف ناقص شعر کا معیار پست

لیڈری گمراہ، مذہب ناتواں، حکمت علیل
جا بجا ٹوٹی ہوئی ناموسِ ہستی کی فصیل

گرچہ بے حد بار نے مرنے کی عادت ہی مجھے
پھر بھی روحانی توجہ کی ضرورت ہی مجھے!

عزمِ مستحکم، جلالِ خود نگر درکار ہے
اک دلِ آگاہ، اک بالغ نظر درکار ہے

اپنی حشر انگیز آوازیں عطا کر دو مجھے!
اپنے بازو اپنی پروازیں عطا کر دو مجھے!

تم سے ورثہ چاہتا ہوں سیرۃ و کردار کا　　صرف میں حقدار رہوں اس دولتِ بیدار کا!
اپنے ہاتھوں سے بساطِ غم الٹنی ہے مجھے
سر پھرے سنسار کی کایا پلٹنی ہے مجھے

مسلماناں! مسلمانی!

ازجناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ۔ ایبٹ آباد

بدانم مبہماتِ ایں و آں چندانکہ تو دانی　　ولیکن محکماتِ او نہ من خوانم نہ تو خوانی
رموزِ عشق و مستی را۔ تو ہم دانی کہ می داند　　نہ دانشمندِ فارابی نہ افلاطونِ یونانی
نوائے تو و خاموشی من بے ذوق و بے سوز است　　نہ من پروانہ ام ہرگز۔ نہ تو مرغِ گلستانی
مقالاتِ فسوں کارانِ یورپ برزباں دارد　　مسلمانے کہ شد بیگانۂ تعلیمِ قرآنی
بکن تسلیمِ جان و دل بہ بندِ آں یکے یکتا　　ز بندِ ہر یکے خود را اگر خواہی کہ برہانی
دل اندر یاری او بند۔ بیارِ جاں دہ و ناں دہ　　رہا کن یاری یاراں اگر جانی و گر نانی
مسلماں راہبر بودہ است سلطانی بدرویشی　　کنوں حرمانِ او بنگر نہ درویشی نہ سلطانی
بلندیِ نظر ہم شانِ صیادی برفت از یاد　　شکستہ بال و پر۔ ایں شاہبازانِ کہستانی
چناں مستِ خرامِ ناز چوں کبکِ قفس گوئی　　بنودہ ہیچ گہ در خوردِ شاں پرواز سامانی
ہزاراں خندہ ہائے کافری بر دینِ ما باشد　　"مسلماناں مسلماناں! مسلمانی مسلمانی!"
نسیمے از بہارستانِ خلدِ معرفت بارے　　کہ اندر روز خم اندست نارائی و کم دانی

سخن بس آشنا گویم بایں نا آشنائی ہا
خدایا بادہ قدرے آشنائی نیز ارزانی!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

از طور صاحب سیوہاروی

اے حقیقت آشنائے جزو کل ایکہ تیری ذات ہے فخرِ رسل
ضوفشاں تجھ سے ہوئی شمعِ حرم تو نے بالاتر کیا حق کا علَم
دل ترا گرویدہ دردِ رسول روح تیری حاملِ شانِ نزول
ایکہ تیری زندگی تفسیرِ غم فکر سے غیروں کے تیری چشم نم!
طاری ہونے پر بھی غم طاری نہ تھا تجھکو احساسِ گرانباری نہ تھا
ذوق تیرا ضامنِ فتح و ظفر عزم تیرا رہنمائے ہر بشر
ایکہ ہر مومن کے دل پر بر ملا نقش ہے جنگِ جمل کا واقعہ
تیری فکرِ نکتہ رس پر تھے عیاں نکتہ ہائے مذہب و شعر و بیاں
ایکہ تیرے ہر عمل سے آشکار بانیِ اسلام کا عز و وقار!

صدق آں گردد کہ قربانت شود
عشق آں باشد کہ قربانت شود

اے اسیرِ رنگ و بوئے تنگِ چمن از سرِ نو یاد کر درسِ کہن
ہاں وہی اسلام کا فرزند ہے جو جہاد و فقر کا پابند ہے
فاتحِ رزم زمانہ ہے وہی موت کو جو جانتا ہے زندگی
ہر نفس اک دور کا آغاز ہے ہر خلش میں ارتقا کا راز ہے

تبصرہ

تاریخ جرم وسزا مصنفہ جناب امداد صابری صاحب۔ تقطیع خورد۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر۔ قیمت مجلد عہ/ خود مصنف سے چوڑیوالاں دہلی کے پتہ پر ملسکتی ہے۔

جرائم کی تاریخ بہت قدیم ہے اور نوعِ انسانی کے ابتدائی دور سے ان کا وجود ملتا ہے۔ پھر جوں جوں نسلِ انسانی ترقی کرتی رہی نت نئے نئے جرائم پیدا ہوتے رہے۔ زمانہ کے لحاظ سے جرائم کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ نیز ہر ملک وقوم میں تعزیر و انسداد جرائم کے لئے علیحدہ علیحدہ مختلف طریقے برتے جاتے ہیں، جناب امداد صابری نے اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اردو رسائل کے لئے تو یہ کوئی جدید موضوع نہیں ہے۔ البتہ تصنیفی حیثیت سے اس پر اب تک کوئی منظم کوشش نہیں ہوئی ہے۔ تاریخ جرم وسزا اردو میں اس موضوع کا نقشِ اول ہے، کتاب چھ حصوں پر مشتمل ہو اور مختلف ممالک کے جرائم و تعزیرات کی تاریخ علیحدہ علیحدہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اس کا پہلا حصہ ہے جس میں تمامتر ہندوستان کے جرائم و تعزیرات سے بحث کی گئی ہے اور علی الترتیب ہندوستان کی تینوں حکومتوں ہندو راج، اسلامی حکومت اور برٹش گورنمنٹ کی نوعیت جرائم و طریقہ تعزیر کا تفصیلی تذکرہ ہے بیان میں کہیں اجمال ہے اور کہیں تفصیل لیکن جو کچھ لکھا ہے تحقیق سے لکھا ہے۔ جناب امداد صاحب کی یہ کاوش بروقت، برمحل اور حسب ضرورت ہے۔ ملک کے اہلِ ذوق کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور دلچسپی کا موجب ہوگا۔

ترجمان القرآن جلد دوم

یہ تفسیر قرآن مولانا ابوالکلام ایسے باکمال عالم کی ۳۰ سال کی عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے یہ جلد اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی جلد سے بھی زیادہ اہم اور مہتم بالشان ہے۔ اس کے حواشی نہایت مفصل دلپذیر و دلکش اور بہت سے اہم اجتماعی اور اقتصادی مسائل پر مشتمل ہیں سورہ اعراف سے سورہ مومنون تک اسی حصہ میں ہے اس لئے کتاب علمی اور تاریخی خصوصیات کے اعتبار سے بھی بے مثل ہوگئی ہے ہدیہ مجلد عہ

مضامین ابوالکلام آزاد جلد اول للعہ جلد دوم للعہ

منیجر مکتبہ برہان دہلی قرول باغ

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۴۱ء

قصص القرآن حصہ اول

قصص قرآنی و انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور ان کی دعوتِ حق کی مستند ترین تاریخ جس میں حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات قبل عبور دریا تک نہایت مفصل اور محققانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں قیمت للعہ

وحی الٰہی

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے دلپذیر و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا سوا دل میں سما جاتا ہے۔ قیمت عگر

بین الاقوامی سیاسی معلومات

بین الاقوامی سیاسی معلومات جس میں سیاسیات میں استعمال ہونیوالی تمام اصطلاحوں قوموں کے درمیان سیاسی معاہدوں، بین الاقوامی شخصیتوں اور تمام قوموں اور ملکوں کے سیاسی اور جغرافیائی حالات کو نہایت سہل اور دلچسپ انداز میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ قیمت مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت عہ

تاریخ انقلاب روس

ٹراٹسکی کی مشہور و معروف کتاب "تاریخ انقلاب روس" کا مستند اور مکمل خلاصہ جس میں روس کے حیرت انگیز سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے اسباب و نتائج اور دیگر اہم واقعات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عہ

سنہ ۱۹۴۲ء

قصص القرآن حصہ دوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعاتِ عبور دریا سے لیکر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات تک ان تمام پیغمبروں کے سوانح حیات اور ان کی دعوتِ حق کی محققانہ تشریح و تفسیر جن کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ قیمت للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام

طبع جدید۔ بڑی تقطیع۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

تاریخ ملت حصہ دوم
خلافت راشدہ

تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات مستند قدیم و جدید عربی تاریخوں کی بنیاد پر صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب کالجوں اور اسکولوں کے کورس میں داخل ہونے کے لائق ہے کتاب کی ترتیب کے وقت اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے قیمت ے

مسلمانوں کا عروج اور زوال

اس کتاب میں اولاً خلافتِ راشدہ اس کے بعد مسلمانوں کی دوسری مختلف حکومتوں ان کی سیاسی حکمت عملیوں اور مختلف دوروں میں مسلمانوں کے عام اجتماعی اور معاشرتی احوال و واقعات پر تبصرہ کر کے ان اسباب و عوامل کا تجزیہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے غیر معمولی عروج اور اس کے بعد ان کے حیرت انگیز انحطاط و زوال میں موثر ہوئے ہیں۔ قیمت عہ

منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) **محسنِ خاص**:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم اڑھائی سو روپے یکشت مرحمت فرمائیں گے، ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) **محسنین**:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔

ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبۂ برہان کی اہم مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) **معاونین**:۔ جو حضرات بارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) **احبا**:۔ چھ روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) برہان کی ضخامت کم سے کم اسّی صفحے ماہوار اور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

(۶) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۷) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ برہان قرولباغ دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
عتیق الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں غلامی کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی اور تحقیق سے کی گئی ہے قیمت تے ر

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام

اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہر آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متصوفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے قیمت یگر

سوشلزم کی بنیادی حقیقت

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریریں جنھیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ مع مبسوط مقدمہ از مترجم قیمت تے ر

اسلام کا اقتصادی نظام

ہماری زبان میں پہلی عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کرکے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے۔ طبع ثانی میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں۔ ان اضافوں کے بعد کتاب کی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب سنہ ۴۲ء کے سیٹ میں بھی دی گئی ہے۔ قیمت ہے ر

سنہ ۱۹۴۰ء

نبی عربی صلعم

تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت عمر

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں اور قرآن پاک کا صحیح منشا معلوم کرنے کیلئے شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ احادیث کی تدوین کس طرح اور کب ہوئی، یہ کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ قیمت عگر

غلامانِ اسلام

پچھتر سے زیادہ ان صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہاء و محدثین اور اربابِ کشف و کرامات کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل کے بیان پر پہلی عظیم الشان کتاب جس کے پڑھنے سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ قیمت صہ

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کی روشنی میں اصولِ اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواعِ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے ضابطہ ہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح کی گئی ہے۔ قیمت صہ

برہان

جلد سیزدہم — شمارہ (۵)

ذیقعدہ ۱۳۶۳ھ مطابق نومبر ۱۹۴۴ء

نظرات

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہم نے نیوز پرنٹ پیپر کے کوٹہ کے لئے درخواست دے رکھی تھی وہ اس مہینہ منظور ہوگئی ہے۔ لیکن یہ اطلاع ہمیں اسوقت ملی جبکہ برہان کی کتابت چوبیس صفحہ کے انداز سے ہو چکی تھی اس لئے اس ماہ کا رسالہ نیوز پرنٹ پیپر کے [illegible] صفحوں پر ہی شائع کیا جارہا ہے۔ آئندہ ماہ سے رسالہ کا حجم بڑھا دیا جائیگا

مسلمانوں کے نصابِ تعلیم کا مسئلہ ایک عرصہ سے اربابِ علم وفکر کے زیرِ غور ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہر طبقہ میں اب یہ احساس روز بروز پختہ ہو رہا ہے۔ بعض اربابِ مدارس عربیہ جو کل تک اصلاحِ نصاب کا ذکر تک سننے کے روادار نہ تھے اب وہ بھی اس ضرورت کو تسلیم کر رہے ہیں اور ان میں بھی عملی سرگرمی کے آثار پائے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف جدید تعلیم کے حضرات پر بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہی کہ یونیورسٹیوں کا موجودہ نصابِ تعلیم اور طرزِ تعلیم دونوں کم از کم مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے نہ صرف یہ کہ غیر مفید ہے بلکہ بڑی حد تک مضرت رساں ہے۔ جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے اربابِ حل وعقد آج کل تعلیم کی مشکل کے حل کرنے میں مصروف ہیں۔ خدا کرے دونوں جماعتیں جلد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچکر کوئی مفید عملی اقدام کر سکیں۔

ہمیں یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ روہیلکھنڈ کی پرانی ریاست رامپور نے اس سلسلہ میں بڑی اچھی پہل کی ہے۔ ریاست میں ایک قدیم عربی درسگاہ مدرسہ عالیہ کے نام سے قائم ہے جس میں وقتاً فوقتاً ہندوستان کے نامور اور خاص خاص فنون کے ماہر علماء استاذ رہے ہیں۔ حال میں اس درسگاہ کی طرف سے ہمیں جدید نصاب کا ایک خاکہ ملا ہے۔ اس پر مفصل تبصرہ تو غالباً آئندہ اشاعت میں ہو سکیگا۔ سر دست اسقدر عرض کرنا کافی ہے کہ نصاب بحیثیت مجموعی غور وخوض، وسعتِ نظر اور دقتِ نگاہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور اگر ریاست رامپور نے اپنی قدیم روایات کے مطابق اس مدرسہ کی خاطر خواہ سرپرستی قبول فرمائی اور اس نے مدرسہ میں جدید نصاب کی ترویج کے لئے اپنے دستِ کرم وتوجہ کو کشادہ رکھا تو بے شبہ علمی اور تعلیمی اعتبار سے اس کا یہ اتنا شاندار کارنامہ ہوگا کہ نہ صرف ریاست کے بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اس کے شکر گزار رہیں گے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

ایک تبصرہ پر تبصرہ

(۲)

از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ۔ ایم ۔ اے

جہاں تک مولانا کے افکار کا تعلق ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، مجموعی طور پر وہ قرآن مجید حضرت شاہ ولی اللہ رح کی تصانیف اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض طبقوں میں ان سے جو توحش پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ متعدد اسباب دوجوہ کی بنا پر قرآن مجید کو ایک خاص انداز سے ہی سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

اب رہیں شاہ صاحب رح کی تصنیفات تو ان کا حال یہ ہے کہ اگرچہ آج شاید کوئی ہی مسلمان ہو جو حجۃ اللہ البالغہ کے نام سے ناآشنا ہو، لیکن حق یہ ہے کہ طبقۂ علماء میں بھی آپ کو بہت کم ایسے افراد ملیں گے جنھوں نے شاہ صاحب رح کی دوسری تصانیف کا تو ذکر ہی کیا ہے، حجۃ اللہ کو بھی از اول تا آخر سمجھ کر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا ہو۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے علماء شاہ صاحب رح کی تمام کتابوں کو پڑھیں اور حجۃ اللہ البالغہ کے ان ابواب کے علاوہ جو عبادات اور ان کے اسرار و حکم سے متعلق ہیں ان ابواب کا بھی بغور مطالعہ کریں جن میں اسلام کے اصول شرائع اور بنیادی مسائل پر گفتگو ہو گئی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ یا تو وہ اپنے اس محدود فکر کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے جس کی بنا پر مولانا عبید اللہ سندھی ایسے مفکر اسلام ان کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے ہیں۔ اور یا ان کے دل میں حضرت شاہ صاحب رح کے متعلق بھی وہی جذبات پیدا ہوں گے جو وہ آج مولانا سندھی کی نسبت اپنے نہاں خانۂ قلب میں محسوس کرتے ہیں اور چونکہ مولانا ان کے معاصر ہیں اس لئے زبان سے ان جذبات کا بیباکانہ اظہار بھی کر دیتے ہیں۔

میں نے یہ جو کچھ کہا ہے محض دعویٰ نہیں بلکہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور اب آئندہ آپ جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے اس میں آپ کو اس دعویٰ کے ہی شواہد و نظائر بکثرت ملیں گے۔

ہندوستانی قومیت | جناب ناقد نے مولانا سندھی کے افکار کا جو باریک خط کے چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں خلاصہ یہ بتایا ہے کہ

"مولانا سندھی اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجون مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہندوؤں کو اسلام سے وحشت نہ رہے اور مسلمان بھی خوشی خوشی ہندوستانی قومیت کا جزو بن سکیں" (ص ۱۷۳)

اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ معلوم نہیں جناب ناقد کی مراد "ہندوستانی قومیت" سے کیا ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ مولانا متحدہ قومیت کے قائل ہیں اور وہ دو قوموں کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک قوم بنانا چاہتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی مراد یہ ہرگز نہیں ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں متعدد مواقع پر یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کا قومی وجود الگ اور منفرد تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ وحدتِ انسانیت کے باوجود آپ انسانوں کی قومی اور گروہی تقسیم کو ناگزیر بتاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"انسانوں کا، قوموں، گروہوں اور افراد میں بٹا ہونا وحدتِ انسانیت کے منافی نظر نہیں آتا۔ . . . . فرد ایک مستقل اکائی ہی ہے، جماعت ایک اکائی ہے جو افراد پر مشتمل ہے اس طرح ایک قوم اپنی جگہ مستقل وجود رکھتی ہے۔" (ص ۳۱)

پھر گاندھی جی کے نظریۂ متحدہ قومیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"گاندھی جی غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ ہندوستان کو ہزارہا سال پہلے کی جون میں بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے انھوں نے اس کا مطلق خیال نہ کیا کہ ۸۰۰ برس سے ایک اور قوم، ایک اور زبان، ایک نیا تمدن اور ایک نیا فکر اس وطن کو اپنا گھر بنا چکا ہے اور اس سرزمین پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ گاندھی جی کی قوم ان کی زبان کلچر اور فلسفہ کا ہے۔" (ص ۳۶۳)

آگے چل کر اسی صفحہ پر مسلمانوں کے حق حکومت خود اختیاری کو واجب اور درست بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"دو چیزیں بہت اہم تھیں جن کو نئے ہندوستان میں جگہ دینا بیحد ضروری تھا۔ ان میں سے ایک تو جمہوریت یعنی خود اپنی مرضی اور اپنی رائے سے اپنے اوپر حکومت کرنے کا حق ہے۔"

اقتباساتِ بالا سے یہ ظاہر ہے کہ مولانا "متحدہ قومیت" کے نظریہ کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ البتہ جیسا کہ

آج کل ہر بالغ نظر ہندوستانی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان محسوس کرتا ہے، مولانا یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں کسی ایک محاذ پر جمع نہیں ہوں گی ان کے سیاسی اور وطنی مسائل کی گتھی نہیں سلجھ سکیگی۔ اس مشترکہ محاذ کا نام مولانا "ہندوستانی قومیت" رکھتے ہیں جس کو ہم آجکل کی سیاسی اصطلاح میں دفاعی قومیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ ارباب منطق کے عام مقولہ "لامشاحۃ فی الاصطلاح" کے مطابق آپ اس کو ہندوستانی قومیت کہئے یا دفاعی قومیت سے اسے تعبیر کیجئے بہر حال اس کا مفاد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان باوجود اس ملک کی الگ الگ دو قوموں میں منقسم ہونے کے بہر حال ایک ملکی اور وطنی اشتراک رکھتے ہیں اور اس اشتراک کی بنا پر اس ملک اور وطن کا جو مطالبہ ہندوؤں سے ہے وہی مسلمانوں سے بھی ہے اور انھیں اس مطالبہ کا جواب دینا چاہیے۔ مولانا اس مقصد کے لئے جیسا کہ جناب ناقد نے لکھا ہے "اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجون مرکب" بنانا نہیں چاہتے ہیں بلکہ ان کا منشا یہ ہے کہ

> "ہندو اور مسلمان دونوں ملکر کام کریں اور ان کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو لیکن اس سیاسی تنظیم میں کسی مذہبی گروہ کا غلبہ نہ ہو" (ص ۳۶۲)

فقرہ کے آخری الفاظ خاص توجہ کے مستحق ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ دونوں قوموں کا مذہب الگ الگ رہیگا۔ اور اس مشترک تنظیم کی نوعیت محض سیاسی ہوگی۔ یعنی اندرون ملک امن و امان قائم رکھنا، صنعت و حرفت کی ترقی۔ ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کی تیاری اور ان کا انتظام بیرونی حملہ سے حفاظت کے اسباب وغیرہ ان چیزوں میں دونوں قوموں کا اشتراک ہوگا اور بس۔ مذہبی غلبہ کسی کا نہیں ہوگا۔ اس سے بعض تبلیغی جوش رکھنے والے مسلمانوں کو تکدر ہو سکتا ہے۔ لیکن سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہندو تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس بنا پر اگر آپ ان سے یہ شرط منواتے ہیں کہ مرکزی وفاق میں مذہبی غلبہ کسی کا نہیں ہوگا تو خود سوچئے اس میں زیادہ بھلا کس کا ہے؟ ہندوؤں کا یا مسلمانوں کا؟ اسی پیش بینی کی بنا پر مولانا نے یہ شرط لگائی ہے۔

غالباً ہمارے فاضل نقاد ان مسلمانوں میں سے ہیں جو آجکل "وطنیت" کے نام سے کسی مسئلہ پر غور کرنا پسند ہی نہیں کرتے۔ جی تو ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ اے کاش ہمارے معاملات میں وطنیت کا قدم درمیان میں آتا ہی نہیں اور ہم اس قابل ہوتے کہ جو بات سوچیں عالم اسلام کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے ہی سوچیں۔ لیکن۔

یُرِیدُ المرءُ اَن یُعطیٰ مُناہ ﴿﴾ ویابی اللہ الا ما یشاءُ

اسوقت مسلمانانِ ہند کی جو حالت ہے وہ یہ ہے کہ تقریباً تمام اسلامی ممالک سے ان کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے اور اب کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی جو اس عالم یاس وتاریکی میں ان کے شکستہ دلوں کے لئے مومیائی کا کام دے۔ اس بنا پر اب انھیں جو کچھ کرنا ہے ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے کرنا او یہاں کی دوسری قوموں کے ساتھ ملکرہی اپنی حالت کو سدھارنا ہے۔

اس بحث پر بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ گنجائش بالکل نہیں۔ البتہ اس قدر گذارش کردینا اور ضروری ہے کہ مولانا سندھی کے متعلق جیسا کہ جناب ناقد نے بھی ظاہر کیا ہے بعض لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ مولانا اسلام سے ہندوؤں کی وحشت کو دور کرنے کے لئے ایسی باتیں کہتے ہیں جو اسلامی نہیں ہیں۔ ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ مولانا "کیسی" باتیں کہتے ہیں جو اسلامی نہیں ہیں اس کی حقیقت تو آپ کو عنقریب معلوم ہو جائے گی۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ مولانا اسلام سے ہندوؤں کی وحشت کو ضرور دور کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ اس کا ایک صاف جواب تو یہ ہے کہ ایک مولانا ہی کیا ہر مبلغ کو ایسا ہی کرنا چاہئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن تبلیغ کے لئے بھیجا تو آپ نے ان کو صاف صاف تاکید کردی تھی کہ یسّرا ولا تعسّرا وبشّرا ولا تنفرا (صحیح بخاری) یعنی تم دونوں نرمی کرنا، سختی نہ کرنا۔ خوشخبری دینا، نفرت نہ دلانا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مولانا ہندوؤں پر ہی اس درجہ مہربان کیوں ہیں؟ دنیا میں آخر اور بھی غیر مسلم قومیں آباد ہیں؟ اس کی وجہ درحقیقت مولانا پر حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیفات وملفوظات کا غیر معمولی اثر ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب فیوض الحرمین میں اشارۃً وکنایۃً اور تفہیمات الٰہیہ میں صراحۃً لکھا ہے کہ میرا اعتقاد ہے کہ اگر اقلیم ہندوستان پر ہندوؤں کا غلبہ عام اور مستقر ہو گیا تو اللہ کی حکمت میں یہ بات ضروری ہے کہ اللہ ہندوؤں کے بڑے بڑے لوگوں کو دین اسلام اختیار کرلینے کا الہام کرے۔[۱]

مولانا نے دیکھا کہ ہندو ہر شعبہ میں ترقی کر رہے ہیں اور دفتری طاقت رفتہ رفتہ انھیں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی ہے جیسا کہ ہر سیاسی مبصر جانتا ہے تو اب مولانا کے دل میں طبعی طور پر خواہش پیدا ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کا دوسرا جز جو شرط کے لئے جزا کا حکم رکھتا ہے صادق

---

[۱] تفہیمات الٰہیہ ج ا ص ۲۰۳۔

آنا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے اس کے لئے جدوجہد کی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر حضرت شاہ صاحب کا یہ اعتقاد صحیح ثابت ہوا تو وہ یقیناً ایسے ہی مسلمان بزرگوں کی بدولت ہوگا جو ایک طرف ہندوؤں سے خلا ملا رکھتے ہیں اور دوسری جانب وہ اسلامی اخلاق و فضائل، تقویٰ و طہارت اور پاکبازی و پاک باطنی کی ایسی زبردست روحانی طاقت کے مالک ہیں کہ بڑے سے بڑا کافر بھی انھیں دیکھکر خدا کو یاد کرنے لگتا ہے ورنہ محض الگ تھلگ رہنے اور دوسروں کا منہ چڑانے سے یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

جو دل قمارخانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

الزام کفر | ہندوستانی قومیت کا مسئلہ تو خیر پھر بھی ایک سیاسی حیثیت رکھتا ہے۔ جناب ناقد نے ستم تو یہ کیا کہ مولانا پر الزام تراشی کفر سے بھی باز نہیں رہے۔ انھوں نے اگرچہ صاف طور پر مولانا کو کافر نہیں کہا لیکن غلط طور پر جو باتیں ان کی طرف منسوب کی ہیں ان کا حاصل اس کے سوا کوئی اور نہیں نکلتا کہ ان باتوں کے قائل کو کافر کہا جائے۔ مثلاً۔

"ہمارے مولانا تو دینِ حق کی برتری گویا مانتے ہی نہیں۔"[1]

"وہ اسلام کا قلادہ بھی موجودہ انسان کی فلاح و بہبود کیلئے ضروری نہیں سمجھتے۔"[2]

پھر اس ضد کا کیا ٹھکانا ہے کہ محض مولانا کی پرخاش میں جناب ناقد نے بعض ایسے حقائق کا انکار کر دیا ہے جو قرآن مجید کے مسلمہ حقائق ہیں۔ اور جن کو امت ہر قرن اور ہر زمانہ میں تسلیم کرتی آئی ہے۔ مثلاً وحدتِ انسانیت اور وحدتِ ادیان۔

وحدتِ انسانیت | جناب ناقد کا ارشاد ہے۔

"قرآن مجید کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ مولانا کی وحدتِ انسانیت کا شارح ہے اور نہ وہ وحدتِ ادیان کا قائل ہے۔"[3]

معلوم نہیں "مولانا کی وحدتِ انسانیت" سے لائق مقالہ نگار کی مراد کیا ہے کہ قرآن جس کا شارح نہیں ہے۔ "مولانا عبید اللہ سندھی" نامی کتاب کا باب "وحدتِ انسانیت" پڑھیے اور بتلایئے کہ اس میں مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے کیا وہ قرآن کی تعلیم نہیں ہے؟

---

[1] معارف ص ۱۷۳۔ [2] " ۱۷۴۔ [3] " ۱۷۳۔

سرور صاحب لکھتے ہیں۔

"قرآن کے اصولوں پر خالص انسانیت کا قیام مولانا کا عقیدہ ہے، ان کے نزدیک خالص بے میل انسانیت ہی فطرۃ اللہ کی محافظ ہے اور سچا دین اگر ہے تو یہی ہے۔"

پھر لکھتے ہیں۔

"مولانا اپنے اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اسلام کی تعلیمات کا لب لباب قرآن مجید کی آیت "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ" ہے۔"

اس باب کے ختم پر سرور صاحب وحدتِ انسانیت سے متعلق مولانا کے خیالات کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا وحدتِ انسانیت کو مانتے ہیں اور قرآن مجید کو اسی وحدت کا شارح سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک قرآن کی تعلیمات کا مقصو یہی ہے کہ اس وحدت کا قیام عمل میں آئے اور لوگ عقیدۃً علماً وعملاً موحد بن جائیں۔ (ص ۴۱)

اب فرمایئے! اس میں کونسی بات قرآن مجید کے خلاف ہے۔ کیا قرآن مجید کے ارشاد وما ارسلناک الا کافۃ للناس اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کیلئے ہی بھیجا ہے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور آپ سے پہلے انسانیت جن مختلف گروہ بندیوں میں مبتلا تھی آپ ان تمام کو مٹا کر تمام انسانوں کو ایک خیال اور ایک ہی عمل کے رشتہ میں منسلک کرنے آئے تھے۔ اسی ایک خیال اور عمل پر کاربند ہو کر انسان موحد بنتا ہے اور قرآن مجید سب کا سب کیا اسی ایک نقطہ "توحید" کی شرح نہیں ہے یعنی کیا وہ یہ نہیں بتاتا کہ وہ کونسا ایک بلند فکر، نظام، یا دستور ہے جس پر کاربند ہو کر تمام انسانیت ایک نقطہ وحدت پر جمع ہو جائے۔

گنجائش نہیں ورنہ قرآن پاک کی آیات بکثرت اسی مضمون کی پیش کی جاسکتی ہیں۔ اور مولانا کا مقصد وحدتِ انسانیت سے بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے۔ کہ تمام انسان رنگ و نسل، ملک و وطن، اور اقلیم و قوم کے اختلاف کے باوجود صرف ایک فکر اور ایک نظام سے وابستہ ہو جائیں اور یہ فکر و نظام مولانا کے نزدیک بے شبہ وہی ہے جو قرآن کا فکر و نظام ہے جیسا کہ آپ نے متعدد مواقع پر اس کا صاف صاف اعتراف و ذکر کیا ہے۔ آئندہ اس کے حوالے آئیں گے۔

وحدتِ ادیان | وحدتِ انسانیت کی طرح وحدتِ ادیان سے متعلق بھی یہ کہنا درست نہیں ہے کہ قرآن اس کا قائل نہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ "ادیان" سے مولانا کی مراد وہ مذاہب ہیں جو اسلام سے قبل دنیا میں رائج تھے اور جن میں بنیادی طور پر خدا کو ایک مانا گیا ہے۔ ورنہ جیسا کہ بعض لوگوں کو شبہ ہے مولانا کمیونزم اور سوشلزم وغیرہ کو دین نہیں مانتے چنانچہ سرور صاحب "خدا پرستی" کے زیرِ عنوان مولانا کے افکار کا آغاز اس فقرہ سے کرتے ہیں۔ "مولانا کے نزدیک ساری آسمانی کتابیں اسی وحدتِ انسانیت کی ترجمان ہیں اور حقیقت شناس حکیم بھی اسی فکر کے ترجمان تھے" (ص ۴۲)

دیکھئے مولانا نے "دین" کے بارہ میں کوئی ابہام باقی نہیں رکھا بلکہ صاف صاف "آسمانی کتابوں" کا لفظ فرما کر یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ ادیان سے مراد وہ مذاہب لیتے ہیں جو آسمانی کتابوں پر مبنی ہیں۔ رہ گئی یہ بات کہ "حقیقت شناس حکیم بھی اسی فکر کے ترجمان تھے"۔ تو خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حکماء کا ایک ایسا طبقہ مانا ہے جو اپنی عقل و فراست، ریاضت و محنت، ترکِ لذاتِ دنیوی اور عالمِ جبروت کی طرف توجہ تام کے باعث اس سعادت کو حاصل کر لیتے ہیں جس کی اشاعت اور تبلیغ کے لئے انبیاء کرام مبعوث ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب ان حکماء کو متالھون کا لقب دیتے ہیں اور اگرچہ ان کی تعداد بہت کم بتاتے ہیں تاہم ارشاد یہ ہے۔

فوصل بعضہم غایۃ مداھا[1] بعض بعض نے اس سعادت کا انتہائی مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔

دین سے مولانا کی مراد کے واضح ہو جانے کے بعد اب پھر اس پر غور فرمائیے کہ کیا قرآن مجید اس بات کا داعی نہیں ہے کہ اصل دین تمام مذاہب اور ادیان میں مشترک رہا ہے۔ دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مختلف قوموں اور ملکوں میں وقتاً فوقتاً جو رسول آتے رہے ان کے پیغامات بنیادی اعتبار سے بالکل ایک تھے۔ یعنی یہی کہ خدا کو ایک مانو۔ اس کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اعمالِ صالحہ کرو، برے کاموں سے بچو، بے شبہ قرآن اس حقیقت کا داعی ہے وہ اپنے آپ کو اپنے سے پہلی کتبِ سماویہ کا مصدق بتاتا ہے۔ تمام انبیاء اور ان کی کتابوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصّی بہ   اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ مقرر کی ہے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۱۔

نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصّینا	جس کی وصیت اس نے نوح کو اور ابراہیم، موسیٰ
بہ ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا	اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو کی تھی یعنی یہ کہ تم دین
الدین ولا تتفرقوا فیہ۔	کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو۔

ایک جگہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے کہتا ہے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول	اور (اے محمد) ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر
الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا	بھیجے ہیں ان کی طرف ہم نے یہی وحی کی ہے
فاعبدون۔	کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔

مزید برآں قرآن کہتا ہے کہ دینِ الٰہی کسی ملک یا خاندان یا کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے وہ اپنی اصل حقیقت میں ایک ہے اور سب کے لئے ہے۔ یہود اور نصاریٰ کو اسی بنا پر زجر و توبیخ کی گئی کہ وہ اہلِ کتاب ہونے اور کتبِ سماویہ کی تلاوت کرنے کے باوجود دینِ الٰہی کو اپنی ایک خاندانی یا جماعتی چیز سمجھ بیٹھے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تکذیب کرتے اور انھیں جھٹلاتے تھے۔

دین کی اس ایک اصل مشترک کے باوجود احکام و شرائع کے اعتبار سے یہ ادیان مختلف ضرور تھے لیکن یہ اختلاف منزلِ مقصود کا نہیں تھا بلکہ صرف ان راستوں کا اختلاف تھا جو منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ احکام اور شرائع کا تعین ہر قدم کے مخصوص احوال و ظروف کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے۔

لکل جعلنا منکم	ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک
شرعۃ ومنہاجا۔	خاص طریقہ اور راستہ مقرر کردیا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی اسی حقیقت کو یعنی اصل دین میں اشتراک کو وحدت ادیان کہتے ہیں اور اس کا نام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اتباع میں فطرۃ اللہ رکھتے ہیں چنانچہ شاہ صاحب کا ارشاد ہے

فطرۃ اللہ فطر الناس علیہا	یہ ایک فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں
ولن تجد لفطرۃ اللہ تبدیلا۔ و	کو مفطور کیا ہے اور تم اللہ کی فطرت
لیس ذالک الا فی اصول البر	میں تبدیلی نہیں پاؤ گے اور یہ فطرت کی
والاثم وکلیاتہا دون فروعہا و	یکسانیت نیکی اور گناہ کے اصول و کلیات
حدودہا وھذہ الفطرۃ ھو	میں ہے۔ فروع و جزئیات میں نہیں اور
الدین الذی لا یختلف باختلاف	یہی فطرت وہ دین ہے جو زمانوں کے

الاعصار والانبیاء کلہم　　اختلاف سے نہیں بدلتا اور تمام انبیاء
مجمعون علیہ۔ [۱]　　اس پر متفق ہیں۔

اب حضرت شاہ صاحبؒ کی اس عبارت کے ساتھ مولانا سندھی کی مندرجۂ ذیل عبارت پڑھیے جو وحدتِ ادیان سے متعلق مولانا کے افکار کی غزل میں مقطع کا حکم رکھتی ہے اور دیکھیے کہ یہ عبارت کس طرح حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کا ہی اردو ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"تاریخ کا مطالعہ کرو اور پھر پتہ لگاؤ کہ آخر مجموعی انسانیت کا طبعی تقاضہ کیا ہے۔ انسان کن باتوں سے قعرِ تنزل میں گرے اور کون سے اصول تھے جن پر چل کر وہ بام رفعت پر پہنچے اس تلاش و تفحص کے بعد انسانوں کی اس طول طویل تاریخ میں جو اصول سب قوموں میں آپ کو مشترک نظر آئیں گے وہ فطرۃ اللہ ہے اور یہی الدین القیم ہے اور جو تعلیم مجموعی انسانیت کی فطرت کے مطابق ہوگی وہی حق ہے۔" (ص ۴۳)۔

علاوہ بریں حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک مستقل باب باندھا ہے جس میں تمام ادیان کی اصل کے ایک ہونے اور شرائع و مناہج کے اختلاف پر نہایت مفصل اور حکیمانہ بحث کی ہے۔ اس میں قرآن مجید کی جو آیت شرع لکم من الدین الآیہ اوپر گذر چکی ہے اس کو نقل کر کے مشہور مفسر حضرت مجاہد کی تفسیر لکھتے ہیں۔

اوصیناک یا محمد وایاھم　　اے محمد ہم نے آپ کو اور ان پیغمبروں کو ایک ہی
دیناً واحداً۔　　دین کی وصیت کی ہے۔

اس کے بعد چند اور آیات اور ان کی تفاسیر لکھی ہیں۔ پھر فرماتے ہیں۔

اعلموان اصل الدین واحد　　جانو بے شبہ دین کی اصل ایک ہے۔ اس پر
اتفق علیہ الانبیاء علیہم السلام　　تمام انبیاء کا اتفاق ہے اور اختلاف صرف
وانما الاختلاف فی الشرائع والمناہج [۲]　　شرائع اور مناہج کا ہے۔

اسلام سب ادیان سے برتر ہے　　یقین نہیں آتا کہ وحدتِ انسانیت اور وحدتِ ادیان ایسی اسلام کی عام اور مسلمہ حقیقت سے ندوۃ العلماء کا ایک ممتاز فاضل اس طرح بے خبر ہو یا باخبر ہونے کے باوجود کسی خاص وجہ سے اس کا انکار کردے بہر حال۔

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج اص ۲۰۔ [۲] ایضاً ج اص ۶۸۔

ان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ
وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

ممکن ہے فاضل نقاد کو مولانا کے کسی فقرہ سے یہ دہوکا ہوا ہو کہ مولانا وحدتِ ادیان سے یہ مراد لیتے ہیں کہ دین دین سب برابر ہیں یہاں تک کہ اسلام کو بھی کسی دین پر برتری حاصل نہیں ہے اور اس بنا پر ایک شخص کو اختیار ہے کہ وہ جس دین کو چاہے اختیار کرے۔ چنانچہ اوپر "الزام کفر" کے زیرِ عنوان ہم نے موصوف کا جو فقرہ نقل کیا ہے اس سے یہی متبادر ہوتا ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے تو واضح رہنا چاہئے کہ مولانا سندھی دین کی اصل ایک ماننے کے باوجود اسلام کو دنیا کا آخری دین برحق اور اس کی کتاب قرآن کو آخری آسمانی کتاب مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن ان تمام صداقتوں کا کامل مجموعہ ہے جو اسلام سے پہلے مختلف ادیان میں بکھری پڑی تھیں۔ قرآن کا قانون تمام انسانوں کے لئے ہے اور انسانیت کی بھلائی کا راز صرف اسی کے اتباع اور پیروی میں ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں

"مولانا کے نزدیک قرآن نے تمام اقوام ادیان اور مذاہب کے مرکزی نکات کو جو کل انسانیت پر منطبق ہو سکتے ہیں یکجا کیا اور ساری دنیا کو یہ دعوت دی کہ صرف یہی ایک اساس ہے جس پر صحیح انسانیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اگر یہودیوں کی قوم میں اس انسانیت کا فقدان ہے تو وہ خواہ اپنے منہ سے "ابناءُ اللہِ واحباءُہٗ" بنیں گمراہ ہیں۔ اگر عیسائی اس سے خالی ہیں تو ان کا ابن اللہ کا ماننا کسی کام نہ آئے گا اور اگر ہندوؤں میں انسانیت کی کمی ہے تو ان کا پوتر ہونا محض خام خیالی ہے۔ (ص ۳۷)

غور کیجئے کیا اس عبارت سے یہ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا تمام غیر مسلم قوموں کو انسانیت کے نام پر اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جانے کی دعوت دے رہے ہیں صفحہ ۳۶ پر فرماتے ہیں۔

"قرآن کا مقصود اصلی سب دینوں سے اعلیٰ دین۔ سب فکروں سے بلند تر فکر۔ یا سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ جو زیادہ سے زیادہ انسانیت پر جامع ہو پیش کرنا اور اس پر عمل کرانا ہے۔"

قرآن کی عالمگیری اور لازوالی پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"قرآن انہی عالمگیر اور ناقابل تغیر اصولِ حیات کو پیش کرتا ہے۔ یہ قرآن کا صحیح مفہوم ہے اور یہی چیز ہے جو ازل سے ابد تک قائم رہیگی اور اسی کے ماننے میں تمام انسانوں کا بھلا ہے (ص ۴۴)۔

مولانا اسلام کے پیغام کو تمام دنیا سے منوانے اور سارے جہان کو اسی ایک دین کا حلقہ بگوش بنانے کے لئے کس قدر بے چین ہیں اس کا اندازہ ذیل کی عبارت سے ہوگا۔ فرماتے ہیں۔

"ہر قوم کے عقلمند طبقوں کا رجحان اب اس طرف ہو رہا ہے اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے اپنے فکری نظاموں کو عالمگیر انسانیت کا ترجمان بنا کر پیش کریں۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ دین جو صحیح معنوں میں ساری انسانیت کا دین تھا اور وہ کتاب جو کل نوعِ انسانی کی ہدایت کی علمبردار تھی اور وہ ملت جس نے سب قوموں کو ایک بنایا اور جس کا تمدن ساری انسانیت کی باقیاتِ صالحات کا مرقع تھا۔ وہ دین وہ کتاب اور وہ ملت ایک فرقہ کی جاگیر بن گیا ہے اور وہ لوگ نہیں سمجھتے کہ اس وسعت پذیر دور میں جس میں کہ کرہ زمین کی سب دوریاں سکڑ گئی ہیں اور ملکوں، قوموں اور براعظموں کی سرحدیں مٹتی جا رہی ہیں۔ اور ریل جہاز، طیاروں، اور ریڈیو نے سب انسانوں کو اپنی کہنے اور دوسروں کی سننے کے لئے ایک انسانی برادری میں بدل دیا ہے۔ اس زمانہ میں ایسی تعلیم کو جو صحیح معنی میں عالمگیر اور انسانی تھی۔ ایک گروہ اور جماعت میں محدود کر دینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ معلوم نہیں مسلمان اسلام کو کب سمجھینگے اور قرآن کے اصل پیغام کو کب اپنائینگے۔" (ص ۹۸)

قرآنی حکومت | لائق تبصرہ نگار کا دعوی ہے کہ

"مولانا دینِ حق کی دائمی برتری گویا مانتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک اب قرآنی حکومت کا زمانہ گذر گیا اور گذری ہوئی چیز واپس نہیں آسکتی۔"

اس دعوی کو ثابت کرنے کے لئے موصوف نے مولانا کی ایک عبارت نقل کی ہے جسے آپ بھی سن لیجئے۔

"جو زمانہ گذر گیا وہ پھر واپس نہیں آیا کرتا۔ جو پانی بہہ جاتا ہے وہ لوٹتا نہیں۔ قرآن پر عمل کرکے خلافتِ راشدہ کے دورِ اول میں صحابہ نے جو حکومت بنائی۔ اب بعینہ ویسی حکومت نہیں بن سکتی۔ جو لوگ قرآن کو اس طرح سمجھتے ہیں وہ حکمتِ قرآنی کے صحیح مفہوم کو نہیں جانتے۔ بیشک خلافتِ راشدہ کی حکومت قرآنی حکومت کا ایک نمونہ ہے لیکن یہ نمونہ بعینہ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا۔"

مولانا کی یہ عبارت من وعن آپ کے سامنے ہے۔ بتایئے اس کے کس لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "قرآنی حکومت" کا زمانہ گذر گیا۔ ہر بالغ عاقل سمجھ سکتا ہے کہ مولانا کا منشا یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ

بے شبہ قرآنی حکومت کا ایک نمونہ ہے (اور بے شبہ یہ ایسا نمونہ ہے جس کی نظیر تاریخِ عالم میں موجود نہیں ہے) لیکن یہ نمونہ بعینہ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ یعنی خلافتِ راشدہ کے بعد تیرہ سو سال کی مدت میں مسلمانوں کی جو حکومتیں عالم کے مختلف گوشوں میں قائم ہوئیں۔ مولانا کے نزدیک وہ سب یا اُن میں سے اکثر بھی قرآنی حکومت کے طرز کی حکومتیں تھیں لیکن خلافتِ راشدہ نے قرآنی حکومت کا جو نمونہ پیش کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس جیسی کوئی حکومت قائم نہیں ہو سکی۔ مسلمان عام طور پر اس کو اپنی بدنصیبی اور بدبختی سمجھتے ہیں۔ لیکن مولانا یہ فرماتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہوا حکمتِ قرآنی کے ماتحت ہوا۔ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ بس خلافتِ راشدہ ہی قرآنی حکومت کا نمونہ تھا۔ اس کے بعد اس حکومت کا دور بالکل ختم ہو گیا۔ نہیں بلکہ مولانا کو بنوامیہ، بنوعباس۔ مصر کے بنو فاطمہ، اندلس کے موحدین۔ سمرقند و بخارا کی دولت غزنویہ وغیرہ میں بھی قرآنی حکومت کا نمونہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ نمونہ خلافتِ راشدہ کے نمونہ سے کمتر ہے۔ مولانا کے نزدیک قرآنی حکومت کا زمانہ ختم نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی گذشتہ طویل تاریخ میں کم و بیش قرآنی حکومت جلوہ فرما رہی ہے اور آج بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"قرآن اب بھی اپنی حکومت قائم کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کو عقل اور تفقہ سے سمجھا جائے اور اس کی عالمگیریت کی کنہ معلوم کی جائے" (ص ۴۷)

یہاں اس بات پر متنبہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج کل پرجوش اور نوجوان مسلمانوں میں خود اپنی تاریخ سے ایک خاص قسم کی نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی عمر کل کچھ کم تیس برس ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد دورِ ملوکیت شروع ہو گیا جو سراپا ظلم و ستم تھا۔ بادشاہ مطلق العنان اور مستبد ہوتے تھے عیاش اور شہوت پرست ہوتے تھے۔ اسلام اور قرآن کا نام ہی نام رہ گیا تھا اور اسی بنا پر اکبر الہ آبادی نے "درحدیثِ دیگراں" "سرِ دلبراں" کا افشا اس طرح کیا تھا۔

"بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے"

میں سمجھتا ہوں ہم نوجوانوں میں اس قسم کی ذہنیت کے پیدا ہونے کے دو سبب تھے ایک مستشرقین کا علمی رنگ میں ہماری روایات قومی کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ۔ اور دوسرا خود ہمارے قدیم مورخین کا غیر محتاط طرزِ نگارش۔ بہر حال اسباب خواہ کچھ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں خود اپنے اسلاف سے اور خصوصاً مسلمان سلاطین سے نفرت کا شدید جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور ہم یہ یقین کر بیٹھے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد دراصل قرآنی دستور، حدود اللہ، اسلامی آئینِ حیات سب کا سب معطل اور مفلوج و بیکار ہو گئے تھے۔

اب ذرا اور غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس ذہنیت کا ایک سبب اور ہے وہ یہ کہ ہم نے اسلامی اعمال۔ فضائلِ اخلاق اور اسلامی مکارم و محاسن کا ایک ایسا اعلیٰ تخیل قائم کر رکھا ہے کہ ہم کو ان کا مصداق صرف حضرت ابوبکر و عمر اور حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے کیرکٹر میں ہی نظر آتا ہے اور جب ان فضائل کا یہ اعلیٰ تصور ہم کو امیر معاویہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہم) اور عبدالملک بن مروان، ہشام اور ولید میں نظر نہیں آتا تو ہم ان بزرگوں پر تبرا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے دلوں میں ان سے ایک قسم کی بیزاری محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو سمجھنا چاہئے کہ فضائل اخلاق میں سب انسان ایک ہی مرتبہ اور درجہ کے نہیں ہوتے۔ باوجود "اچھا" ہونے کے باہم فرقِ مراتب ہوتا ہی ہے یہی وجہ ہے کہ جس طرح کفر دون کفر ہوتا ہے اسی طرح ایمان میں بھی درجات کا تفاوت ناگزیر ہے حضرت امیر معاویہ کا کیرکٹر بے شبہ خلفاء راشدین ایسا نہیں تھا۔ یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان جیسا نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ ان کی حکومت کو غیر قرآنی اور غیر اسلامی حکومت کہا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا اعتصام بحبل اللہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ لیکن یہ باور کرنا ایک کھلا ہوا فریب ہے کہ مسلمانوں نے اپنی سوا تیرہ سو سال کی تاریخ میں قرآنی حکومت کو بالکل بھلائے رکھا۔ اور وہ اس سے بالکل کنارہ کش رہے۔ بعض بعض سلاطین اپنے شخصی اعمال و افعال کے لحاظ سے خواہ کیسے ہی رہے ہوں لیکن اس کو بدلائلِ قاطعہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر تاریخ کے ہر دور میں یہاں تک کہ مغلوں اور دولتِ عثمانیہ کے آخری تاجداروں میں بھی مسلمان حکومتوں کا دستور العمل قرآن ہی رہا ہے۔

پس مولانا عبید اللہ سندھی کی مذکورہ بالا عبارت دراصل آج کل کے "پرجوش" مسلمانوں کی اس غیر متوازن ذہنیت کے ہی خلاف ایک زبردست احتجاج ہے۔ مولانا کی مراد یہ ہے کہ قرآنی حکومت کا ایک ایسا اعلیٰ تصور قائم کرنا کہ وہ اپنے مصداق کے لحاظ سے صرف خلافتِ راشدہ میں محدود ہو کر رہ جائے صحیح نہیں۔ مولانا کے نزدیک قرآنی حکمت کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ مسلمان خلیفہ میں حضرت عمرؓ کی انتہائی سادگی پائی جائے تو اس کو تو قرآنی حکومت کا ایک نمونہ کہا جائے اور عجمیوں کی شوکت وحشمت کا توڑ کرنے اور ان پر اپنا رعب قائم کرنے کے لئے امیر معاویہ تزک و احتشام سے رہیں تو ان کے اس فعل کو غیر قرآنی کہا جائے۔ مولانا کے نزدیک حکمتِ قرآنی کی رو سے حضرت عمرؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کا فعل "حکومتِ قرآنی" کا نمونہ ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ جس ماحول میں رہتے تھے اس کا تقاضا یہ ہی تھا کہ اسلام کا خلیفہ ثانی اس طرح کی سادہ زندگی بسر کرکے اسلامی فضائل اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرے۔ اور اس کے برخلاف حضرت امیر معاویہؓ

جس ماحول میں تھے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ شان و شوکت کے ذریعہ عجمیوں کے دلوں پر اسلامی حکومت کا رعب و داب قائم رکھیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض تاریخوں کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے امیر معاویہؓ سے ان کے رئیسانہ طرز بود و ماند سے متعلق سوال کیا اور امیر معاویہ نے جواب میں وہی بات کہی جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں تو حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے۔

بات طویل ہوتی جاتی ہے لیکن اتنا کہے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ تمثیلاً آپ سلطان محمود غزنوی اور سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے معاملہ پر غور کیجئے۔ ہمارا آج کل کا مسلمان نوجوان جو حکومتِ الٰہیہ کے تصور کے بادۂ سرجوش سے سرشار ہے وہ ان دونوں بادشاہوں کی زندگی کا ایک نہایت بھیانک اور افسوسناک خاکہ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبۂ تاریخ پروفیسر محمد حبیب کی انگریزی کتاب "محمود آف غزنہ" ملاحظہ فرمایئے اس میں آپ دیکھیں گے کہ ایک غیر مسلم مورخ محمود غزنوی کی شان میں جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ سب کچھ ہماری قومی درسگاہ کے مورخ نے اپنے زبانِ قلم سے بے تکلف کہہ ڈالا ہے۔ اور دیباچہ میں عذر یہ ہے کہ اسلام میں اصل چیز قرآن کا دستور ہے۔ اشخاص و افراد نہیں۔" لیکن محرمِ اسرارِ کن فکاں، حجۃ اللہ علی اہل الزماں حضرت شاہ ولی اللہؒ اس نامور شخصیت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ اس کا اندازہ ان چند سطروں سے ہوگا جو آپ نے تفہیمات الٰہیہ جلد اول صفحہ ۲۴۶ پر اس شاہ بت شکن کی نسبت تحریر فرمائی ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کا جو میلانِ ذہنی سلطان غزنوی کے متعلق ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی دوسرے سلاطینِ اسلام کو بھی کم و بیش اسی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔

مولانا کا مطلب اسی سلسلہ کی ایک اور عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ایک زمانہ میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا۔ اب ضروری نہیں کہ دوسرے زمانہ میں وہ پھر بعینہ اسی صورت میں ظاہر ہو۔ صحابہ کے زمانہ میں تیر و کمان اور تلوار و ڈھال سے جہاد ہوتا تھا۔ اور مجاہدین اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر جہاد کو نکلتے تھے۔ اب قرآنی تعلیم نے اگر کبھی اپنے پیروؤں کو جہاد پر آمادہ کیا تو ضروری نہیں کہ پھر تلوار۔ ڈھال اور اونٹ اور گھوڑوں کی نوبت آئے اسی طرح خلافت راشدہ کے دور میں مساوات اور انصاف کا اصول ایک خاص نہج پر نافذ ہوا۔ اب زندگی بہت کچھ بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ زندگی کی ضرورتیں بھی بدل گئی ہیں۔ اس لئے مساوات اور انصاف کا حلقۂ اثر بھی بہت وسیع ہوگا یعنی مقاصد تو وہی رہیں گے۔ لیکن

ان کی عملی شکل حالات واسباب کی تبدیلی کی وجہ سے پہلی سی نہ ہوگی۔" (ص ۴۷)
مولانا عملی شکل کی جو تبدیلی چاہتے ہیں اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرلیا جائے بلکہ جیساکہ ان کی تمثیل سے صاف ظاہر ہے اس کا منشا یہ ہے کہ فقہا جہاں جہاں گنجائش دیکھیں وہ اصول تشریع وتقنین کی روشنی میں تبدیلی کرلیں۔ مثلاً غلام بنانا عہد فاروقی میں مباح تھا لیکن اب بین الاقوامی کی حالات کی وجہ سے اگر مسلمانوں کا امام اس کو بند کردے تو یہ جائز ہوگا اور نہ صرف یہ کہ جائز ہوگا بلکہ اسے ایسا کرنا ہی چاہیئے۔ اسی طرح خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں کے دوسری قوموں سے سیاسی اور تجارتی تعلقات وروابط اس زمانہ کے حالات ومقتضیات کی بنا پر خاص خاص اصول وآئین پر مبنی تھے۔ لیکن آج چونکہ حالات دوسرے ہیں اس لئے مسلمانوں کو ازسرِ نو غور کرنا ہوگا کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ اس نوع کے روابط قرآن وسنت کی روشنی میں کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔ اور اس کے دفعات وشرائط کیا ہونگے؟ مولانا سندھی کے نزدیک عہد خلفاء راشدین میں جو کچھ ہوا وہ جس طرح قرآنی دستور پر عمل کا ایک نمونہ تھا۔ اسی طرح مسلمان زمانہ کے دگرگوں حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب جو کچھ کریں گے وہ بھی قرآنی دستور وآئین کا ہی ایک نمونہ ہوگا۔ نہ کہ اس کا غیر! مولانا نے یہ خیال ظاہر کرکے کوئی نئی بات نہیں فرمائی۔ بلکہ وہی بات کہی ہے جسے عام طور پر آج کل ہمارے روشن خیال علماء "فقہ کی جدید تدوین وترتیب" کے زیرِ عنوان اکثر کہتے رہتے ہیں۔

آپ نے دیکھا مولانا کا مقصد کیا ہے؟ کس درجہ حقیقت افروز اور دل لگتی بات کہی ہے اور تاریخ اسلام کے حکومتی ادوار کا کتنا اچھا اور پاکیزہ تصور پیش کیا ہے۔ لیکن جناب ناقد کو ان عبارتوں میں مولانا کی کفر سامانی کا عفریت جان شکار اپنی بھیانک شکل میں نظر آرہا ہے اور وہ ان کا مفہوم یہ متعین کرتے ہیں کہ مولانا دین حق کی برتری کے قائل ہی نہیں اور ان کے نزدیک قرآنی حکومت کا زمانہ گذر گیا۔

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تابکجا

اقبال نے غالباً اسی قسم کے سخن فہمانِ عالمِ بالا کی نسبت کہا ہے اور ٹھیک کہا ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری

جناب ناقد کو مولانا سندھی کی اس دعوتِ تجدید واصلاح میں دینِ حق کی برتری سے انکار کا سامان نظر آتا ہے۔ لیکن شاید انھیں خبر نہیں ہے کہ ان کے عارفِ لاہوری اور ہمارے

حکیم شرق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنے انگریزی زبان کے چھٹے لکچر میں (جس کا عنوان ہے۔
"The principle of movement in the structure of Islam")
جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سندھی غریب کے افکار سے بھی زیادہ شدت رکھتے ہیں۔ یہ لکچر انگریزی میں ہے اور اردو میں اب تک اس کا ترجمہ نہیں ہوا۔

ناقد صاحب سے گذارش ہے کہ اگر اب تک یہ لکچر آپ کی نظر سے نہیں گذرا ہے تو اب دیکھ لیں اور پھر فرمائیں کہ جب حضرت شیخ الہندؒ کے معنوی لختِ جگر کی نسبت جناب کا وہ فتویٰ ہے تو اب اسلامیانِ ہند کے شاعرِ حکیم کے متعلق کیا حکم ہے؟

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ   وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کیلئے

اس کتاب کے بعض حوالے آگے آئیں گے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو مولانا سندھی کا یہ فقرہ اکھرے کہ "یہ نمونہ بعینہٖ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا" یعنی خلافتِ راشدہ ایسی حکومت جو قرآنی دستور کا اعلیٰ نمونہ ہو اب قائم نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان حضرات کو یقین کرنا چاہئے کہ کوئی حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ اور ناگوار ہو بہر حال حقیقت ہے اور اسے انگیز کرنا ہی چاہئے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ ایسے خلفاء اور حضرت سعد بن وقاص، ابوموسیٰ اشعریؓ، مغیرہ بن شعبہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہم جیسے عمال و ولاۃ اور صحابہ کرام و تابعین عظام جیسی رعایا جو مشکوٰۃ نبوت سے براہِ راست یا ایک واسطہ سے مستنیر ہو رہے تھے ایک مرتبہ پیدا ہونے کے بعد پھر پیدا نہیں ہوئے اور نہ اب آئندہ پیدا ہوں تو ہمیں باور کرنا چاہئے کہ خلافتِ راشدہ ایسے طرز کی قرآنی حکومت بھی اب کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں فرماتے کہ میرے بعد خلافت تیس سال ہوگی اور اس کے بعد ملکِ عضوض کا دور دورہ شروع ہو جائے گا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد سے اب تک کی پوری تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اس مدت میں وقتاً فوقتاً خلافتِ راشدہ کے طرز کی حکومتیں قائم کرنے کی کیسی عظیم الشان اور مخلصانہ کوششیں ہوئی ہیں مگر ان کا انجام کیا ہوا۔ دور کیوں جایئے! پہلی صدی ہجری کے ختم پر ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس سلسلہ میں کیا کچھ نہیں کیا لیکن ارباب خبر جانتے ہیں کہ خود ان کے گھر اور خاندان والوں نے ان کی مخالفت میں کیا کمی کی۔ اور آخر کار دو سال کی خلافت کے بعد ہی انھیں مسموم ہو کر جامِ شہادت نوش کرنا پڑا پس جو چیز خیر القرون میں نہ ہو سکی وہ اب دورِ پرفتن میں کیونکر ہو سکتی ہے۔

رسوم | فاضل ناقد کو مولانا کے متعلق جو مغالطہ خلافتِ راشدہ والی مذکورہ بالا عبارت سے ہوا۔ اسی قسم کا مغالطہ ایک اور عبارت سے ہوا ہے جس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مولانا شاید اسلام کا قلادہ بھی موجودہ انسان کی فلاح وبہبود کے لئے ضروری نہیں سمجھتے وہ عبارت یہ ہے۔

"میں دین کو اسی بنا پر انسانیت کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پر چلنے سے ہر فردِ انسان کی انانیت بیدار ہوتی ہے. بدقسمتی سے لوگوں نے خاص اپنے خاندان یا صرف اپنے ملک کے خاص اور محدود مذہب کو دینِ حق مان لیا اور جو ظاہری طور طریقوں میں ان سے مختلف ہوا اس کو کافر قرار دیا اور یہ نہ دیکھا کہ دین کا جو مقصود حقیقی ہے وہ ان کے ہاتھ آتا بھی ہے یا نہیں"

جناب ناقد اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

"جانے ظاہری طور طریقوں سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ کیا نماز پڑھنا، روزے رکھنا، زکوٰۃ کی ادائی، حج ادا کرنا، یہ سب طور طریقے ہیں اور جو ان کا قائل نہ ہو وہ رب العالمین کی بارگاہ میں مقبول ہو سکتا ہے؟ اور پھر ہمیں بتایا جائے کہ محدود مذہب سے مراد کیا ہے کیا اسلامی شریعت بھی اسی محدود مذہب کی فہرست میں داخل ہے؟ (معارف ص ۱۲۰)

اصل مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مولانا جب اسلام کے بارہ میں غیرمسلموں سے گفتگو کرتے تھے تو اُن کا اس معاملہ میں ایک خاص اصول تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عصرِ جدید کا ذہن مذہب کو ان پرانے طریقوں سے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا جن کے ذریعہ پہلے زمانہ میں مذہب کی حقیقت سمجھائی جاتی تھی. مثلاً اگر آج یورپ کے سائنس زدہ کسی آدمی کے سامنے مذہبی اور اخلاقی اقدار کا ذکر کر کے یوم آخرت کا تذکرہ کریں تو اس کا ذہن اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیگا اس کے برعکس وہ آج مذہب کو ایک انسانی نظام کی حیثیت سے سمجھنا چاہتا ہے یعنی اگر کوئی مذہب سچا ہے تو وہ انسانوں کی موجودہ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے اس مذہب کا پابند ہو کر ایک قوم کے تعلقات دوسری قوموں کے ساتھ کیسے ہوں گے؟ ان کی معاشی اور اقتصادی حالت کیا ہوگی؟ زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا ہوگا؟ اس بنا پر مولانا فرماتے تھے کہ جب تم کسی غیرمسلم سے گفتگو کرو تو بالکل غیرجانبدار ہو کر کرو۔ یعنی اس طرح کہ گویا دو غیرمسلم آپس میں گفتگو کر رہے ہیں اور پھر اسلام کو بحیثیت ایک اعلیٰ ترین فکر و نظام کے پیش کرو تو تم دیکھو گے کہ اس کے دو نتیجے ہوں گے ایک تو یہ کہ وہ تمہاری باتوں کو عالی حوصلگی اور وسعتِ قلب کے ساتھ سُنیگا۔ اور دوسرا یہ کہ جب

اس پر اسلام کی حقیقت بحیثیت ایک اعلیٰ، مکمل اور بہر جہت تمام نظام کے روشن ہو جائے گی اور اس کو یہ یقین ہو جائیگا کہ اسی نظام سے وابستہ ہو کر دنیا کے لوگ امن وچین اور خوشحالی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو وہ فوراً اس کو قبول کر لیگا اور اس نظام وفکر کی حقیقی عظمت اس کے دل میں پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہارے لئے موقع ہے کہ تم اسلام کی دوسری تعلیمات سے اس کو آشنا کر دو۔ یہی وجہ ہے کہ چونکہ مولانا کا اصل مشن اسلام کو حقیقۃً عالمگیر بنانا اور دنیا کی تمام قوموں کو اس کا حلقہ بگوش کرنا ہے اسلئے وہ ہمیشہ اصولی اور بنیادی امور پر گفتگو کرتے ہیں۔ مسائل جزیہ، یا رسوم شرعیہ کا ذکر نہیں کرتے۔ ورنہ جو شخص خود رسوم کا اس قدر پابند ہو کہ نماز با جماعت کو ترک نہ کرے، تہجد تک کی نماز بالالتزام ادا کرے اوراد وظائف کا پابند ہو، روزہ سفر میں بھی نہ قضا ہونے دیتا ہو، حج کئی ایک کئے ہوں، قیام حجاز کے زمانہ میں کثرتِ طواف میں اس کو لطف وسرور ملتا ہو۔ اس کی نسبت یہ باور کرنا کہ وہ رسوم کو ظاہری طور طریق سمجھکر غیر اہم قرار دیتا ہے کیونکر قرینِ صواب ہو سکتا ہے؟

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ بظاہر عبادات اور شعائر دینیہ کے لئے رسوم کا لفظ نامناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ یہ اصطلاح خود مولانا کی اپنی نہیں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ اور تفہیمات میں اس لفظ کو اسی معنی میں متعدد مواقع پر استعمال کیا ہے؟

اب سنئے! رسوم کے متعلق مولانا کا کیا خیال ہے: اس سلسلہ میں لائق تبصرہ نگار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مولانا رسوم کو لازمی اور ضروری قرار نہیں دیتے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"امام ولی اللہ تمام شرائع الٰہیہ کے اندر رسوم کو مرکز مانتے ہیں۔ قرآن عظیم نے اس کو معروف کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ (ص ۳۹)۔

ایک جگہ ان کا ارشاد ہے۔

"زندگی جب اس دنیا میں اسباب وحالات کا جامہ پہنتی ہے تو اسے ممکن اور موجود ہونے کے لئے لامحالہ رسوم اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ ان رسوم کے بغیر زندگی زمان ومکان کے دائرہ میں وجود پذیر نہیں ہو سکتی" (ص ۳۸)

لیکن مولانا کا منشا یہ ہے کہ "رسوم کو رسوم ہی سمجھا جائے۔ لباس لباس ہی رہے۔ اسے صاحبِ لباس نہ مان لیا جائے" (ص ۳۸) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مذہب کی اصل روح اور رسوم ان دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ مذہب کی غرض وغایت مولانا کے لفظوں میں یہ ہے کہ انسان کی انانیت بیدار ہو۔ اس "انانیت" کے لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ مولانا خود اس کی تشریح ایک

اور جگہ اس طرح کرتے ہیں۔

"جب انسان میں یہ باطنی شعور بیدار ہو جاتا ہے تو وہ اس وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ "انا" کسی اور وجود برتر کا پرتو ہے، یا یہ "انسانی انا" کسی بڑے "انا" کا فیضان ہے، یہ ہے انسان کا شعور خداوند تعالیٰ کے وجود کا، سکندر نامہ میں نظامی نے اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے "توئی آنکہ تا من منم با منی" (ص ۱۰۱)

مذہب کی اصطلاح میں مولانا کی اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب کا مقصد انسان کا رشتہ خدا سے جوڑنا اور ایک ماورا ہستی کا تصور اس کے ذہن و دماغ میں پیدا کرنا ہے۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس رشتہ کے حقوق و فرائض کیا ہیں؟ اور اللہ کا تقرب کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ تو مذہب اس سوال کے جواب میں رسوم کی تعیین کرتا ہے۔ جن کو مولانا لازمی اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس حقیقت پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ رسوم محض ذرائع اور وسائل ہیں۔ اصل مقصود و مطلوب تقرب الی اللہ ہے جو مذہب کی روح اور بنیادی حقیقت ہے دونوں کی اس حیثیت کو فراموش نہ کرنا چاہئے ورنہ اگر خلط مبحث کر دیا جائیگا تو نتیجہ گمراہی اور فوتِ مقصد کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"لیکن جب لباس ہی پر زور دیا جائے اور رسوم ہی اصل مذہب کا درجہ حاصل کرلیں اور اکثریت قبلہ کو قبلہ نما سمجھنے سے عاری ہو جائے تو پھر یہ رسوم بت بن جاتے ہیں۔" (ص ۳۸)

مولانا نے یہ جو کچھ کہا کوئی عجوبہ اور انوکھی بات نہیں ہے۔ آج ہر شخص اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ ہم میں کتنے ہی جو نماز پڑھتے، روزہ رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور حج بھی کر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی یہ عبادتیں مذہب کی اصل روح سے خالی ہونے کے باعث ان کے لئے فحشا، اور منکر سے باز رہنے کا سبب ثابت نہیں ہوتیں۔ ان کے نزدیک اصل دین یہی رسوم ہیں۔ اور انھیں کے بجالانے پر انھوں نے نجاتِ اخروی کا دارومدار سمجھ رکھا ہے وہ نماز پڑھتے ہیں اور ساتھ ہی بدکاری اور شراب خوری کا بھی شغل مستمر رکھتے ہیں۔ زکوٰۃ ہر سال پابندی سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن سودی کاروبار اور حرام تجارت کرتے ہوئے بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔ حج کو جاتے ہیں لیکن حج کے بعد اپنے آپ کو تمام گناہوں سے سبکدوش تصور کر لینے کے باعث ان کو کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب میں ذرا تامل بھی نہیں ہوتا۔ بقر عید پر بجائے ایک کے دس دس قربانیاں کرتے ہیں لیکن اللہ کے راستہ میں ایک انگلی شہید کرانے کے حوصلہ سے بھی یکسر محروم ہوتے ہیں۔ عبادات کر کر کے اللہ کی توحید کا زبان سے اقرار کرتے ہیں

لیکن ان کے دلوں میں حرص وطمع، خود غرضی، زرپرستی، جاہ پسندی کے ہزاروں بتکدے آباد ہیں۔ غیر اللہ کے احکام وقوانین کی پوجا کرتے ہیں۔ چند قرصہائے سیم وزر کے لئے امیروں اور رئیسوں کے دروازوں پر جبہ سائی کرتے ہیں۔ اور ان کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے کے بجائے ان کی شان میں مدحیہ قصائد پڑھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس طرح وہ اللہ کے حقوق کو کس بیدردی سے پامال کررہے ہیں رسمی اور ظاہری طور پر نماز روزہ کی پابندی کرنے کے باوجود نہ ان کا دل مسلمان ہوتا ہے اور نہ ان کی روح مذہب کی اصل حقیقت سے آشنا ہوتی ہے ان کے اخلاق خراب ہوتے ہیں۔ معاملات میں دیانت اور راست بازی سے ان کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ زبان سے چاہے نہ کہیں مگر ان کا اندرونی جذبہ یہی ہوتا ہے کہ اگر محرمات کے ارتکاب، فواحش ومنکرات پر اصرار اور رذائل اخلاق میں انہماک کے ساتھ ساتھ وہ نماز روزہ بھی کرتے رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

کسی خاص طبقہ اور گروہ کی خصوصیت نہیں۔ آج ہر طبقہ اور ہر گروہ میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ تاجر عیاش اور شرابخور ہونے کے باوجود زکوٰۃ بھی ادا کررہا ہے۔ سرکاری افسر نماز روزہ کی پابندی کے ساتھ غیر اللہ کو اپنا خدا بھی بنائے ہوئے ہے۔ صوفی وجد ومراقبہ اور ذکر وحال کے ساتھ اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبہ سے بالکل محروم ہے۔ مولوی قال اللہ اور قال الرسول کے ورد کے باوجود حقوق العباد اور اسلامی جرأت وبیباکی اور ایک مومن کی پاک نظری سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ تو کیا یہ سب اللہ اور اس کے رسول کے مجرم نہیں ہیں۔ کیا انھوں نے خدا کو چھوڑ کر رسوم کو پوجنا شروع نہیں کردیا ہے۔ کیا یہ اصل دین کے مقصد بلند سے بے بہرہ اور محروم وناآشنا نہیں ہیں۔ دین کا اصل مقصد تھا تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن۔ پھر اگر یہ نمازیں اور یہ روزے ہی اصل دین ہیں جو محض رسمًا ادا کرلئے جائیں تو یہ تزکیہ کیوں نہیں ہوتا۔ دلوں پر کفر وشرک اور اعمالِ سیئہ کا توبرتو زنگ کیوں چڑھا ہوا ہے۔ اور یہ ظاہر وباطن کی خلافت کا سزاوار مسلمان کیوں شعلہ ہونے کے باوجود خس وخاشاک کی غلامی پر قناعت کرکے بیٹھ گیا ہے۔ اگر محض رسوم کی پابندی حزب اللہ میں داخل ہونے کے لئے کافی اور وافی ہے تو اللہ کے وعدہ کے مطابق آج اس بدنصیب قوم پر فلاح کے دروازے کیوں نہیں کھلتے اور "انتم الاعلون" کا تاج اس کے سر پر کیوں نہیں رکھا جاتا۔ آخر یہ کیا قہر ہے کہ آج وراثت ارضی کے سچے مستحق کے لئے شہرستانِ امن وعافیت میں ایک انچ زمین بھی باقی نہیں رہی۔ حکومتِ ربانی کے علمبردار اور خازن زار زلت ونکبت میں یوں

وقفِ آلام و مصائب ہو کر جبین خیر الامم کے طغرائے امتیاز سے سرفراز اور اس طرح زاغ و زغن ظلم و ستم کے پنجوں میں گرفتار ہوں۔

فآھا ثُمَّ آھا ثُمَّ آھا

اسے کون باور کریگا کہ کوئی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہو اور پھر اس کا حال یہ ہو

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبِ تنش جامۂ تار تار

تو پھر کیا اس کے صاف معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ ہم نمازیں پڑھتے ہیں مگر در حقیقت وہ نمازیں نہیں ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں مگر دراصل وہ فاقہ ہے روزہ نہیں۔ اور کیا یہ نمازیں اور یہ نمائشی روزے اس قابل نہیں کہ ان میں روح پیدا کر کے انھیں سچی نمازوں اور حقیقی روزوں کی شکل میں منتقل کیا جائے جن میں مذہب کی اصل روح کارفرما ہو اور جن پر وہ نتائج مرتب ہوں جو ان پر مرتب ہونے چاہئیں۔ پس یہ ہے مولانا کا اصل مطلب اور یہ ہے ان کی حقیقی مراد۔ چنانچہ فرماتے۔

"بے شک رسوم قابلِ احترام ہیں لیکن اس وقت تک جب تک وہ حقیقت اور حکمت سے بہرہ ور رہتی ہیں۔ لیکن جب رسوم کھوکھلی ہو جائیں اور ان کے اندر صحیح روح باقی نہ رہے تو پھر ان کا وجود و عدم برابر ہوتا ہے۔" (ص ۳۹)

صوفیاء کرام کے نزدیک جو نماز حضورِ قلب کے ساتھ ادا نہ ہو وہ نماز ہی نہیں ہے تو اگر مولانا نے یہ فرمادیا کہ جو نماز محض رسماً اور نمود و نمائش یا خود فریبی کے جذبہ کو تسکین دینے کے لئے ادا کی جائے وہ در حقیقت نماز نہیں تو فرمائیے کیا قصور کیا!

اس موقع پر اس بات کا ذکر کردینا بھی ضروری ہے کہ ہم نے خود مولانا کی زبان سے مذہب و رسوم کے فرق پر جو تقریر سنی ہے۔ اوپر کا بیان اسی کی روشنی میں ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہمارے خیال میں اس موقع پر سرور صاحب کے بیان میں غلطی ہوئی ہے۔ انھوں نے ترکِ رسوم کے ساتھ وحدتِ انسانیت کا جوڑ لگا کر اصل مسئلہ کو مغالطہ انگیز بنادیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ہم اپنے یقین کی بنا پر کہتے ہیں کہ مولانا رسوم کے بالکل ترک کے قطعاً قائل نہیں ہیں۔ بلکہ وہ غیر ذی روح کی جگہ ذی روح اور نمائشی رسوم کی جگہ حقیقی رسوم چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ فقرہ " ان کا بدلنا اور ان کی تجدید لازمی ہوجاتی ہے۔ بھی اسی پر

دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ تجدید میں اصل شے فنا نہیں ہوتی بلکہ متعدد اسباب سے اس کے اصل رُخ پر جو اوہام و ظنون کا گرد و غبار پڑ جاتا ہے اس سے اس کو صاف اور منقح کر دیا جاتا ہے۔

محدود مذہب | فاضل ناقد پوچھتے ہیں کہ مولانا کی عبارت میں محدود مذہب سے کیا مراد ہے؟ کیا اسلامی شریعت بھی اسی محدود مذہب کی فہرست میں داخل ہے" ؟ جواباً عرض یہ ہے کہ محدود مذہب سے مولانا کی مراد اسلامی شریعت نہیں ہے اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ وہ فقہی مذاہب مراد ہیں جو اسلامی شریعت کی ہی شرح کا حکم رکھتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"بد قسمتی سے لوگوں نے اپنے خاندان یا صرف اپنے ملک کے خاص اور محدود مذہب کو دینِ حق مان لیا اور جو ظاہری طور طریقوں میں ان سے مختلف ہوا اس کو کافر قرار دیا۔ (ص ۱۷۴)

ممکن ہے کسی کو اس پر تعجب ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ کسی ایک امام کی تقلید میں حد درجہ غالی ہوتے ہیں وہ اپنے امام کے مقلدین کے سوا دوسروں کو مسلمان بھی مشکل سے ہی باور کر سکتے ہیں۔ اب تو خیر یہ چیز کم ہو گئی ورنہ گذشتہ زمانہ میں خود ہندوستان میں ہی مقلدوں اور غیر مقلدوں میں جو جنگ برپا رہتی تھی وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ یا ایک زمانہ میں مصر میں حنفیوں اور شافعیوں میں جو اکھاڑہ بازی ہوئی ہے اس سے ارباب علم باخبر ہیں۔ آج بھی آپ سرحد کے بعض علاقوں میں جا کر دیکھئے کہ شامی یا ایک اور کتاب کے علاوہ ناممکن ہے کہ آپ ان کے سامنے فقہ کی کسی اور کتاب کا نام بھی لے سکیں۔ مولانا اس ذہنیت کے برخلاف زبردست احتجاج کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے وہ کسی ایک فقہی مسلک (یا مذہب) میں محدود نہیں ہے۔ کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کی وجہ سے ظاہری طور طریقوں میں بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں سے جو امتیاز پیدا ہو جاتا ہے اس کی بنا پر اپنے آپ کو دین حق پر سمجھنا اور دوسرے فقہی مذہب کے پیرووں کو کافر قرار دینا سراسر گمراہی ہے۔ خود میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ مسجدِ حرام میں بعض ہندوستانیوں نے مالکی مذہب کے لوگوں کو ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے دیکھا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ میں نے کہا "مالکی" وہ بولے "تو کیا یہ بھی مسلمان ہیں؟" میں نے کہا "شاید آپ لوگوں سے زیادہ پکے" اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح ایک ملک کے لوگ اپنے ہی محدود مذہب کے ظاہری طور طریقوں کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔ مولانا اسی پر متنبہ کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فقہاء کے اسباب اختلاف پر بحث کرتے ہوئے آخر میں فقہی مذاہب کے پیرووں کے باہمی جدل و نزاع اور تقلیدِ جامد کے مضرات پر

جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ اس سے کم نہیں جو مولانا سندھی نے اس سلسلہ میں کہا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ان لوگوں نے دین میں غور و خوض کرنا چھوڑ دیا ہے اور کافروں کی طرح یہ لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ" ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے اور ہم انہیں کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ پس خدا سے ہی فریاد ہے اور اسی پر بھروسہ اور توکل ہے۔" (ج ا ص ۱۲۳)

(باقی آئندہ)

غزل

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی

حجاباتِ کثرت میں مستور ہو کر
وہ دل میں رہے آنکھ کا نور ہو کر

خوشا دردِ فرقت زہے سوزِ پنہاں
حسین اور تم ہو گئے دور ہو کر

محبت کا حاصل وہی اشکِ غم ہے
جو آنکھوں سے ٹپکا ہو مجبور ہو کر

تصور کی تیرے زہے کام بخشی
تجھے ہم نے پایا ہے مہجور ہو کر

تمنا۔ تقاضا۔ تماشا۔ تجلی
یہ پردے اٹھا دو سرِ طور ہو کر

کمالِ توجہ ہے جذبِ توجہ
وہ ناظر ہیں خود آج منظور ہو کر

عجب طرفہ دلکش پشیمانیاں ہیں
فریبِ تمنا سے مسحور ہو کر

تغافل کے ماتے بہت سو چکے ہیں
جگا دے کوئی نغمۂ صور ہو کر

بھلا اور بھولا رہے خلدِ کشمیر[1]
طرب خیز نغموں سے معمور ہو کر

کہ جاتے ہیں دلی سعید آج ہم بھی
یہاں سے بہت شاد و مسرور ہو کر

---

[1] یہ غزل گذشتہ جولائی میں کشمیر سے واپسی کے دن لکھی گئی تھی۔ علاوہ بریں خاص کشمیر پر بھی موصوف کی ایک طویل و دلکش نظم ہے جو پہلگام میں لکھی تھی۔ بشرطِ گنجائش کسی آئندہ اشاعت میں وہ بھی درج کر دی جائے گی۔

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۴۱ء

قصص القرآن حصہ اول

قصص قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی مستند ترین تاریخ جس میں حضرت آدم سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات قبل عبور دریا تک نہایت مفصل اور محققانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت للعہ

وحی الٰہی

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے دل پذیر و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے۔ قیمت عگر

بین الاقوامی سیاسی معلومات

بین الاقوامی سیاسی معلومات میں سیاسیات میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحوں، قوموں کے درمیان سیاسی معاہدوں، بین الاقوامی شخصیتوں اور تمام قوموں اور ملکوں کے سیاسی اور جغرافیائی حالات کو نہایت سہل اور دلچسپ انداز میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ قیمت مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت عہ

تاریخ انقلاب روس

ٹراٹسکی کی مشہور و معروف کتاب "تاریخ انقلاب روس" کا مستند اور مکمل خلاصہ جس میں روس کے حیرت انگیز سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے اسباب و نتائج اور دیگر اہم واقعات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عہر

سنہ ۱۹۴۲ء

قصص القرآن حصہ دوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعاتِ عبور دریا سے لیکر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات تک ان تمام پیغمبروں کے سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی محققانہ تشریح و تفسیر جن کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ قیمت للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام

طبع جدید۔ بڑی تقطیع۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

تاریخ ملت حصہ دوم
خلافت راشدہ

تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات مستند قدیم و جدید عربی تاریخوں کی بنیاد پر صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب کالجوں اور اسکولوں کے کورس میں داخل ہونے کے لائق ہے کتاب کی ترتیب کے وقت اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے قیمت ۳

مسلمانوں کا عروج و زوال

اس کتاب میں اولاً خلافتِ راشدہ اس کے بعد مسلمانوں کی دوسری مختلف حکومتوں ان کی سیاسی حکمت عملیوں اور مختلف دوروں میں مسلمانوں کے عام اجتماعی اور معاشرتی احوال و واقعات پر تبصرہ کر کے ان اسباب و عوامل کا تجزیہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے غیر معمولی عروج اور اس کے بعد ان کے حیرت انگیز انحطاط و زوال میں مؤثر ہوئے ہیں۔ قیمت ۱۲

منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی

REGISTERED No L 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) **محسنِ خاص**:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم اڑھائی سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) **محسنین**:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔

ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی اہم مطبوعات اور ادارہ کا رسالۂ برہان بھی کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) **معاونین**:۔ جو حضرات بارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) **احبّا**:۔ چھ روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبّا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جوابِ طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) برہان کی ضخامت کم سے کم اسّی صفحے ماہوار اور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

(۶) قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۷) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ برہان قرول باغ دہلی سے شائع کی

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مُرتبہ

عتیق الرحمٰن عُثمانی

غالب

برہان

جلد سیزدہم شمارہ (۶)

ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ مطابق دسمبر ۱۹۴۴ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

جب سے کہ حیدر آباد دکن میں ندوۃ المصنفین اور برہان کا چرچا ہوا ہے وہاں کے بزرگوں اور دوستوں کی جانب سے برابر دعوت نامے موصول ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں وہاں دو تین کانفرنسیں ہوئیں ان میں بھی بلایا گیا لیکن اتفاقات کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ ہماری جانب سے ارادے ہو ہو کر ختم ہوتے رہے۔

یہاں تک کہ حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے مسلسل تقاضوں کے بعد اپنے ایک والانامے میں محبت آمیز غصہ کے ساتھ تحریر فرمایا "انتظار کرتے کرتے میں تو تھک چکا ہوں اب جب آنا ہو آؤ" مولانا مدظلہٗ کی اس تنبیہ سے کمر ہمت چست ہو گئی اور بالآخر ۳ر اکتوبر کو بمعیۃ مولانا سعید احمد صاحب ایم اے مدیر اعلیٰ برہان یہ تاریخی سفر شروع ہوا، قرارداد کے مطابق قیام مولانا گیلانی مدظلہم کے یہاں ہوا مولانا سعید احمد صاحب بعض ناگزیر ضروریات کی وجہ سے دو ہفتوں کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ راقم سطور کا قیام بالکل غیر اختیاری طور پر چھ ہفتوں تک ممتد رہا۔

خدا کا شکر ہے ندوۃ المصنفین کے لئے یہ سفر ہمہ جہت توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ بہت سے حضرات محسن ہو گئے۔ متعدد حضرات نے محسن ہونے کے علاوہ عطایائے خاص بھی مرحمت فرمائے جو حضرات اب تک ندوۃ المصنفین کے کاموں سے پوری طرح باخبر نہیں تھے وہ باخبر ہو گئے۔ جن علمی اداروں کے ساتھ باقاعدہ روابط اب تک قائم نہیں ہو سکے تھے اب ان سے ایک مستقل رشتہ ہو گیا۔ سردست اس سلسلہ میں ہم اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً۔

سرکار آصفیہ خلد ہا اللہ کے قومی۔ دینی اور علمی کارناموں سے کون بے خبر ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ سن رکھا تھا وہاں جا کر اس سے زیادہ پایا۔ اور وہاں یہ اندازہ ہوا کہ جب تک "دلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکلی نہیں تھی۔ اس وقت تک ہم یہاں کیا ہوں گے اور اب اگر پھر ہماری اپنی حکومت قائم ہو جائے تو ہم اپنی روایاتِ ملی و مذہبی۔ علوم و فنون۔ کلچر۔ اسلامی تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ بہت سی چیزیں ہیں جنھوں نے سرکارِ آصفیہ کا نام تمام عالمِ اسلام میں روشن کر رکھا ہے۔ ان میں جامعہ عثمانیہ۔ دائرۃ المعارف۔ دارالترجمہ۔ کتب خانہ آصفیہ اور سہ ماہی انگریزی رسالہ

اسلامک کلچر دراصل وہ چیزیں ہیں جن کو سرکار آصفیہ کے تاج افتخار کا گوہر شب چراغ کہنا چاہئے واقعہ یہ ہے کہ قدیم اسلامی علوم وفنون کی حفاظت وبقا اور نشر واشاعت، اردو زبان میں تمام جدید علوم کے تراجم۔ پھر اردو میں ہی ان کی اعلیٰ کلاسوں تک تعلیم "اسلامک کلچر" کے ذریعہ اسلامی علوم اور ان کے متعلقات پر نہایت بلند پایہ مضامین ومقالات کی اشاعت اور ان کی حوصلہ افزائی۔ یہ سب وہ شاندار وبے مثال کارنامے ہیں جو اس عمدگی اور فیاضی کے ساتھ بحیثیت مجموعی عالم اسلام کے کسی گوشہ میں نہیں ہورہے ہیں اور ان پر سرکار عالیہ کو جتنا بھی فخر ہو کم ہے۔

حیدرآباد میں ان تمام چیزوں کو دیکھکر احساس ہوا کہ دلّی میں مغل سلطنت کا چراغ گل ہونے کے بعد قدرت نے کس طرح سرکار عالیہ کی صورت میں مسلمانوں کے لئے امیدواریاں کا ایک چراغ روشن کردیا ہے کہ اس کی روشنی سے ہمارے عہد ماضی کے نقوش اب تک مٹے نہیں بلکہ اُجاگر ہیں۔ ہم نے جامعہ عثمانیہ کی تمام تعمیر شدہ اور زیر تعمیر عمارتیں دیکھیں اساتذہ اور طلبہ سے ملاقاتیں کیں۔ مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔ ہوسٹلز میں جاکر وہاں کے انتظامات دیکھے۔ طلبار کے طعام خانہ کا کھانا بھی کھایا۔ سائنس کالج کے مختلف شعبوں میں جاکر وہاں کے معامل تحقیقات اور میوزیم کو دیکھکر لطف اندوز ہوئے۔ دائرۃ المعارف اور دار الترجمہ میں ان دونوں اداروں کے عمال وارکان سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ بحمد اللہ کہ ہر ایک جگہ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور دل نے جو محسوس کیا وہ لفظوں میں اظہار خیال سے کہیں بلند ہے۔

مختلف نمازیں مختلف مسجدوں میں اور نماز جمعہ مکہ مسجد میں ادا کرنے کا اتفاق ہوا۔ نماز جمعہ میں ہر طرف ترکی ٹوپیوں اور شیروانیوں کو دیکھکر کیا کہا جائے کہ ہمیں کتنا کیف اور سرور حاصل ہوا۔ شہر کی عام زندگی میں اگرچہ مغربیت کے آثار نظر آتے ہیں لیکن اب بھی مشرقیت کا عنصر غالب ہے۔ اکثر لوگ ایک ہی ہندوستانی وضع قطع میں نظر آتے ہیں۔

ارباب حیدرآباد نے ہم دونوں کی جس طرح پذیرائی کی اور شاندار پارٹیاں دیکر اور نہایت پر تکلف ضیافتیں کرکے ہماری جو عزت افزائی کی ہے ہم اس کے لئے سراپا تشکر وامتنان ہیں۔ ہمارے ان مخلص دوستوں اور قدردانوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ ان صفحات میں ان سب کا شمار بھی مشکل ہے البتہ بزرگوں میں نواب مقصود جنگ بہادر۔ مولوی عبد الرحمٰن خاں صاحب صدر حیدرآباد اکاڈمی۔ اور نواب مولوی فیض الدین صاحب ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے ندوۃ المصنفین کے ساتھ

اپنی غایت درجہ دلچسپی اور قدردانی کا ثبوت دیا۔ مخلص دوستوں میں مولانا سید فضل اللہ۔ برادر محترم مولانا یعقوب الرحمن عثمانی اور مولانا دلدار علی صاحب نے جس طرح اپنے اوقاتِ گرامی کا اکثر حصہ ہمارے ساتھ گذار کر ہم لوگوں کی جو دلجوئی اور دمسازی کی ہے وہ رسمی شکریہ سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ پھر ڈاکٹر میر ولی الدین پروفیسر ہارون خاں شروانی۔ پروفیسر الیاس برنی۔ اور مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ کی ملاقات اور ان کی کرم گستری سے جو لطف و سرور حاصل ہوا ہے اس کا اثر قلب و دماغ پر اب تک ہے۔

~~~~~~~~

اس فہرست میں ہمارے مخدوم مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا نام نہ دیکھکر بعض دوستوں کو تعجب ہوگا۔ لیکن حق یہ ہے کہ مولانا کا اور ہمارا تعلق ان چیزوں سے بہت بلند ہے۔ البتہ قیامِ حیدر آباد کے زمانہ میں مولانا کی جو علمی اور عملی خصوصیتیں ہمارے علم میں آئیں انھوں نے ہمیں بے حد متاثر کیا ہے۔ مولانا اسلامیات کے متبحر اور وسیع النظر عالم اور عملاً نہایت صالح اور متقی ہیں مگر ساتھ ہی نہایت شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج بھی ہیں۔ وہ علمی و دینی مباحث کے ساتھ ساتھ موصوف کے ادبی اور مزاحیہ فقرے اور وہ عجیب مجذوبانہ اور مستانہ اندازِ کلام۔ بڑے بھائیوں کی سی بے لوث محبت اور یارانِ سرِ پل کی سی بے تکلفی۔ یہ سب چیزیں عمر بھر یاد رہیں گی۔ زیادہ قیام مولانا کے مکان پر ہی رہا۔ آخر میں دو ہفتہ کے لئے ہیں حسینی علم میں نواب مولوی عبدالعزیز خانصاحب اور نواب عبدالباسط خاں صاحب کے نہایت پرتکلف مکان میں منتقل ہوگیا تھا کہ یہ مکان ہمارے اکابر کا قدیم آشیانہ رہا ہے۔ اور ان حضرات ...... کے خاندان کو اربابِ دیوبند سے نہایت عمیق اور مخلصانہ تعلق ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ان سب بزرگوں اور دوستوں کو اس خلوص کا اجر جزیل عطا فرمائے کہ ہم خود ان کے اس خلوص کا بدلہ دینے سے عاجز ہیں۔

~~~~~~

مولانا عبید اللہ سندھی

ایک تبصرہ پر تبصرہ

(۳)

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔اے ریڈر عربی دہلی یونیورسٹی

مولانا کا ایک خط رسوم کے معاملہ میں مولانا سندھی کس درجہ "دقیانوس" اور قدامت پسند تھے اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے فاضل دوست مولانا سید ابوالنظر رضوی کا برہان میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کے بعض حصوں پر جن سے رسوم کی عدم اہمیت مترشح ہوتی تھی، نکتہ چینی کی تھی مولانا سندھی کی نظر سے جب یہ مقالہ گذرا تو آپ نے فوراً فاضل مقالہ نگار کو ایک خط لکھا اور اس میں اس مقالہ کی تحسین ان الفاظ میں کی:۔

"کل برہان پہنچا۔ آپ کے مقالہ نے ترجمان القرآن کی غلطی پر متنبہ کرکے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔ مکہ معظمہ میں جب ہمیں ترجمان القرآن ملا تو ہم نے اسی وقت سے اپنے حلقۂ درس میں اس مسئلہ کی تنقیح اور تنقید شروع کردی تھی۔ لیکن پریس میں یہ فرض آپ نے ادا کیا ہے۔ امام ولی اللہ کے متبعین کا فرض ہے کہ آپ کا شکریہ ادا کریں فجزاکم اللہ خیراً عن الاسلام واہلہ"

(گوٹھ پیر جھنڈا۔ حیدرآباد سندھ۔ سندھ ساگر انسٹیٹیوٹ ۲۰ جولائی ۲۳۰۹؁ھ سندی[1])

---

[1] مولانا سندھی نے یہ ایک نیا سنہ ایجاد کیا تھا جس کی ابتدا وہ سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے سے کرتے تھے۔

خلط مبحث نہ کیجئے۔ یہاں مقصد یہ نہیں ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں اور خود مولانا سندھی جس کو ترجمان القرآن کی غلطی بتا رہے ہیں وہ درحقیقت غلطی تھی بھی یا نہیں، مدعا صرف یہ جتانا ہے کہ مولانا ابوالکلام نے .... رسوم کے معاملہ میں ایک مقام پر جس ابہام سے کام لیا ہے مولانا سندھی کی طبیعت اسے بھی گوارا نہ کرسکی اور وہ اس سے اس درجہ بیزار ہیں کہ اس پر نکتہ چینی کرنے والے کو اسلام اور اہلِ اسلام کی طرف سے جزائے خیر کا مستحق سمجھتے ہیں اور خود اپنے حلقۂ درس میں اس کے خلاف تبلیغ کرتے ہیں۔ اب خود سوچئے کیا ایسے شخص کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ اسلامی رسوم کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

سچ پوچھئے تو ہمارے نزدیک مولانا سندھی کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ ایک طرف خیالات و افکار کے اعتبار سے نہایت شدید قسم کے انقلابی ہیں جو تمام موجودہ فاسد نظاموں کو توڑ پھوڑ کر ایک نئی دنیا صالح تہذیب و تمدن کے اساس پر بنانا چاہتے ہیں اور دوسری جانب وہ دینی رسوم وظواہر کے بھی سختی سے پابند ہیں اور ان میں کسی قسم کے ادنیٰ تساہل کو بھی روا نہیں رکھتے۔

ذی المعالی فلیعلون من تعالیٰ

ھکذا ھکذا و الا فلا لا

اسلام کی عالمگیری | پھر کیا عجیب بات ہے کہ اسلام کی عالمگیری پر جو مولانا کا ایمان و اعتقاد ہے اور جس کو دنیا سے منوانا ان کی زندگی کا ایک ایسا اہم مشن تھا جس کے لئے وہ عمر بھر جدوجہد کرتے رہے۔ ہمارے فاضل ناقد اس کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً مولانا اسلام کو عالمگیر مذہب تسلیم کرتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ مولانا کی ایک عبارت کو نقل کرکے لکھتے ہیں۔

"گویا اسلام کی حیثیت آپ کے (مولانا سندھی) نزدیک صرف ایک قومی اور ملی مذہب کی رہ گئی وہ ایک عالمگیر دین نہیں رہا" (معارف ص ۱۰۵)

مولانا نے ایک جگہ نہیں متعدد بار اسلام کی عالمگیری کا اقرار و اعتراف کیا ہے چنانچہ صفحہ ۴۴ پر ہے "اسی کے (قرآن کے) ماننے میں تمام انسانوں کا بھلا ہے" پھر صفحہ ۹۸ - ۹۹ اور ۳۷۵ پر بھی اسی عقیدہ کا اعادہ کیا ہے۔ قرآن کو آخری کتاب اور اسلام کو آخری دین بتاتے ہوئے فرماتے ہیں

"قرآن اور اسلام کی حیثیت ایک کسوٹی اور میزان کی ہے کیونکہ وہ آخر ترین کتاب اور دین ہے" (ص ۱۸۴)

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔

"بے شک قرآن قریش کی زبان اور ان کی ذہنیت[1] کے مطابق نازل ہوا لیکن تھا وہ خدا کا پیغام جو قریش کے واسطہ سے ساری دنیا کو دیا جا رہا تھا" (ص ۱۸۸)

علاوہ بریں مولانا کی وہ طویل عبارت دوسری قسط میں گذر چکی ہے جس میں آپ نے مسلمانوں کو اس پر شدید ملامت کی ہے کہ وہ اسلام کو ایک خاص ملک یا طبقہ کی ملکیت بنا کر بیٹھ گئے ہیں اور جدید آلات و وسائلِ نشر و اشاعت و تبلیغ سے کام لیکر وہ اسلام کے پیغام کو دنیا میں پھیلاتے نہیں۔

دراصل فاضل ناقد کے اس مغالطہ کا اصل باعث یہی ہے کہ انھوں نے مولانا کی نسبت یہ اعتقاد قائم کر رکھا ہے کہ مولانا وحدتِ ادیان کے باین معنیٰ قائل تھے کہ دین دین سب برابر ہیں۔ کسی ایک دین کو دوسرے دین پر مزیت و فضیلت حاصل نہیں ہے۔ اس بنا پر ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس دین کو چاہے قبول کرے۔

ہم گذشتہ سطور میں بتا چکے ہیں کہ مولانا وحدت ادیان سے ہرگز یہ مراد نہیں لیتے اور اس کو خود مولانا کی عبارتوں سے ثابت کر چکے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان کی طرح مولانا کا بھی

---

[1] یہاں ذہنیت کے لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ اس سے مراد قریش کا اندازِ فہم اور اسلوبِ بیان ہے اور یہ ہر عربی داں جانتا ہے کہ قرآن مجید قریش کے ہی اندازِ فہم اور ان کے ہی اسالیب بیان کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اس کی مفصل بحث آگے آئیگی۔

عقیدہ یہی ہے کہ اسلام دنیا کا آخری دین برحق ہے اور اب انسانیت کی نجات وعافیت کا واحد راستہ یہی ہے۔ لیکن دوسری قوموں کو اس حقیقت کا یقین دلانے اور ان کو اس مقصد تک لانے کیلئے مولانا نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ایک خالص منطقی استدلال کا طریقہ ہے۔

ایک مستقل دین | چنانچہ وہ پہلے اس بات کو باور کراتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے ایک مستقل دین کی ضرورت ہے جس سے وہ اعتقاداً اور عملاً دونوں حیثیتوں سے پورے طور پر وابستہ ہو۔ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

"وحدتِ ادیان ان معنوں میں کہ چونکہ سب دین ایک ہی ہیں اس لئے کسی ایک دین کا ماننا اور اس کے قانون پر چلنا ضروری چیز نہیں غلط چیز ہے۔" (ص ۱۵۰)

پھر اسی کی مزید تشریح کرتے ہوئے ارشاد ہے۔

"وحدتِ ادیان کو اس طرح ماننا ہزاج اور انار کزم ہے۔ شریعت طریقت پر مقدم ہے یعنی ایک شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس جماعت میں رہے اس کے اجتماعی قانون کو تسلیم کرے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے جی میں جو آئے وہ اسی کو اپنا قانون بنائے اور اسی پر چلنے کی کوشش کرے اس سے زندگی میں کوئی نظم پیدا نہیں ہو سکتا اور جماعتی زندگی کا سرے سے شیرازہ ہی بکھر جاتا ہے۔" (ص ۱۵۰)

یہ ہے منطق کے قاعدہ کے مطابق حجت کا مقدمۂ صغریٰ اب اس کے ساتھ بطور کبریٰ مولانا کی وہ عبارتیں ملائیے جن میں سے کچھ اس مضمون کی دوسری قسط میں اور دو تین ابھی گذر چکی ہیں اور جن میں مولانا نے پوری وضاحت وصراحت اور کامل وثوق واعتماد سے کہا ہے کہ "انسانیت کی نجات قرآن کے قانون کے اتباع میں ہی منحصر ہے" "اسلام دنیا کا آخری مذہب قرآن دنیا کی آخری آسمانی کتاب ہے" تو اب ان دونوں مقدموں کی ترتیب اس طرح ہوگی:۔

(۱) وحدتِ ادیان کے باوجود ایک مستقل دین کا ماننا ضروری ہے۔

(۲) اسلام ہی دنیا کا سب سے اعلیٰ دین ہے۔

اب اگر کوئی شخص ان دونوں مقدموں کو صحیح تسلیم کرتا ہے یا آپ اس سے ان کی صداقت

تسلیم کرا لیتے ہیں تو بتائیے کہ کیا اس کے بعد "حد اوسط" کو گرا کر جو نتیجہ نکلیگا وہ اس کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کا۔ ہر قوم اور ہر ملک کا مستقل دین اسلام اور صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور کرۂ ارض کے تمام بسنے والوں کو رنگ و نسل کے اختلاف اور قومیتوں کے تفاوت و تباین کے باوصف صرف دین قیم اسلام کا ہی علماً و عملاً حلقہ بگوش ہونا چاہئے۔ وھٰذا ھو المرادُ۔

اب ذرا مولانا کا وہ بیان بھی سُن لیجئے جس سے ہمارے لایق دوست مولانا مسعود عالم ندوی نے مولانا سندھی کی نسبت یہ سمجھا ہے کہ مولانا مرحوم کے نزدیک اسلام کی حیثیت صرف ایک قومی و ملی مذہب کی رہ گئی اور وہ (اسلام) ایک عالمگیر دین نہیں رہا۔ مولانا کا بیان من وعن حسب ذیل ہے۔

> عقیدہ وحدت الوجود۔ وحدتِ ادیان اور ایک مستقل دین کی جو بالترتیب جدا جدا حیثیتیں ہیں انکی وضاحت کرتے ہوئے ایک دفعہ مولانا (سندھی) نے فرمایا کہ ان کی مثال انسانیت، بین الاقوامیت اور قوم کی ہے۔ میں انسانیتِ عامہ پر عقیدہ رکھتا ہوں اور اسی بنا پر میں بین الاقوامیت پر بہت زور دیتا ہوں۔ لیکن انسانیت اور بین الاقوامیت پر عقیدہ رکھنے سے میرے نزدیک یہ لازم نہیں آتا کہ قوم کے مستقل وجود کو نہ مانا جائے۔ قوم، بین الاقوامیت اور انسانیت ایک سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بعینہ میرا شخصی عقیدہ میرا قومی اور ملی مذہب وحدتِ ادیان اور وحدت الوجود ذہنی کے ارتقائی منازل ہیں۔"

مولانا نے اس بیان میں تین چیزوں (وحدت الوجود۔ وحدتِ ادیان اور مستقل دین) کے باہمی رابطہ و نسبتی پر روشنی ڈالی ہے اس لئے پہلے ان میں سے ہر ایک کی اصل حقیقت الگ الگ معلوم کر لیجئے اور پھر ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں کونسا علاقہ ارتباط ہے۔

وحدت الوجود ہم اس عالم میں دیکھتے ہیں کہ بہت سی چیزیں اپنی اصل حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ گھوڑا اور انسان دونوں مختلف النوع ہستیاں ہیں۔ لیکن

اس کے باوجود جنس یعنی حیوانیت میں ایک ہیں۔ اس جنس کے ساتھ "ناطق" کی فصل لگائیے تو اس سے ایک نوع انسان کی حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر اسی جنس کے ساتھ "صاہل" کی قید لگالیں تو اب ایک دوسری نوع یعنی گھوڑا اس سے پیدا ہوتی ہے۔

پھر ذرا اور آگے بڑھئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ جڑی اور بوٹی، پھل پھول اور ترکاریاں۔ یہاں تک کہ عالم جمادات کی کوئی چیز مثلاً اینٹ پتھر، لعل و زمرد و زر و گوہر۔ ان سب کو ایک طرف رکھئے اور دوسری طرف انسان زید و عمر، بکر و خالد۔ ان کو رکھئے اور اب دیکھئے کہ ان سب میں صرف نوع کا اختلاف نہیں ہے بلکہ جنس کے مرتبہ میں بھی یہ باہم متضاد و متناقض ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں بھی ایک مابہ الاشتراک چیز موجود ہے جس کو جنس اعلیٰ کہتے ہیں اور جو جوہر یا وجود کہلا سکتا ہے۔ پھر عرض عام اور خاصہ میں جو فرق ہے اس کو بھی نہ بھولنا چاہئے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذاتیات میں اتفاق کے باوجود بعض چیزیں دوسری چیزوں سے اپنے اوصاف عرضی یا صفات لازمہ کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔

غرض یہ ہے کہ مابہ الاشتراک اور مابہ الاختلاف کا یہ ایک ایسا قدرتی قانون ہے جو کارگاہ ہست و بود کی تمام اشیاء میں جاری و ساری ہے۔ دنیا کی کوئی دو چیزیں ایسی لے لیجئے جو اپنی ماہیت و کنہ کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ مختلف ہوں آپ دیکھیں گے کہ ان میں بھی کوئی چیز مابہ الاشتراک ضرور ہوگی۔ یہاں تک کہ اگر جسمیت بھی نہیں ہوگی تو کم از کم وجود کے مرتبہ میں وہ بے شبہ مشترک ہوں گی۔ اشتراک کا یہی وہ اعلیٰ اور انتہائی ترقی یافتہ تصور ہے جس کی وجہ سے غالب نے کہا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اور ایک غالب کیا فارسی اور اردو کے تمام صوفی شاعر اسی حقیقت کو بیان کرتے آئے ہیں لیکن میرے خیال میں غالب نے قطرہ اور سمندر کی مثال دیکر جس طرح وحدت الوجود کے مسئلہ کو سمجھایا ہے وہ زیادہ اقرب الی الفہم ہے۔

صوفیاء اسلام میں حضرت شیخ اکبر محی الدین بن عربیؒ بعض علماء کے نزدیک وحدت الوجود کے عقیدہ کی وجہ سے مورد الزام ہیں۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شیخ اکبر کے بعض شارحین نے

حضرتِ شیخ کے عقیدہ کی تشریح اس انداز میں کی ہے کہ اس سے وحدت الوجود عینی کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی تصریح کے مطابق حضرت شیخ وحدت الوجود ظلی کے قائل تھے اور یہ ایک ایسی حقیقتِ ثابتہ ہے جس کو ہر سمجھدار انسان تسلیم کرے گا اور اس کے ماننے سے نہ کفر لازم آتا ہے اور نہ حق و باطل کا امتیاز فنا ہوتا ہے۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہ نے اس حقیقت کو ایک نہایت دلپسند مثال سے اس طرح سمجھایا ہے کہ آپ ایک شمع لیجئے اور اس کے چاروں طرف مختلف رنگوں کے شیشے لگا دیجئے آپ دیکھیں گے کہ ہر شیشے سے اس کے رنگ کے مطابق ہی رنگین روشنی منعکس ہو رہی ہوگی۔ لیکن کیا یہ روشنی خود شیشہ کی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ دراصل وہی ایک شمع کی روشنی ہے جو مختلف رنگ کے شیشوں سے منعکس ہو ہو کر باہر نمودار ہو رہی ہے اگر ان شیشوں میں سے کسی ایک رنگ کا شیشہ وہاں سے ہٹا لیا جائے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس رنگ کی روشنی بھی فنا ہو جاتی ہے لیکن جب تک شمع جل رہی ہے اسوقت تک مطلق روشنی فنا نہیں ہو سکتی وہ بہر حال قائم رہیگی۔

پس یہی حال وجود کا ہے۔ وجودِ واجب کا آفتابِ حقیقت ازل سے ضوفشاں ہے اور ابد تک رہیگا۔ اس میں نہ تغیر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ زوال۔ وہ ہر صفت و خاصۂ حدوث سے منزہ ہے۔ اس کے علاوہ عالم موجودات میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ اس وجود کا عین نہیں بلکہ اسی کا پرتو، اسی کا ظلی نقش۔ اور اُسی کا ایک جلوۂ گریزاں ہے اور یہ سب مختلف جلوے محض اس وجہ سے ہیں کہ اصل آفتاب حجابِ غیب میں ہے ورنہ جس طرح شمع شیشوں کے حجاب سے باہر آجائے تو تمام رنگین روشنیاں یکقلم فنا ہو جائیں۔ اسی طرح اگر اس آفتابِ وجودِ حقیقی کی ایک اصل شعاع بھی پردۂ غیب سے باہر آجائے تو اس کا انجام وہی ہوگا جو رَبِّ اَرِنی کے داعی کا طور پر اور خود طور کا ہوا۔ آسمان کی نیلگوں چھت پر تمام رات چاند اور ستارے جگمگاتے رہتے اور اپنی روشنی کے تاروں پر ربابِ ہستی کے گیت گاتے رہتے ہیں لیکن جونہی مشرق کے تختِ زریں پر خورشید خاور کے جلوہ افروز ہونے کا غلغلہ بلند ہوتا ہے اور صبح صادق کا نقیب اس کا اعلان کرتا ہے تو پھر یہ تمام ستارے اور سیارے روپوش

ہوجاتے ہیں اور کہیں نظر بھی نہیں آتے۔ حالانکہ ان سب کی چمک دمک اور روشنی و تابش جو کچھ بھی تھی وہ اسی آفتاب کی عطا بخشیوں اور کرم پاشیوں کا نتیجہ تھی۔ سمندر کی سطح پر بلبلے اٹھ اٹھکر رقص کرتے رہتے ہیں اور اس طرح دیکھنے والوں کو اپنی انفرادیت کے وہم میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ لیکن جب اسی سمندر کی موجیں بپھرتی اور اٹھلاتی ہوئی آتی ہیں تو یہ سب بلبلے اپنی انفرادیت کا جامۂ مستعار اتار کر موجوں کی آغوشِ روانی و بیقراری میں آسودۂ سکون ہوجاتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تفہیمات اور الخیر الکثیر میں اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے عبقات میں اس مسئلہ کو مختلف مقامات پر اس عجیب و غریب انداز سے سمجھایا ہے کہ پڑھکر سرور حاصل ہوتا ہے اور طبیعت پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اسی کو اپنے لفظوں میں حتی الوسع آسان تر پیرایۂ بیان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

بہر حال مقصد یہ ہے کہ بعض لوگ جو وحدت الوجود کے عقیدہ کو اسلام کے خلاف یا اُس کے لئے مضر سمجھتے ہیں وہ بے شبہ غلطی پر ہیں۔ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ شیخ اکبرؒ کے اس عقیدہ کے سخت مخالف تھے۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے دونوں میں صلح صفائی کرادی ہے۔ چنانچہ مولانا سندھی فرماتے ہیں۔

> "شاہ صاحبؒ ابنِ عربیؒ کے عقیدۂ وحدت الوجود کو صحیح مانتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ امام ربانیؒ کے فکر کو بھی ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دونوں بزرگوں میں اصولاً کوئی فرق نہ تھا۔ امام ربانی نے جس خیال کو وحدت الشہود سے تعبیر کیا ہے وہ ابن عربی کے وحدت الوجود میں خود موجود ہے۔" (ص ۳۲۱)

وحدت الوجود کی اس تعبیر کے بعد جس کی رو سے وہ وحدت الشہود کے ساتھ جمع ہوجائے کائنات اور خالقِ کائنات کے مترادف کا خیال کبھی پیدا نہیں ہو سکتا جو تمام فسادوں کی جڑ ہے اور جس سے دین کی بنیاد بے شبہ منہدم ہوجاتی ہے بلکہ اب اس صورت میں جب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "من انا" میں کون ہوں؟ تو اندر سے جواب ملتا ہے "عبدہٗ" میں اس کا بندہ ہوں جو میرے وجود کا

سرچشمہ ہے۔ اس جواب کے بعد وہ اپنے اور اس سرچشمۂ وجود کے تعلق پر غور کرتا ہے اور اس تعلق کے فرائض وواجبات کو معلوم کرنے کے لئے اسے ایک دین کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح وحدت الوجود کا تصور اس کو دین سے ہٹاتا نہیں بلکہ دین کی ضرورت کو اور اس کے ذہن ودماغ میں مستحکم کردیتا ہے اور وہ ایک دین قبول کرلیتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ وحدت الوجود کے عقیدہ کا کوئی تعلق مذہب سے اور خصوصاً ایسے مذہب سے ہرگز نہیں ہوسکتا جو دنیا کو مابعد الطبیعاتی حقائق بتانے نہیں آیا۔ بلکہ انسانی زندگی کو عملی طور پر ہموار و پُرعافیت بنانے اور اس کے اصول وضوابط کی تلقین کرنے آیا تھا۔ تاہم اس عقیدہ کا تعلق منطق اور فلسفہ سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ انسان کے خود اپنے باطنی شعور ووجدان سے ہے۔

ومن العجائب ان المخوۃ بذکرھا

ولقد اغار بان یمر بخاطری

اور خود قرآن میں مجھکو اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے متعدد مواقع پر موت کو رجوع الی الرب سے تعبیر کیا ہے۔ لفظ رجوع اور رب ان دونوں میں اسی حقیقت کا سراغ ملتا ہے۔

بحث بڑی دلچسپ اور پرلطف ہے اور اس پر خوب سیر حاصل گفتگو کی جاسکتی ہے مگر یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ وحدت الوجود وجدانی طور پر ایک حقیقتِ ثابتہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اشیاءِ عالم میں تعینات وتشخصات کا فرق وامتیاز ہے اور اس فرق کے مطابق ہی ان کے لئے جنسی نوعی اور صنفی احکام جدا جدا ہیں۔ دنیا کی مختلف قومیں رنگ ونسل اور ملکی آب وہوا کے اختلاف کے باعث طبعی خصائل میں مختلف ہیں۔ لیکن چونکہ انسانیت میں ایک ہیں اس بنا پر انسان ہونے کی حیثیت سے جو ایک قانون ایک قوم کے لئے فائدہ مند ہوگا وہ دوسرے کے لئے بھی ضرور ہوگا بس یہاں سے وحدتِ ادیان کا تخیل پیدا ہوتا ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ قانون کا یہ اشتراک صرف اصول وکلیات کی حد تک ہوسکتا ہے

جزئی اور فروعی تفصیلات میں لامحالہ اختلاف ہوگا۔ مثلاً کھانا پینا اور بدن ڈھانکنا۔ تمام انسانوں کیلئے من حیث الانسان یکساں ضروری ہے۔ لیکن ملکی آب وہوا کے لحاظ سے کوئی قوم چاول زیادہ کھاتی ہے اور کوئی گیہوں زیادہ۔ کسی قوم کے لئے گوشت لابدی ہے اور کسی کے لئے پھل اور ترکاریاں۔ اسی طرح کوئی قوم کسی خاص تراش وخراش کے کپڑے پہنتی ہے اور کوئی اور دوسری قسم کی وضع قطع اختیار کرتی ہے۔ اصولِ معیشت میں سب متفق ہیں لیکن فروغ میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہر قوم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کا ایک مجموعۂ دساتیر حیات یا زندگی کا ایک لائحۂ عمل جدا ہو۔ بس یہ وہ چیز ہے جس کے باعث مستقل دین کی ہر قوم کو ضرورت ہے۔

اب وحدت الوجود کا عقیدہ۔ وحدتِ ادیان اور مستقل دین، ان تینوں کو سامنے رکھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں بیک وقت جمع ہو سکتے ہیں۔ مابہ الاشتراک کے باعث وحدت الوجود اور وحدتِ ادیان کا تحقق ہوگا اور مابہ الاختلاف کے باعث ایک الگ مستقل دین کا۔

جناب ناقد اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہر قوم کا مستقل دین الگ ہو گیا اور اسلام عالمگیر دین نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں ہاں بیشک اگر مولانا سندھی صرف اتنی بات کہکر چپ ہو جاتے تو بے شبہ مولانا کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ مضمون پیدا ہو سکتا تھا لیکن جب وہ بار بار اس حقیقت کا یقین دلا چکے ہیں کہ اسلام ہی تمام انسانوں کے لئے نجات وعافیت کا واحد راستہ ہے تو اب مولانا کی مذکورہ عبارت سے ہرگز یہ شبہ پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے یہ نتیجہ کسی طرح اخذ کیا جا سکتا ہے۔ بات دراصل یہی ہے کہ مولانا نے ہر قوم کے لئے ایک مستقل دین کی ضرورت کا جو تذکرہ کیا ہے وہ صرف حجت اور دلیل کے لئے مقدمہ صغریٰ کا حکم رکھتا ہے۔

پہلے مولانا ہر قوم سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے لئے کسی ایک خاص دین کو منتخب کرلیں اس پر چلیں۔ انارکزم یا علمی مزاج کو ترک کر دیں۔ جب یہ قومیں اپنے لئے دین کی ضرورت کو تسلیم کر لیتی ہیں تو اب مولانا ان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اسلام کو اختیار کریں کیونکہ اسلام ہی صرف ایک ایسا مذہب ہے جو تمام قوموں کے لئے ایک مستقل دین بن سکتا ہے اور دنیا کی تمام قومیں

اپنے طبعی افتادِ مزاج کے اختلاف کے باوجود اس کو اپنا سکتی ہیں۔ اس میں اتنی لچک ہے کہ ہر شخص اپنی ملکی آب وہوا کے زیرِ اثر ہونے کے باوصف اس پر عمل کر سکتا ہے جس طرح عرب کا ایک جبہ پوش و دستار بوسر مسلمان مسلمان ہے اسی طرح یورپ کا ایک کوٹ پتلون پہننے والا بھی مسلمان ہو سکتا ہے جس طرح چٹائی یا فرش پر کھانا کھانا اسلام میں رخنہ نہیں ڈالتا اسی طرح میز کرسی پر بیٹھکر کھانا کھانا بھی ناجائز نہیں ہے۔ گوشت کھانا جس طرح مباح اور جائز ہے۔ اسی طرح گوشت نہ کھانا کوئی معصیت اور گناہ نہیں ہے۔ گھوڑوں اور اونٹوں کی سواری کی طرح موٹروں میں سوار ہونا۔ ریلوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرنا بھی جائز اور درست ہے۔

پس جب اسلام ہر قوم کو اس بات کا حق دیتا ہے کہ وہ اس کے بتائے ہوئے اصولِ معاشرت کے ماتحت اپنی قومی اور ملکی وجغرافیائی ضرورتوں کے مطابق کھانے پینے اور رہن سہن کے جزئی طریقوں کی ایک خاص شکل وصورت متعین کر سکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے دین کو اختیار نہ کیا جائے۔ علی الخصوص جبکہ تمام ادیان کی صداقتیں اور سچائیاں اس کے اندر سما گئی ہیں وہ سب کچھ ہے اور کوئی اس جیسا نہیں۔ جس بام ودر پر سورج کی روشنی سے فیض حاصل کیا جاسکتا ہو وہاں چراغ جلا کر روشنی کرنے کی کوشش کرنا پرلے درجہ کی حماقت اور بیوقوفی نہیں تو کیا ہے؟ آپ نے دیکھا عصرِ حاضر کے ذہن کو پہلے مذہب کی ضرورت جتانا اور پھر اس کے سامنے اسلام کی صداقت پر زور دینا مولانا کا کس قدر عمدہ اور پسندیدہ وحکیمانہ طرزِ تبلیغ ہے۔

قومی رجحانات کا اسلام میں لحاظ

ہمارے محترم دوست کو "قومیت" کے لفظ سے، خدا جانے اس میں کیا بس بھرا ہوا ہے۔ بڑی چڑ ہے۔ وہ بار بار مولانا کو قومیت اور وطنیت کا طعنہ دیتے ہیں۔ اس جوش میں انھیں اس کی بھی خبر نہیں رہی کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور اصل اسلام کس چیز کا داعی ہے چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اسی قومیت اور وطن پرستی کے نشہ میں مولانا عربوں، اور عربی زبان اور عربی قرآن کے بارہ میں ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو ہمارے نزدیک اسلام کی روح کے سراسر

خلاف ہیں۔ ملاحظہ ہو "بے شک قرآن کا پیغام سب قوموں کے لئے تھا لیکن آپ کی بعثت کا پہلا مقصد یہ تھا کہ قریش کی اصلاح و تہذیب . . . . چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں ایک قومی اور دوسری عمومی اور بین الاقوامی (ص ۱۹۱)

آگے چل کر مولانا کی ایک اور عبارت نقل کرتے ہیں جو درج ذیل ہے۔

اسلام قومیتوں کا انکار نہیں کرتا وہ قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے وہ قومیت جو بین الاقوامیت کے منافی ہو وہ اس کے نزدیک بیشک مذموم ہے لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سرے سے نہ رہے مولانا کے خیال میں ناممکن ہے۔" (ص ۱۹۶)

اسلام کی دعوت لا قومیت کی دعوت نہیں تھی بلکہ اس نے قریش کی قومیت کو ایسی شکل دیدی کہ وہ بین الاقوامیت کے مرکز بن گئے۔

"مولانا عبید اللہ سندھی" نامی کتاب سے اوپر کی دو عبارتیں نقل کرنے کے بعد جناب ناقد فرماتے ہیں۔

"ایک مسلم کی حیثیت سے ہمیں مولانا کے اس فکر کو قبول کرنے سے انکار ہے۔ اسلام قومیتوں کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہی نہیں۔ اسلام قومیت کی تعمیر نہیں کرتا وہ حزب کی تشکیل کرتا ہے۔" (معارف ص ۱۷۵-۱۷۶)

جناب ناقد کی جو عبارتیں ابھی گذر چکی ہیں ان سب کو پیشِ نظر رکھنے سے چند مسائل زیرِ بحث آجاتے ہیں۔

(۱) کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دو قسمیں تھیں ایک عامہ اور دوسری خاصہ۔

(۲) عربوں کو کیا دوسری قوموں پر فضیلت ہے اور کیا قرآن مجید کی تلاوت اس کو سمجھے بغیر کرنا ثواب ہے۔

(۳) کیا اسلام قومیتوں کا بالکل منکر ہے؟

اب آئیے ان میں سے ہر ایک مسئلہ پر بالترتیب گفتگو کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دو قسمیں

جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے ہمیں اس سلسلہ میں کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ "مولانا عبید اللہ سندھی" نامی کتاب میں مولانا کا جو دعویٰ نقل کیا گیا ہے تو ساتھ ساتھ اس کی دلیل بھی حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب تفہیمات سے نقل کر دی گئی ہے۔ ہم اس موقع پر خود شاہ صاحبؒ کی اصل عربی عبارت بقید صفحہ نقل کرتے ہیں۔

واعلم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	اور جانو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں
اجتمعت فیہ خصلتان احدھما	دو صفتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ایک نبوت
النبوۃ والثانیۃ سعادۃ قریش بسببہ	اور دوسرے آپ کے ذریعہ قریش کا عزت
فالنبوۃ عمت کل الاصناف والاحمر	و برتری حاصل کرنا۔ نبوت تو تمام اقوام
والاسود مستویان فیما یرجع الی الفیض	انواع کے لئے تھی اور کالے گورے اس فیض
الذی ھو من باب النبوۃ . . . واما	کے حاصل کرنے میں برابر تھے جو نبوت کے
سعادۃ قریش فبسببھا کانت خلافتھم	دروازہ سے پہنچ رہا تھا۔ اب رہی قریش کی
الی زمان طویل۔ [1]	سعادت تو اس کی وجہ سے ان کی خلافت ایک طویل زمانہ تک رہی۔

حضرت شاہ صاحبؒ دہلوی اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں۔

وللنبی صلی اللہ علیہ وسلم تارات	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مختلف
فتارۃ یتکلم من جھۃ نبوتہ وتارۃ	اوقات ہیں۔ پس کبھی آپ اپنی نبوت (عامہ)
یتکلم من جھۃ کونہ منشأ	کی حیثیت سے کلام فرماتے ہیں اور کبھی آپ
لسعادۃ قریش۔ [2]	قریش کے لئے منشار سعادت ہونے کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں۔

---

[1] و [2] تفہیمات الٰہیہ ج ۱ ص ۲۰۳۔

شاہ صاحبؒ کی مراد جیسا کہ ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے یہ ہے کہ بے شبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے تمام قوموں اور ملکوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے لیکن آپ کی بعثتِ اولیٰ خود آپ کی قوم قریش کی طرف تھی۔ آپ نے اس قوم کو سنوارا۔ اس کے فطری قویٰ کو بیدار کیا اس میں جو اچھی عادتیں تھیں ان کو چمکایا اور جلا دی۔ اور جو خصائل ذمیمہ اور رسومِ قبیحہ تھے ان سے ان کو باز رکھا۔ چونکہ آپ کی اولین بعثت عرب کی ہی طرف تھی۔ اس لئے آپ خود عرب کے بہترین خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ پر عربی زبان میں قرآن نازل ہوا۔ اور عربوں کے ہی اندازِ فہم اور مزاج خطاب و کلام کے مطابق۔ پھر جب یہ قوم "خیر امۃ" اور "امۃ وسطا" کا مصداق ہو گئی تو اب آپ نے اس قوم کو دنیا کے لئے بطور نمونہ کے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کا اسوۂ عمل تمام دنیا کے لئے دستور العمل ہے اور صحابہ سب کے سب "مثل ستاروں" کے ہیں، ان کی شان میں کوئی بے ادبی کا لفظ کہنا معصیت اور گناہ ٹھہرا۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ایک عالمگیر پیغام تھا اور صحابہؓ اس کے عملی نمونہ تھے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک صحابی کی تخصیص نہیں کی۔ بلکہ فرمایا "باِیھم اقتدیتم اھتدیتم" یعنی جس کسی کی تم اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

غور کیجئے اس تعمیم میں نکتہ یہی ہے کہ اگر کوئی قوم کسی ایک خاص صحابی کی زندگی کو اسوہ نہیں بنا سکتی تو وہ کسی دوسرے صحابی کی زندگی کو اسوہ بنا لے۔ صحابہ میں مختلف مزاج اور طبیعت کے بزرگ تھے اور بحیثیت مجموعی ان کی زندگیوں میں ایسی گوناگونی ہے کہ ہر قوم کو اپنی طبعی ضرورتوں کے لئے ان میں روشنی مل سکتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے بعثت کی یہ دو قسمیں حجۃ اللہ البالغہ میں بھی بیان کی ہیں۔ چنانچہ ہم ذیل میں جو عبارت درج کرتے ہیں اس سے شاہ صاحبؒ کا مطلب اور واضح ہو جاتا ہے بعثت کی ایک قسم بتانے کے بعد فرماتے ہیں۔

واعظم الانبیاء شانا من لہ نوع اور تمام انبیاء میں سب سے زیادہ عظیم الشان

اخر من البعثة ایضاً وذالک ان یکون مراد اللہ تعالیٰ فیہ ان یکون سببا لخروج الناس من الظلمات الی النور وان یکون قومہ اخرجت للناس فیکون بعثہ یتناول بعثا اخر الی الاول وقعت الاشارۃ فی قولہ تعالیٰ ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم الآیۃ والی الثانی قولہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین۔ [1]

وہ نبی ہوتا ہے جس کو ایک اور بعثت بھی حاصل ہوتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہ نبی لوگوں کے ظلمت سے نور کی طرف نکل آنے کا باعث ہوتا ہے اور اس کی قوم لوگوں کیلئے پیش کی جاتی ہے۔ اس بنا پر اس کی بعثت بعثت کی ایک اور قسم پر مشتمل ہوتی ہے چنانچہ پہلی بعثت کی طرف قرآن مجید کی آیت ھو الذی بعث فی الامیین الآیہ میں اشارہ کیا گیا ہے اور دوسری بعثت کی طرف کنتم خیر امۃ الآیہ میں اشارہ ہے۔ علاوہ بریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم لوگ آسانی کرنیوالے بنا کر مبعوث کئے گئے ہو نہ کہ دشواری اور سختی کرنیوالے۔"

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مفسرین میں اس میں اختلاف ہے کہ "کنتم خیر امۃ" میں خطاب عام اور تمام مسلمانوں کے لئے ہے یا خاص ان لوگوں کو ہے جو براہِ راست مشکوٰۃ نبوت سے سرفراز ہو رہے تھے۔ حبر امت عبداللہ بن عباسؓ سے دونوں قول مروی ہیں۔ حضرت عکرمہ سے جو روایت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاب عام مسلمانوں کو تو کیا تمام صحابہ کو بھی نہیں ہے بلکہ صرف چند مخصوص صحابہ کو ہے [2]

بہرحال جو لوگ خطاب کو عام مانتے ہیں وہ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ اولاً وبداہتہً تو یہ خطاب خاص صحابۂ کرام کے لئے ہی ہے۔ نہایۃً عام مسلمانوں کو بھی ہے۔ لیکن اوپر حضرت شاہ صاحبؒ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۶۷ - [2] روح المعانی ج ۴ ص ۲۵ -

کی جو عبارت گذری ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب تخصیص کے حق میں ہیں اور وہ اس کا مخاطب صحابۂ کرام کو ہی مانتے ہیں۔ اور غور کیجئے تو یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ کنتم جمع حاضر کا صیغہ ہے اس بنا پر اس آیت کے نزول کے وقت جو لوگ مسلمان تھے وہی اس کے مخاطب ہو سکتے ہیں پھر "خیر امۃ" ہونے کا جو سبب بتایا گیا ہے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور وہ بھی بصیغۂ حاضر۔ اس بنا پر "خیر امۃ" وہی قوم ہوگی جو اس فرض کو ادا کرے۔ کسی ملک کے لوگ اگر مسلمان ہیں لیکن اس فرض کو ادا نہیں کر رہے ہیں تو بے شبہ وہ خیر امت کے شرف کے مستحق نہیں ہیں اور اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عہدِ صحابہ کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض مسلمانوں نے اجتماعی اور قومی حیثیت سے غالباً کبھی ادا نہیں کیا۔ پھر حضرت شاہ صاحب نے آخر میں جو حدیث نقل کی ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

ذرا سوچئے ارشاد نبوی ہے "بعثتم" تو کیا یہ مبعوثیت عہد اموی و عباسی کے، یا آج کے مسلمانوں کی صفت ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ صرف اسی گروہ کی صفت ہو سکتی ہے جو اپنے عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے دوسروں کے لئے ایک حقیقی شمع ہدایت کا کام کرے اور بے شبہ یہ وصف مجموعی اعتبار سے صحابۂ کرام ہی کا تھا۔

حضرت شاہ صاحب بعثت کے ہی سلسلہ میں آگے چلکر فرماتے ہیں۔

ونبینا صلی اللہ علیہ وسلم	اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمجھانیوالوں
استوعب جمیع فنون المفہمین	کے تمام فنون کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور
واستوجب اتم البعثین۔ [1]	بعثتوں کی دونوں اتم قسموں پر حاوی ہیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت عمیق اور بڑی حکیمانہ و دلپذیر بات کہی ہے۔ آپ نے اور متعدد مواقع پر بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ہم بخوف طوالت اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۶۷۔

مولانا سندھی نے حضرت شاہ صاحبؒ کے اتباع میں بعثت کی جو دو قسمیں بیان کی ہیں تو انھوں نے کسی نئی بدعت کا ارتکاب نہیں کیا۔ مولانا شبلیؒ نے الکلام میں (از صفحہ ۱۰۵ تا صفحہ ۱۱۱) اسی بات کو بہایت بسط و تفصیل سے حضرت شاہ دہلوی کے علاوہ امام رازی اور ابن رشد کے بیانات کی روشنی میں لکھا ہے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کی ایک طویل عبارت نقل کی ہے۔ پوری عبارت کا نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لئے ہم ذیل میں صرف مولانا شبلیؒ کے لفظوں میں اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں وھوھذا۔

"یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے اس کو اور چند اصول کی جو اصولِ مذکورۂ بالا کے علاوہ ہیں حاجت پڑتی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہِ راست پر بلاتا ہے، اس کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کو پاک بنا دیتا ہے۔ پھر اس کو اپنا دست و بازو قرار دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ امام دنیا کی تمام قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے اس لئے ضروری ہوا کہ اس کی شریعت کی اصلی بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو۔ اس کے ساتھ خاص اس کی قوم کے عادات اور مسلّمات کے اصول بھی لئے جائیں۔ اور ان کے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے۔ پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم یا ہر پیشوائے قوم کو اجازت دیدی جائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں۔ ورنہ تشریع محض بیفائدہ ہوگی۔ اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادات اور خصوصیات کا تجسس کیا جائے اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ شعار۔ تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادات کا لحاظ رکھا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنیوالی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں

سخت گیری نہ کی جائے۔[1] (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۳)

حضرت شاہ صاحبؒ کی عبارتوں کے جو اقتباسات اوپر نقل ہو چکے ہیں ان کو بار بار پڑھئے اور بتائیے کہ کیا مولانا عبید اللہ سندھی کے لفظوں میں ان کا صاف و صریح اور کھلا ہوا مطلب اس کے سوا بھی کچھ اور ہو سکتا ہے "بیشک قرآن کا پیغام سب قوموں کے لئے تھا لیکن آپ کی بعثت کا پہلا[2] مقصد یہ تھا کہ قریش کی اصلاح و تہذیب ہو جائے تاکہ وہ اس پیغام کو دوسری قوموں تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکیں۔ چنانچہ نبی کریم صلعم کی دو حیثیتیں ہیں ایک قومی اور دوسری عمومی اور بین الاقوامی[3]" (ص ۱۹۱)۔

لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ہمارے لائق دوست پھر بھی اس کو "اپنے نزدیک اسلام کی روح کے سراسر خلاف" سمجھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی آپ کا اعتقاد ہے کہ مولانا سندھی نے یہ جو کچھ فرمایا ہے "قومیت اور وطن پرستی کے نشہ" میں فرمایا ہے۔

وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

مولانا سندھی پر اس سے بڑھکر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ مولانا ایک حقیقتِ واقعہ کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے لفظوں میں اظہار کرتے ہیں کہ اگر ان کو حضرت شاہ صاحب کی عبارتوں کے متوازی رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی بلکہ شاہ صاحبؒ کی عبارتوں کا ہی اردو ترجمہ کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود عقل و وجدان انصاف و دیانت۔ ان سب سے روگردانی کر کے مولانا کو "قومیت اور وطن پرستی" کے نشہ سے مست ہونے کی تہمت لگائی جا رہی ہے۔ اور اگر انصاف کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹا

---

[1] الکلام ص ۱۱۴ و ۱۱۵

[2] اس لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ مراد اس سے عددی اول ہے۔

[3] افسوس ہے کہ جناب تبصرہ نگار نے مولانا کی اس عبارت کو نقل کرتے وقت خط کشیدہ الفاظ کو درمیان سے حذف کر کے تبصرہ نگارانہ دیانت کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا۔

تو بھی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے آج کل کے روشناس علماء بھی اصولِ شرائع و ادیان سے کس قدر کم واقف ہیں۔

بات دراصل یہی ہے کہ جناب ناقد نے مولانا کے متعلق پہلے سے یہ خیال قائم کر رکھا ہے کہ مولانا اسلام کو بھی عالمگیر نہیں مانتے بلکہ فقط ایک قومی چیز یعنی عربوں کے لئے بلکہ شاید صرف اہلِ قریش کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں، حالانکہ مولانا ایک مرتبہ نہیں بار بار، بالکل صاف صاف اور کھلے لفظوں میں فرماتے ہیں:۔

قرآن کی تعلیمات انسانیت کی طرح عالمگیر، ہمہ گیر اور دائمی ہیں۔ وہ ہر ملک کیلئے ہیں، ہر قوم کے لئے ہیں اور ہر زمانہ کے لئے ہیں (ص ۲۴۶)

مولانا نے قومیت کا پردہ بھی اٹھا دیا ہے یعنی ان کے نزدیک قرآن ایسی تعلیمات کا حامل ہے جو عربوں کی طرح ایران و ہندوستان میں بسنے والی قوموں کے لئے شمع ہدایت اور قابلِ قبول ہے۔ فرماتے ہیں۔

"قرآن کی حکمت میں جتنی عربیت ہے۔ اتنی ہی عجمیت اور ہندوستانیت بھی ہے ایک عرب اس حکمت سے جس قدر مستفید ہو سکتا ہے اسی قدر دوسری قوم کا آدمی بھی جس کی زبان عربی نہ ہو قرآنی حکمت سے فیض پا سکتا ہے (ص ۲۴۷)

ایک اور مقام پر کس قدر صاف لفظوں میں فرماتے ہیں۔

"بے شک قریش اور عرب کی تاریخی برتری اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کی عمومی دعوت کا ذریعہ بنے لیکن جہاں تک بعثتِ محمدی کی عمومیت کا تعلق ہے سب مسلمان قومیں اس میں مساوی اور یکساں ہیں اور کسی کو دوسرے پر امتیاز نہیں۔ قریش اور عرب کی برتری استحقاق کی بنا پر بھی اس میں ذات یا نسل کو کوئی دخل نہیں۔ اسلام جتنا حجازی ہے اتنا وہ عجمی بھی ہے اور اتنا ہی وہ ہندی اور ترکی بن سکتا ہے۔" (ص ۱۹۳)

عربوں کی فضیلت ہمارے لائق دوست[1] مولانا کو عربی برتری اور عربی تفوق کا منکر بتاتے ہیں (معارف ص ۱۷۵) حالانکہ دیکھئے ابھی اوپر جو عبارت گذری ہے اس میں مولانا کس قدر صاف صاف فرماتے ہیں "بے شک قریش اور عرب کی تاریخی برتری اپنی جگہ مسلّم ہے" پھر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہے کہ "قریش اور عرب کی برتری استحقاق کی بنا پر تھی"

علاوہ بریں مولانا کی طرف سے عربوں اور عربی کی فضیلت بربنا استحقاق کا اعتراف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ مولانا عربوں کو ایک ایسی قوم مانتے ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی الٰہی تعلیمات کا ایک پیکر بنا کر دنیا کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا اور یہی عرب (مولانا کے نزدیک بھی) دنیا میں اسلام اور قرآن کے نشر و اشاعت اور عام تبلیغ کا ذریعہ بنے۔ مولانا کے خود اپنے الفاظ یہ ہیں۔

> "اسلام کے پہلے داعی عرب تھے۔ انھوں نے بڑے خلوص اور تن دہی سے اسلام کو پھیلایا۔ پورے پانچ سو برس تک عرب پیغام اسلام کے محافظ اور داعی رہے اس عرصہ میں اموی۔ عباسی اور فاطمی خلافتیں قائم ہوئیں اور انھوں نے عربی سلطنت اور عربی زبان کے ذریعہ اسلام کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔" (ص ۲۲۹)

لیکن ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ مولانا میں شعوبیت نہیں ہے اس لئے وہ اسلام کی عام تعلیم اور حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور ارشاد گرامی کے مطابق عرب کیا کسی ایک قوم کو بھی کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں محض ذات اور نسل کی بنا پر افضل اور برتر ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

---

[1] میں نے یہ لفظ رسماً نہیں لکھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھکو عربی زبان و ادب کے ساتھ بچپن سے غیر معمولی محبت اور شوق ہے اور مولانا مسعود عالم ندوی عربی کے ایک خوش ذوق ادیب ہیں اس لئے میں سچ مچ ان کو اپنا دوست سمجھتا ہوں والارواح جنودٌ مجندہ۔

عربی عصبیت کے خلاف احتجاج

اس انکار کی وجہ جیسا کہ جناب ناقد نے خیال کیا ہے. قومیت یا وطن پرستی کا جذبہ نہیں ہے بلکہ یہ دراصل شدید احتجاج ہے، اس عربی عصبیت کی نہایت تنگ ذہنیت کے خلاف جو خلافتِ راشدہ کے بعد ہی پیدا ہو گئی تھی اور جس کو عبد الملک بن مروان کے عہدِ خلافت اور حجاج بن محمد بن یوسف الثقفی کے عہد گورنری میں ہی اس درجہ فروغ ہوا کہ عربوں نے عجمیوں کے چڑانے کے لئے موالی (غلام) کے لفظ کی اصطلاح مقرر کرلی۔ حجاج نے عجمیوں کو اس ڈر سے شہر بدر کر دیا کہ وہ عربوں کے ساتھ رہ کر کہیں اچھی عربی نہ بولنے لگیں۔ ان لوگوں کے اسلام پر شک و شبہ کیا گیا کہ جزیہ کے ڈر سے مسلمان ہو گئے ہیں۔

اغانی لابی الفرج الاصفہانی کی روایت کے مطابق کسی ایک عجمی نے قبیلۂ بنو سلیم کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ ابراہیم بن ہشام اس زمانہ میں مدینہ کا گورنر تھا اس کو اس کا علم ہوا تو میاں بیوی میں تفریق کرادی اور ظالم نے اسی پر بس نہیں کیا۔ غریب شوہر کے دو سو کوڑے مارے۔ اس کا سر مونڈا۔ ڈاڑھی اور ابرو کا بھی صفایا کرایا۔

سعید بن جبیر گرفتار ہو کر حجاج کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے احسان جتاتے ہوئے کہا "سعید! جب تم کوفہ میں آئے تو کیا وہاں عرب کے علاوہ کوئی اور شخص بھی امامت کر سکتا تھا؟ مگر میں نے تم کو اس کے باوجود امام بنایا۔ لوگ کہتے تھے کہ قضا تو صرف ایک عرب کے لئے ہی سزاوار ہے مگر میں نے بایں ہمہ تم کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا" [1]

یہ تنگ اور سراسر خلافِ اسلام ذہنیت اس زمانہ کے عربوں میں کس درجہ رچ بس گئی تھی اس کا اندازہ اس عہد کے شعراء کے کلام سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جریر اموی دور کا مشہور شاعر اور فرزدق کا حریف ہے۔ ایک مرتبہ بنو العنبر کے قبیلہ میں مہمان ہوا۔ مگر بد قسمتی سے کسی نے کھانے کی تواضع نہیں کی۔ یہاں تک کہ بیچارہ کو خود کھانا خرید کر کھانا پڑا۔ شاعر تھا بڑا تنگ مزاج۔ اسے کب گوارا

---

[1] العقد الفرید ج ا ص ۲۰۷۔

کر سکتا تھا۔ ذیل کے شعروں میں دل کی بھڑاس نکالی۔

یا مالکَ بن طریفٍ اِنَّ بیعکمُ

رفد القری مفسد للدین والحسب

قالوا "نبیعکم بیعاً" فقلتُ لھُمْ

بیعوا الموالی واستحیوا العرب

دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ اس ذہنیت کا پردہ چاک کر رہا ہے ایک شاعر تو یہاں تک کہہ بیٹھا۔

انّ اولاد السراری کثروا یارَبِّ فینا

رَبِّ ادخلنی بلاداً لا أریٰ فیھا ھجینا

واقعات ایک دو ہوں تو بیان کئے جائیں۔ عربی ادب و تاریخ کی کتابیں ان سے مملو ہیں۔ اس ذہنیت کا ردِّ عمل دوسری صدی ہجری میں تحریک شعوبیہ کی صورت میں ہوا ہے جس نے درحقیقت عربی عصبیت کی شاندار عمارت میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ دونوں طرف سے کتابیں لکھی گئیں۔ پروپیگنڈے ہوئے، حرب و ضرب اور نکال و عقال تک نوبت پہنچی۔ لیکن سب سے خراب اثر یہ ہوا کہ عجمیوں کو عربوں سے مسلمان ہونے کی بنا پر جو محبت ہونی چاہئے تھی وہ نہ ہو سکی اسلام کی عالمگیری کو نقصان پہنچا اور وہ گویا صرف ایک عربوں کا مذہب سمجھا جانے لگا حالانکہ وہ تمام انسانوں کا مذہب تھا اور اس پر تمام قومیں برابر کا حق رکھتی تھیں۔

ابنِ جریر طبری اور ابنِ اثیر میں ہے کہ امویوں کی عجمیوں پر اس سختی اور ان کے ساتھ تحقیر و تذلیل کا معاملہ دیکھ کر کتنے ہی نو مسلم تھے جو پھر مرتد ہو گئے۔ لطف یہ ہے کہ ان غریبوں کو مسلمان ہونے کے باوجود جزیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا تھا۔

مولانا سندھی عربوں کی فضیلت اور جائز برتری سے انکار نہیں کرتے۔ البتہ وہ اسی ذہنیت کے خلاف پر زور صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ عربی عصبیت کا یہ اثر عربوں کی حکومت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ پوری تاریخ اسلام پر چھایا ہوا نظر آتا ہے

چنانچہ فرماتے ہیں۔

"سیاسی لحاظ سے عربوں کو عجمی دولتوں کے خلاف سرتابی کی مجال نہ تھی۔ لیکن ذہنی اور فکری دنیا میں عربوں نے اپنی برتری کو قائم رکھنے کی برابر کوشش کی چنانچہ ان کے اہلِ قلم نے تاریخ اسلام کے غیر عربی دور کو ہمیشہ زوال نکبت اور بے دینی کا عہد ثابت کیا۔ اسلام کی تاریخ کا یہ تصور ٹھیک نہیں۔" (ص ۲۴۰)

لائق ناقد مولانا کی اس عبارت پر ان لفظوں میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

"اسی قومیت کا فیض ہے کہ مولانا سندھی کی آزاد طبیعت پر تاریخِ اسلام کے غیر عربی دور کی تنقید شاق گذرتی ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے ممتاز مسلمان اہل قلم بھی عربیت کے دلدادہ ہیں مولانا ان سے بھی خوش نہیں۔" (معارف ص ۱۷۶)

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ مولانا فرما کیا رہے ہیں۔ اور ہمارے ناقد صاحب اس کا کیا مفہوم متعین کر رہے ہیں۔ مولانا نے خود علمی طور پر عربی کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں سیکھی۔ عربی وہ بہت اچھی جانتے تھے اور لکھتے تھے۔ اس لئے ان کی نسبت یہ دعویٰ کرنا کہ وہ "عربیت" سے ناخوش ہیں کس درجہ بے بنیاد دعویٰ ہے۔ اسی طرح اس موقعہ پر پھر اسی بدنام قومیت کا طعنہ دینا کہاں تک حق و انصاف پر مبنی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ مولانا نے سطور بالا میں جو کچھ فرمایا ہے وہ قومیت کے جذبے سے نہیں بلکہ "بین الاقوامیت" کے احساس سے فرمایا ہے۔

گویا ناقد صاحب کے نزدیک عربی قومیت، عربی تہذیب و تمدن، عربی کلچر اور عربی زبان کی نسبت جو کچھ کہا جائے وہ اسلامیت، عالمگیریت اور صحیح معنی میں بین الاقوامیت ہے۔ اور اس کے برخلاف عجمیت کی حمایت میں اگر کچھ کہا جائے تو وہ "قومیت" ہے، حالانکہ عرب تو ایک قوم ضرور ہے مگر عجم ایک قوم نہیں۔ عرب اپنے ماسوا سب کو عجم کہتے تھے۔ اس میں سب قومیں غیر عرب شامل ہیں۔ مولانا کا منشا تو "قومیت" کا اثبات نہیں بلکہ اسلام کا عالمگیر ہونا اور بین الاقوامی ہونا ثابت کرنا ہے۔

مولانا کو بقول ناقد صاحب غیر عربی دور کی تاریخ پر تنقید شاق نہیں گزرتی۔ البتہ وہ اسلام کی عالمگیری کے نام پر اس عرب پرستارانہ ذہنیت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ جس کے باعث ہر عربی چیز کو مسلمان اچھا سمجھتے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل ہر غیر عربی چیز کو وقعت نہیں دیتے۔

ناقد صاحب سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہو گی کہ بعض عجمی حکومتیں جو بنو عباس کے برائے نام سایہ میں عراق عجم۔ خراسان، بخارا، سمرقند و غزنین اور خود ہندوستان میں قائم ہوئیں بے شبہ عباسی خلافت سے کہیں بہتر تھیں۔ پھر کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ تاریخ میں عربی حکومتوں کا ذکر تو طمطراق اور شان و شوکت کے ساتھ کیا جائے اور ان عجمی حکومتوں کو محض عجمی ہونے کے باعث ان کے شایانِ شان اہمیت نہ دی جائے۔ اگر طغرل و سنجر اور محمود و غوری پر تنقید ہو سکتی ہے تو ہارون و مامون پر بھی ہو سکتی ہے۔ معائب اور محاسن اُن میں بھی تھے اور ان میں بھی۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔

اسلام چونکہ ہر قوم کے لئے ہے۔ عربوں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اس لئے جب عرب اس قابل نہیں رہے کہ وہ اسلام کی حفاظت کر سکیں تو خدا نے اس کی حفاظت کا کام کبھی ایرانیوں سے لیا۔ اور کبھی تاتاریوں اور ترکوں سے کبھی افغانوں نے اس بارِ امانت کو اٹھایا اور کبھی غوریوں نے۔ اس بنا پر مولانا فرماتے ہیں کہ اگر عربوں میں زوال آگیا تو یہ سمجھنا غلطی ہے کہ بس اسلام بھی اب زوال سے نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

> "بعض دفعہ ان کی (مورخین کی) باتیں پڑھکر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسلام خالص عربی تھا اور صرف عربوں کے لئے تھا۔ عربوں نے اسے بلند نام کیا وہ نہ رہے تو اسلام کو بھی زوال آگیا اور اگر اب اسلام کی قسمت میں کچھ اچھے دن لکھے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ عرب اٹھیں اور دوبارہ پھر اس میں جان ڈالیں۔" (ص ۱۹۲)

ناقد صاحب خدا کے لئے ذرا انصاف کریں اور بتائیں کہ یہ فقرے مولانا نے قومیت کے نشہ سے سرشار ہوکر کہے ہیں یا ان میں مولانا کے اس جذبہ کی جھلک نظر آتی ہے کہ اسلام ہر قوم اور ہر ملک کا ہے اور اس کی حفاظت دنیا کے تمام مسلمانوں کا یکساں فرض ہے۔ اگر آج عرب بد قسمتی سے اس کی حفاظت کے قابل نہیں رہے تو نہ رہیں۔ ہندوستان کے اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر بھی اسلام کا یکساں حق ہے۔ وہ کھڑے ہوں اور اس کی حفاظت کا فرض ادا کریں۔

اسی عرب پرستی کے خلاف احتجاج کے سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں کہ لوگ محض قرآن مجید کے عربی متن کی تلاوت کو ثواب اور عربی میں دعا مانگنے کو اسرع الی الاجابۃ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ مولانا کے نزدیک قرآن مجید کی تلاوت ثواب نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ لوگ عربی زبان سیکھیں اور قرآن کی حکمت سے فائدہ اٹھائیں۔ بے سمجھے بوجھے تلاوت کارِ ثواب ضرور ہے مگر قرآن کا جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔ سیاق صاف بتا رہا ہے کہ مولانا نے یہ فقرہ طنزاً کہا ہے۔

کیا اسلام قومیت کا منکر ہے

بعثت کی دو قسمیں اور عربوں کی فضیلت۔ ان دونوں مسئلوں پر گفتگو ہو جانے کے بعد اب آئیے اس پر غور کریں کہ اسلام قومیت کا منکر ہے یا نہیں؟ لائق ناقد کو "قومیت" کے لفظ سے اس قدر شدید چڑ ہے کہ اس کو برا کہتے کہتے زبان کے ساتھ خود ان کا ذہن بھی بگڑنے لگا ہے۔ کس جرأت سے کہتے ہیں۔

> "اسلام قومیتوں کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہی نہیں" "اسلام قومیت کی تعمیر نہیں کرتا۔ نسل اور جغرافیہ والی قومیت کا تصور بھی اس کے قریب نہیں پھٹکنے پاتا" (ص ۷۶)

گذشتہ ناقدانہ بیانات کی طرح قومیت کی نسبت یہ دعاوی بھی سراسر غلط، بے بنیاد اور قطعاً لچر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناقد صاحب نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا کہ تشریعِ احکام میں کن چیزوں کی رعایت ہوتی ہے اور نیز یہ کہ ایک شریعت کو عملاً دنیا میں رائج

کرنے کے لئے اس میں کتنی لچک درکار ہوتی ہے۔

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

بعثت کے سلسلہ میں جو بحث اوپر گذر چکی ہے اسے ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمائیے۔ علاوہ بریں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ[1] جلد اول صفحہ ۴۱-۷۱-۸۳-۹۴- اور تفہیمات الٰہیہ[2] ج ۲ ص ۲۳-۱۱۳ میں اصلاً اور حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۲۰-۶۸- اور ج ۲ ص ۱ پر اس مسئلہ کو نہایت تفصیل سے اور مختلف عنوانات کے ماتحت بیان کیا ہے۔ ان سب کا استیعاب کیا جائے تو ایک کتاب درکار ہے۔

ہم ذیل میں نہایت مختصر طور پر بعض حصے نقل کرتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس مسئلہ کو امام رازیؒ نے مطالب عالیہ میں اور ابنِ رشد نے کشف الادلہ میں اور حافظ ابن تیمیہ اور علامہ ابنِ حزم نے مختلف کتابوں میں بھی بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ مولانا سندھی کے افکار کا سرچشمہ براہِ راست شاہ دہلوی ہیں اس لئے ہم حضرت شاہ صاحبؒ کے بیانات سے تجاوز نہیں کریں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

"جو نبی تمام دنیا کی طرف مبعوث ہوتا ہے وہ یہ تو کر نہیں سکتا کہ تمام کے عادات و اطوار کا تجسس کرے اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں ہوتا کہ شعار، تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادات کا لحاظ رکھا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے اس کے ساتھ آنیوالی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔"

شاہ صاحبؒ کا بیان یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ مولانا شبلیؒ نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے اب ذرا وہ بھی سن لیجئے۔ لکھتے ہیں۔

---

[1] مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ ۱۳۲۲ھ۔ [2] مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل۔

"اس اصول سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ شریعتِ اسلامی میں چوری۔ زنا۔ قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں کہاں تک عرب کی رسم ورواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان ہی سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے" [1]

علاوہ بریں ہر زمانہ میں اور ہر قوم کی (اسلام سے پہلے) ایک الگ شریعت کی حکمت پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

"اس میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "تمام کھانے بنو اسرائیل کے لئے حلال تھے سوائے ان کھانوں کے جن کو اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ توراۃ کے نازل ہونے سے پہلے پہلے" اے محمدؐ! آپ فرمائیے کہ تم لوگ توراۃ لاؤ اگر تم سچے ہو" اس آیت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

اس کی تفسیر یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام ایک مرتبہ سخت بیمار ہوگئے اور انھوں نے نذر مانی کہ اگر خدا نے ان کو اچھا کر دیا تو وہ اپنے اوپر اپنا محبوب ترین کھانا اور پینا حرام کرلیں گے چنانچہ جب وہ اچھے ہوگئے تو انھوں نے اپنے اوپر اونٹوں کا گوشت اوران کا دودھ حرام کرلیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹوں نے بھی ان کی پیروی کی، اوراس پر قرنوں گذر گئے۔ اب بنو اسرائیل نے انبیا سے غداری کرنی چاہی اور ان دونوں حرام چیزوں کے استعمال کا ارادہ کیا تو اس پر توراۃ نازل ہوئی اور ان چیزوں کی حرمت کا اعلان ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتِ ابراہیم پر تھے یہود نے اعتراض کیا کہ اونٹوں کے گوشت اور دودھ کا استعمال کرنے کے باوجود آپ کس طرح ملتِ ابراہیمی پر ہوسکتے ہیں تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی جس کا مفاد یہ تھا کہ یہود کے لئے یہ چیزیں حرام تھیں تو ایک عارض کی وجہ سے (یعنی یہ کہ انھوں نے خود اس کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا) بنو اسماعیل میں جب نبوت منتقل

---

[1] علم الکلام ص ۱۱۵۔

ہوئی تو چونکہ یہ اس عارض سے محفوظ تھے اس لئے ان کیلئے یہ چیزیں حلال رہیں۔"

آگے چلکر حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں اسباب و مصالح کے باعث مختلف ہیں۔ کیونکہ احکام و مقادیر کی تشریع میں مکلفین کا اور ان کے عادات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چونکہ حضرتِ نوح ؑ کی قوم کے لوگ زیادہ مضبوط اور قوی الجثہ تھے اس لئے ان پر دوام صیام فرض کیا گیا تاکہ ان کی شدتِ بہیمیت کی مقاومت ہو سکے۔ اس کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا مزاج ضعیف تھا اس لئے ان کو برابر روزہ رکھنے سے منع کیا گیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے غنیمت کو پہلے لوگوں کے لئے حلال نہیں کیا۔ لیکن ہم لوگوں کی کمزوری کے پیش نظر اس کو حلال کر دیا۔ انبیاء کرام کا مقصد چونکہ لوگوں کی عادات کی اصلاح ہوتی ہے اس بنا پر وہ مالوف عادتوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور ان سے الاماشاء اللہ کہیں کہیں ہی عدول کرتے ہیں۔" [1]

شاہ صاحبؒ کی تمام تقریر کا استیعاب تو بہت مشکل ہے لیکن یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جناب "ناقد" "قومیت" کے سرے سے منکر ہی ہیں اور معارف کے پورے تبصرہ میں انھوں نے اسی کا سب سے زیادہ ماتم کیا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے نزدیک اسلام کی عالمگیری کا راز ہی یہ ہے کہ عبادات کے علاوہ بقیہ احکام و مسائل کی تشریع میں قومی عادات و خصائل کی رعایت رکھی گئی ہے لیکن یہ مسئلہ نہایت نازک ہے کیونکہ اس معاملہ میں شریعت نے نہ بالکل آزاد چھوڑا ہے کہ محض اصول کو سامنے رکھکر ہر قوم ان کی جو عملی شکل چاہے اختیار کرلے اور نہ اتنا پابند کیا ہے کہ اس نے اپنے ہر اصول کی ایک ایک جزئی تفصیل اور عملی شکل متعین کر کے ہر قوم اور ہر ملک کو اسی کا پابند رہنے کی دعوت دی ہو۔ اس بنا پر ہم اس مسئلہ پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرینگے تاکہ بحث کے مختلف گوشے روشنی میں آسکیں۔ واللہ ہو الموفق۔

(باقی آئندہ)

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۷۰۔

عصری علمِ کلام

مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی لکچرار دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

بسلسلہ (۲) اگست ۴۴ء

علمِ کلام کی اساس قرآن حکیم کی روشنی میں | قرآنی روشنی میں علم کلام کی اساس معلوم کرنے کے لئے آپ ذیل کی آیات کے مضامین پر بھی غور فرمائیں۔

(۱) افتطمعون ان یومنوا لکم وقد کان فریق منھم یسمعون کلام اللہ ثم یحرفونہ من بعد ما عقلوہ وھم یعلمون ہ یہ سورہ بقر کے ابتدائی حصہ کی آیت ہے۔ اس آیت میں براہ راست جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اوران کے توسط سے مسلمانوں کو خطاب ہے۔ اس کے مطلب کا خلاصہ یہ ہے۔

"اگر تمہاری تبلیغِ حق اور مخلصانہ جدوجہد کے بعد بھی یہود ایمان نہیں لائے تو تمہیں دلگیر اور رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہودیوں سے اس قسم کا عمل توقع کے مطابق ہے خلافِ توقع نہیں ہے کہ ان میں سے ایک ایسی بھی جماعت تھی جو خدا کے کلام (توراۃ) کو سنتی اور خوب سمجھ لینے کے بعد (من بعد ما عقلوہ) بھی کہ خدا کے کلام میں فلاں لفظ یوں ہی ہے اوراس خدا کی مراد یہ ہی ہے اور ہو سکتی ہے، تحریفِ لفظی ومعنوی کی بے باکی کے ساتھ مرتکب ہوئی۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ (وھم یعلمون) اس طرف مشیر ہے کہ حضورؐ کے زمانے کے یہود اس حادثے اور واقعے سے خوب واقف تھے۔ یہاں مُشیر کا لفظ ہم نے قصداً تحریر کیا ہے کیونکہ مفسرین کرام نے من بعد ما عقلوہ کے بعد وھم یعلمون کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ بہرحال اس قدر تو بالاتفاق ثابت ہے کہ اس تحریف کے حادثے یا واقعے کو علماء یہود کے ہاں وازمیں رکھنے کی

شدید ترین تاکید تھی اور یہ واقعہ علمار سوء یہود کے ہاں مسلسل اور شدت کے ساتھ راز میں رہا۔ حتیٰ کہ خود قرآنِ کریم نے اس راز کو اس طرح فاش کر دیا کہ تمام یہود حیرت میں رہ گئے۔ اگر ان میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی تو ان کے ایمان کے لئے یہ واقعہ کافی تھا۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ کھلی نشانیوں کے بعد بھی یہ ایمان نہ لائے تو مومنین پر یہ واضح ہو گیا کہ یہ علمار یہود کی جماعت متلاشیانِ حق کی جماعت نہیں بلکہ معاندین کی جماعت ہے ایسے معاندین اور اشرار اگر ایمان نہ لائیں تو کوئی خلافِ توقع اور عجیب بات نہیں بلکہ توقع کے عین مطابق ہے اب اور ایسے حالات میں رب العالمین کا مسلمانوں سے خطاب ہوتا ہے۔

تمہارا جی کھنچتا ہے کہ کاش یہ ایمان لے آئیں کہ یہ اہلِ کتاب ہیں حریم مذہب سے ناآشنا، کوثرِ توحید سے بے خبر نہیں اور جب ہماری طرف سے تبلیغِ حق میں کوتاہی نہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ خیال جو تمہیں رنجیدہ اور دلگیر کر رہا ہے ایسا نہ ہونا چاہئے گویا خداوند تعالیٰ تسلی اور تشفی دے رہے ہیں۔"

اس مختصر تشریح کے بعد غور کیجئے کہ کلامُ اللہ کے بعد من بعدِ ما عقلوہ سے واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے کلام اور اس کے مفہوم کو عقل سے سمجھنا عین تعلیمِ الٰہی ہے خود عقل کا لفظ موجود ہے اس سے واضح تر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔

علاوہ ازیں علامہ علی بن احمد مہائمی ان یومنوا کے تحت فرماتے ہیں ای بدلائلکم (تمہارے دلائل کی وجہ سے)۔" یہ ہی وجہ ہے کہ علمار قرآن نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مذکورہ بالا یہودیوں کی جماعت علمار کی جماعت تھی نہ کہ عوام کی۔

(۲) علاوہ ازیں علامہ مہائمی اپنی بے نظیر تفسیر میں لا اکراہ فی الدین کے تحت لکھتے ہیں (لا اکراہ) علی العقول فی التزامها بل (فی جمیع هذا الدین) لانها منقادة بدلائل۔

دین میں زبردستی نہیں، کا مطلب یہ ہے کہ دینِ اسلام کے بارے میں عقولِ انسانی پر جبر نہیں کیونکہ عقول دلائل سے مطیع ہوتی ہیں نہ کہ جبر سے۔

(۳) تفسیرِ بیضاوی سورۂ یونس علیہ السلام آیت انّ الظن لا یغنی من الحقّ شیئاً کے تحت ہے کہ

فیہ دلیل علی ان تحصیل العلوم فی الاصول واجب
یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ علوم اصول (علمِ کلام) کا حاصل کرنا واجب ہے۔ (دفیتہ الراغب ص ۴ مطبوعہ مصر)

اساسِ مذہب تاریخِ انسانیت کی روشنی میں

مذہب کا بنیادی اصول یہ ایک قابلِ غور امر ہے کہ مذہب کے اس شجرۂ طیبہ کی بنیاد کس چیز پر ہے جس کی لاتعداد شاخیں اور پتے پھیلے ہوئے ہیں اور جس کی تفصیلات کو بڑی بڑی ضخیم کتابیں بھی نہیں سمو سکتیں۔ مورخِ اسلام شبلی لکھتے ہیں۔

اس قوت کا نام نورِ ایمان۔ کانشنس۔ حاسۂ اخلاقی ہے اور یہی چیز مذہب کی بنیاد ہے۔ (الکلام حصہ دوم ص ۱۸)

ذرا اور وضاحت سے کہا جاسکتا ہے کہ مذہب کا بنیادی خدا کا یقین یا مافوق الفطرت ہستی کا اعتقاد ہے یعنی ایک ایسی ہستی کا اعتقاد جو تمام سے بالاتر ہو۔ پروفیسر نواب علی لکھتے ہیں۔

مذہب کی بنیاد تصورِ ذات پر ہے ایسی ذات جس سے کائنات ایک زبردست اور راہ پر لگانے والے اور منتظم کی محکوم معلوم ہوتی ہے۔

انسانی فطرت اور مذہبی سوالات خداوند تعالیٰ نے انسان کو ذہن و دماغ عقل و شعور عطا فرمایا ہے چنانچہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو غور و فکر کے اس سرمایے کو ساتھ لاتا ہے وہ اپنی عمر کی ہر منزل میں اپنی بساط کے مطابق سوچتا ہے غور کرتا رہتا ہے۔ جب وہ عمر کے بڑے حصے کو پہنچ جاتا ہے اور اس کے قوائے علمی و فطری مکمل ہو جاتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ اس کے غور و فکر کا دائرہ بھی وسیع اور مستقل ہو جاتا ہے اب

ؔ ہماری رائے میں ان آیتوں کا ذکر اس امر کی وضاحت کے لئے کافی ہے کہ علمِ کلام کی اساس نہایت واضح طور سے قرآنی آیتوں میں ملتی ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اردگرد زندگی کا سمندر موجیں مار رہا ہے کائنات کے بحرِ ذخار کی سطح پر لاکھوں چیزیں ابھرتی ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد اپنی اپنی بہار دکھا کر روپوش ہو جاتی ہیں۔ نیز بقا اور زندگی کے سامان قدرت ہر آن مہیا کر رہی ہے۔ چاند، سورج، ہوا، پانی زندگی کے دریا بہا رہے ہیں۔

(۱) آخر یہ پوری کائنات ہے کیا؟

(۲) کہاں سے آئی ہے؟

(۳) اس کا نظام کس کے ہاتھ میں ہے؟

(۴) عالم کا سرچشمہ کیا ہے؟

(۵) زندگی و حیات کا سمندر کہاں سے نکلا ہے؟

پھر وہ خود اپنے وجود کو سوچتا ہے کہ میں کیا ہوں؟ موت مجھے کہاں لے جاتی ہے؟

پروفیسر رڈالف آٹو جو عہدِ حاضر کے نہ صرف بہت بڑے مفکر ہی ہیں بلکہ ارباب سائنس میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے فرماتے ہیں۔

> جب ہم اپنی دنیا میں بعض چیزوں پر غور کرتے ہیں۔ مثلاً تاروں بھرے آسمان پر، زندگی سے لبریز سمندر پر، زندگی اور حیات کی ترقی اور تنظیم پر، اور اس کے بعد ہم حیات و تنظیم کی تشریح سائنس کی روشنی میں، واضح اور صاف طریقے پر کرنا چاہیں تو ہمارے دماغ میں کسی "قدوس ہستی" کا احساس تازہ ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہمارے دماغ میں حیرت ماورائیت (Beyandenss.) اور الوہیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

غرض مذکورہ بالا قسم کے سوالات ابتدائے عالم سے اس وقت تک انسانی دل و دماغ کو بےچین کرتے رہے ہیں یہ سوالات کبھی انسانی دماغ سے محو نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں دنیا علوم و فنون کے لحاظ سے خواہ کسی منزل پر پہنچ جائے لیکن فطرت کی یہ بےچینیاں اور انسانیت کا یہ مطالبہ ہمیشہ باقی رہے گا اور ہے۔ فطرتِ انسانی کے یہی مطالبات اور انسانی ذہن و دماغ کی یہی بےچینیاں درحقیقت مذہب کی اساس و بنیاد کی تعیین کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ مذہب کا جذبہ انسانی فطرت میں موجود ہے۔

مذہب انسانیت کو لازم رہا ہے تاریخ انسانیت بتاتی ہے کہ جب سے حضرتِ انسان کائنات کے دسترخوان پر بقیدِ حیات مدعو ہوئے ہیں اس وقت سے اس وقت تک ہر دور اور ہر زمانے میں ایک مافوق الفطرت ہستی کا اعتقاد پایا گیا ہے۔ دورِ وحشت یا دورِ تہذیب علم کا زمانہ ہو یا جہالت کا، عہدِ تاریخ ہو یا ماقبل تاریخ ہر زمانے میں انسانی جماعت نے ایک عظیم ترین قوت اور مافوق الفطرت ہستی کے اعتقاد کے ساتھ عاجزی اور عبادت کے اعمال وافعال ادا کئے ہیں۔ ہماری مراد اس باب میں یہی ہے وہ تشریحی احکام نہیں جن کا مجموعہ مذہب یا مذہبیات کہلاتا ہے۔

پلوٹارک کہتا ہے۔

"تم کو بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جہاں نہ قلعے نہ سیاست نہ علم نہ صنعت' نہ فرقہ، نہ دولت لیکن ایسی کوئی جگہ نہ ملیگی جہاں خدا نہ ہو"

مکس مولر کہتا ہے۔

"تمہارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکایا تھا جب وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکے تھے۔ جسمانی خدا یعنی بت اسی حالت کے بعد اس طرح پیدا ہوئے کہ فطرت اصلی مثالی صورت کے پردے میں چھپ گئی"

فرنچ فلسفی گسلر کہتا ہے۔

"مذہب ابدی چیز ہے کیونکہ مذہب جس سوال کا جواب ہے وہ کسی زمانے میں بھی معدوم نہیں ہو سکتا"

رینان لکھتا ہے۔

"یہ ممکن ہے کہ کل وہ اشیاء جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذِ زندگی میں محسوب ہیں مٹ جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے یا اس کی قوت میں زوال آجائے"

ان وجوہات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا وجود اور اس کا تصور انسانیت کے لئے لازم ہے

اور اس کا وجود بالکل فطری اور نیچرل ہے۔ مذہب انسانیت کے خمیر میں پایا جاتا ہے نہ کہ انسانی احتیاج اور فلسفیانہ دلائل کی وجہ سے مذہب پیدا ہوا ہے۔ عقل، دلائل اور انسانی احتیاج ممکن ہے کہ اس فطری چیز کے سمجھانے اور معقول و مفید بنانے میں معین و مددگار ہوں لیکن بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مذہب ان کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ

مذہب کی تعریف | مذہب انسانی فطرت کا ایک لطیف اشارہ اور سادہ اقتضا ہے جو انسانیت سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ اقتضا وحی الٰہی اور عقل سے تربیت پا کر انسان کی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔

جب مذہب فطری ہے تو اختلافِ مذہب کیوں؟ | اقوام و ملل میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق مختلف بیانات یا عبادت کے طریقوں کا اختلاف جذبۂ مذہب کے مختلف ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس اقتضاءِ فطری کو عقل و وحی کی روشنی میں صحیح طور سے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے گویا یہ اختلافات بالاتر ہستی کے صحیح عرفان یا غلط پہچان کے مظہر ہیں۔ بہر حال غور کریں تو صاف معلوم ہو جائے کہ مذہب و انسانیت میں ایک گہرا نہ ٹوٹنے والا تعلق ہے کیونکہ جسقدر فطری چیزیں ہوتی ہیں گو مختلف زمانوں میں ان کا ظہور مختلف طریقوں سے ہو لیکن کبھی اور کسی زمانے میں وہ انسان سے جدا نہیں ہو سکتیں۔

اختلافِ مذاہب کی دوسری وجہ | ایک مافوق الفطرت ہستی اور اس کی عبادت کی طرف میلان فطری ہے جیسا کہ تاریخِ انسانیت سے ثابت ہو چکا ہے لیکن اس سوال کا جواب کہ فطری جذبہ میں اسقدر اختلاف کیوں ہے، آپ ان حقائق پر غور کرنے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اوّل بھوک سب کو لگتی ہے لیکن سب لوگ ایک ہی چیز یا غذا سے اس فطری جذبے کو تسکین نہیں دیتے بلکہ اپنے اپنے مقامات کی خصوصیات اور ملک کی پیداوار اور آب و ہوا کے لحاظ سے غذا تجویز کی جاتی ہے۔ شیر خوار بچے کی غذا اور چلنے پھرنے والے بچے کی غذا میں فرق ہوتا ہے۔ جوانی میں جو غذا انسان بے تکلف استعمال کرتا ہے بڑھاپے میں استعمال نہیں کر سکتا۔

تیسری وجہ | انسانیت نے اپنے قوائے فطری کی تکمیل ارتقائی منازل کے ذریعہ طے کی ہے۔ شروع کے

انسانوں کو جس طریقۂ افہام وتفہیم یا فطری جذبۂ مذہب کی تسکین کے لئے جس طریقۂ تعلیم وتمثیل کی ضرورت اور جس روحانی غذا کی حاجت تھی انسانی ارتقائی منازل میں لازمی طور سے اس میں تبدیلی ہوتی رہی ہوگی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ انسان کے قدیم ترین مذاہب کے اصول میں اشتراک کے ساتھ ساتھ اس کی تفصیل وتفہیم میں فرق بھی ضروری ہے۔ پیغمبرانِ کرام اس ارتقائی مدارجِ انسانی کی روحانی کڑیاں ہیں، ان کی تعلیم اس کا مظہر ہے۔ اس لئے ایک کے بعد دوسرا مذہب منسوخ ہوجاتا ہے یہ ہی وہ مقام ہے جہاں خود ہم پیغمبرانِ کرام اور شرائع الٰہیہ کے مختلف ہونے کی حقیقی توجیہ کو محسوس کرتے ہیں۔

جدید علماء کی شہادت اسٹوری آف دی نیشنز (قصص الاقوام) کے باب کالڈیا صفحہ ۱۴۹ میں ہے۔

"مادۂ مذہب جسے دینداری کہتے ہیں گویائی کی قوت کی طرح تمام حیوانات کے مقابلے میں صرف انسان ہی کو عطا ہوا ہے۔ یہ امر یہاں تک مسلم ہے کہ موجودہ سائنس بھی تسلیم کرنے لگی کہ انسان انھیں دو قوتوں (دینداری اور گویائی) کی وجہ سے تمام دیگر مخلوق سے الگ ہے۔"

اسپنسر کہتا ہے

"انسانیت کبھی اس درجے پر نہیں پہنچی جہاں مذہبی جذبہ اس سے دور ہوجائے اس کی صورت بدل جانی ممکن ہے لیکن اصلیت لازوال ہے۔

غرض مذہب انسانی فطرت کا لازمہ ہے اور کوئی انسان مذہب سے الگ نہیں ہوسکتا۔ کیا انسان فطری چیزوں سے انکار کرسکتا ہے۔ اگر نہیں کرسکتا تو مذہب سے انکار بھی ممکن نہیں۔

منکرینِ مذہب کیسے پیدا ہوئے ٹھیک جس طرح بھوک پیاس ہر جاندار کی فطرت ہے اور انسان کی بھی لیکن اس کے باوجود گاہے امراض کے لاحق ہونے کی وجہ سے بھوک گم ہوجاتی ہے پیاس معلوم نہیں ہوتی۔ یا یوں سمجھئے کہ قوتِ شہوانی ہر جاندار کے لئے فطری ہے جس سے بقائے نسل اور اغراضِ تمدن وابستہ ہیں لیکن خاص خاص انسان اس جوہر سے عاری بھی پائے جاتے ہیں۔

کیا ایسے انسانوں کے وجود کی وجہ سے بھوک پیاس اور قوت شہوانی کے فطری ہونے پر کوئی شبہ کیا جا سکتا ہے ہرگز نہیں بالکل اسی طرح بعض انسانوں کی فطرت کو روگ لگ جاتا ہے وہ ایسی حالت میں مذہب وخدا کا انکار کر بیٹھتے ہیں لیکن ان کے انکار کی وجہ سے مذہب کے فطری ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں اگر ہم ایک ایسی فہرست مرتب کریں جس میں خدا پر ایمان رکھنے والے اور اس کو ماننے والے ایک طرف ہوں اور دوسری طرف منکرین اور نہ ماننے والے ہوں تو بھی منکرین کی تعداد اتنی بھی نہ ہوگی جس قدر آٹے میں نمک۔

غرض آپ فلاسفہ کے گروہ کو لیں یا عوام کو علماء فضلاء کی جماعت کو لیں یا جہلاء کو دنیا کی کثرت خدا کے ماننے والوں ہی کی طرف ہوگی اس موقف پر ہم ایقان سے کہہ سکتے ہیں کہ مذہب فطری چیز ہے اس کے وجود میں انسانی ارادے اور عقل کا دخل نہیں ہے۔ مذہب کا ابھار خود بخود فطرت کی طرف سے عمل میں آیا ہے۔ خدا کا وجود ذہن وعقل کی پیداوار نہیں۔ دلائل وفلسفے کا محتاج نہیں۔ نیچر کی بڑی سے بڑی قوت کے رعب کا اثر نہیں نہ انسانی احتیاجات اور اس کی کمزوریاں مذہب کی تخلیق کا باعث ہوئی ہے بلکہ جذبۂ مذہب فطرتِ انسانی کا ایک لطیف ابھار یا اشارہ ہے۔

انسانی روح اس لطیف اشارے کو پاکر جذبۂ عبادت کا شوق و میلان انسان میں پیدا کرتی ہے قرآنِ کریم نے انسانی فطرت کے اس لطیف جذبہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

واذاخذ ربک من بنی آدم من	اور جبکہ تیرے پروردگار نے بنی آدم کی پیٹھ سے
ظہورھم ذریتھم واشھدھم	انکی نسل کو نکالا اور خود ان کو انھیں پر گواہ کیا
علیٰ انفسھم الست بربکم قالو	کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے کہا
بلیٰ شھدنا۔	کہ ہاں ہم گواہ ہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

فطرۃ اللہ التی فطرالناس علیھا

جذبۂ فطری اور عقل و مذہب کے تعینات

عقلی اور مذہبی احکام کی پابندیاں فطری اُبھار پر

جب عقل و مذہب کے احکام انسان کے اس فطری ابھار اور نیچرل اقتضاء پر پابندیاں عائد کرتے ہیں تو یہیں سے انسانیت کی حد حیوانیت سے الگ ہوتی ہے ورنہ نباتات اور حیوانات کی طرح خودرو انسانی پودے دیگر مخلوقات سے الگ کوئی برتری اور شرافت نہ رکھتے، تمدن و تہذیب کی بنیاد اور اخلاق و کردار کا نام و نشان نہ ملتا۔

جذبۂ ترقی جو انسانیت کی روح رواں ہے اور جو حیوانات سے الگ صرف انسان ہی میں پایا جاتا ہے یکسر معدوم ہو جاتا۔ فطرتِ انسانی کے ہوتے ہوئے شجر علوم و فنون کی جڑ ہی کٹ جاتی نہ کوئی رہبر ہوتا نہ کوئی ہادی نہ استاد ہوتا نہ معلم۔

پس خود فطرت ہی انسان کی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کر لیتی اور انسانیت کا شجرِ طوبیٰ اپنی نشوونما، بالیدگی پھیلاؤ، جذباتِ رنج و غم، مسرت و خوشی، اعتقادات و اعمال میں قطعاً آزاد ہوتا۔ فطرت آزاد پر پابندیاں یا قیود ہی غیر مہذب سے مہذب کو الگ جاہل سے عالم کو جدا کرتی ہیں اخلاقیات میں اچھے اخلاق اور برے اخلاق کا حقیقی معیار قائم کرتی ہیں۔ کیا تمدن و تہذیب اور اخلاق و معاشرت کی تمام بندشیں یا قیودات غیر فطری اور غیر ضروری ہیں، کیا یہ قیودات انسانیت کی صحیح آزادی کو فنا کرنیوالی ہیں۔ کوئی سلیم العقل انسان ان قیودات کو انسانی فطرت کے لئے مضر اور غیر ضروری قرار نہیں دیسکتا بلکہ ان قیودات اور پابندیوں کو عین تہذیب و شائستگی خیال کیا جاتا ہے۔

اگر ذرا غور سے آپ اس مبحث پر غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے کہ انسانیت کی برتری اور شرافت کا یہ بلند مینار جس کی روشنی سے کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ جگمگا رہا ہے ان ہی قیودات اور بندھنوں کی بنیادوں پر استوار ہے۔ پھر آپ مذہب اور احکام مذہب کی قیودات کو جو درحقیقت انسانی سادہ فطرت کی صحیح رہنمائی کرتی ہیں کیوں انسانی آزادی کے خلاف تصور کرتے ہیں اور مذہب کو آزاد خیال اور ضمیر کیلئے ایک بوجھل زنجیر کسی وجہ سے تصور کئے ہوئے ہیں واقعہ یہ ہے کہ یہ پابندیاں فطرت کے خلاف اور ضد نہیں ہیں بلکہ

فطرت کے مقاصد کی مفسر اور ان کی تعیین کرتی ہیں عقل اور مذہبی پابندیاں عملی زندگی کو مفید سے مفید تر بناتی ہیں۔

تفصیل سے یوں سمجھئے کہ فطرت کے ابھار اور لطیف اشارے عقل و مذہب کی رہنمائی میں انسان کے لئے مفید اور بہتر ثابت ہوئے ہیں اگر ان کی رہنمائی نہ ہو تو انسانیت سے جو مقصد ہے اس کی تکمیل ناممکن ہو جائے اور مقصدِ فطرت معدوم ہو جائے۔ اس مقام پر پہنچکر ہم اس حقیقت سے آشنا ہو جاتے ہیں کہ عقل و مذہب کی فطری جذبے کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت ہے کیا صرف فطری ابھار بدون عقل و مذہب کی رہنمائی کے لئے کافی نہ تھا جس طرح دیگر مخلوقات نباتات و حیوانات میں ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانیت نام ہی ان قیودات کا ہے اور جس چیز نے انسان کو دیگر مخلوقات سے بلند کیا ہے وہ یہ بھی دو چیزیں ہیں جن کو ہم عقل و مذہب کہہ سکتے ہیں۔

بھوک پیاس، خواہش جنسی وغیرہ کے سارے ابھار اور جذبات حیوانات کی طرح انسان میں پائے جاتے ہیں لیکن انسان عقل و مذہب کی رہنمائی میں ان سارے ابھار اور فطری جذبات کو بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید تر طریقوں سے پورا کرتا ہے اور یہی طریقے تہذیب و تمدن کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح میلانِ عبادت اور خدا کے آگے جھکنے اس کو ماننے کا سادہ جذبہ عقل اور وحی کی رہنمائی میں انسان کو صحیح طریقہ پر گامزن کر دیتا ہے اسکو مافوق الفطرت ہستی کی ذات و صفات اور اس کی عبادت کے متعلق صحیح ایمان و ایقان عطا کرتا ہے۔

غرض مافوق الفطرت ہستی (خدا) کا اعتقاد انسانی فطرت یا روح کا ایک لطیف اشارہ ہے الہامی اور مذہبی پابندیاں جن کو پیغمبرانِ وقت اپنے اپنے زمانے میں ظاہر فرماتے ہیں۔ فطرت کے اس لطیف اشارے کو صحیح راستے پر ڈالتی ہیں اور اس طرح انسان ہدایت و رہنمائی حاصل کرتا ہے آپ پر یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ

عقل و مذہب کی پابندیاں فطرت کے مقابل اور خلاف و متضاد نہیں ہیں بلکہ خود فطرت اور مقاصدِ فطرت کی مفسر اور معین و مددگار ہیں۔

اسلامی روایات اوران کا تحفظ

مقالۂ دوئم

تیسرا باب

پروفیسر سید جمیل صاحب واسطی ایم۔ اے (کینٹب) وائس پرنسپل سندھ مدرسہ کالج کراچی

سلسلہ کیلئے دیکھئے برہان ماہ جون ۱۹۴۴ء

جیسا کہ پچھلے دو بابوں میں عرض کیا جاچکا ہے اسلام کے دنیوی تنزل کا باعث مسلمانوں کا دنیوی طاقت کے عناصر سے عدم توجہی تھا۔ اگر مسلمان اپنے علم اور اپنی اقتصادی زندگی کو اس طرح منظم کرتے کہ وہ دنیا کی اعلیٰ ترین صنعتی قوم رہتے تو ان کی دنیوی طاقت آج تک تنزل پذیر نہ ہوتی۔ تمام دنیوی طاقت کے لئے تاریخ میں یہ شرط لازمی ہے۔ افسوس ہے کہ بجائے اس کے کہ مسلمان اس دنیوی ہزیمت کو دنیاوی قوت کے عناصر کی کمزوری پر محمول کرتے اسلام میں مہدی کی ضرورت، سوٹ ہیٹ اور بے پردگی کی ضرورت اور دیگر عناصرِ تہذیب وتمدن کی فرضی کمزوری پر محمول کرنے لگے۔ اور ہر وہ چیز جس میں مسلمان فاتح اقوام سے مختلف تھے انھیں اپنی کمزوری کا باعث نظر آنے لگی اور اس غلط تشریح اور منطقی غلطی کے ماتحت جس کا مفصل ذکر پچھلے بابوں میں ہوچکا ہے۔ مسلمانوں نے مغربی عناصرِ تہذیب وتمدن کے اختیار کرنے میں اس دنیوی عظمت کی جستجو کی جو صرف دنیوی قوت کے عناصر کے حصول سے حاصل ہوسکتی تھی۔

اس باب اور آئندہ بابوں میں میرا مقصد ان غلط فہمیوں کا بیان کرنا ہے جو تمدن اسلامی کے متعلق مذکورہ بالا تشریحی غلطیوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔

ہماری دنیوی ہزیمت کے بعد سب سے بڑی غلط فہمی جو اسلامی تمدن کے متعلق پیدا ہوئی وہ اسلامی دنیا کی عورتوں سے روایتی سلوک کے متعلق تھی۔ مسلمانوں کی کم علمی کا احساس رکھتے ہوئے اور عیسویت کی تبلیغی کوشش کی امداد کی نیت سے مغربی مصنفین نے اسلام کے متعلق اس قسم کی غلط فہمیوں کے پھیلانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ تشریح کی آسانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس مضمون کو دو حصص میں منقسم کر دینا مناسب ہوگا۔ اول پردہ۔ دوم کثیر الازدواجی۔ یہ دونو مضامین درحقیقت واحد مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مطلب کو بالکل واضح کرنے کے لئے ان مضامین میں "کثیر الازدواجی" سے ایک مرد کے کئی عورتوں سے جنسی تعلقات کا مطلب لیا جائے گا۔ اور ایک عورت کے کئی مردوں سے تعلقاتِ جنسی کے لئے "پولی اینڈری" کی مغربی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے موجودہ زمانے میں ہماری سوسائٹی کا پردہ کو چھوڑنے کی طرف میلان اسلامی دنیا کی عظیم الشان ہزیمتوں کے بعد عناصرِ قوت کی غلط تشریح کے باعث شروع ہوا ہے۔ موجودہ حالات میں حکمرانوں کی نقل کی طرف میلان چنداں حیرت انگیز واقعہ نہیں۔ اسلامی حکومت کے اثر سے شمالی ہندوستان میں کئی غیر مسلم خاندانوں نے بھی پردہ شروع کر دیا تھا جو آج تک کئی اعلیٰ ہندو گھرانوں میں قائم ہے۔ اندلسی خلافت کے زمانہ میں ہسپانوی عیسائی عربی لباس پہنتے تھے اور ہسپانوی سفید رو عورتیں سیہ غازہ استعمال کرتی تھیں تاکہ ان کے چہروں کا رنگ بھی حکمران عربوں کی عورتوں کے چہروں کے رنگ کی طرح خوشنما ہو۔ اس نقل کے پیچھے حکمرانوں کی معاشرتی برابری مقصود ہوتی ہے۔ اگر موجودہ حکمران اقوام میں پردہ کا رواج ہوتا تو مسلمان پردہ چھوڑنے کی طرف ہرگز مائل نہ ہوتے اور وہ دلائل جو آج پردہ کے خلاف محض محکومانہ نقل کو باعزت بنانے کے لئے سوجھ رہے ہیں شاید خیال میں بھی نہ آتے۔ صدیوں مسلمان سلطنتوں میں محکوم بے پردہ اقوام آباد رہیں لیکن اس وقت مسلمانوں کو پردہ کے خلاف شدید مخالفت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور اگر عورتوں کی قید یعنی پردہ مسلمانوں کے موجودہ تنزل کا باعث ہے تو انھوں نے بے پردہ قوموں کو ایک ہزار سال سے

زیادہ مدت تک کس طرح محکوم و مجبور بنائے رکھا؟

تیرہ سو سال تک مسلمان دنیا کی تاریخ سازی میں یورپ کے مدمقابل رہے ہیں۔ اگر موجودہ فاتح یورپ کے انتقام سے دیکھتے ہوئے دل میں ہماری تہذیب کی جانب غصہ و حقارت کا جذبہ ہو تو یہ باعثِ تعجب نہیں۔ دنیا میں کامیابی اعلیٰ ترین دلیل سمجھی جاتی ہے۔ مغلوب موردِ حقارت ہوا ہی کرتے ہیں۔ یہ حقارت جو ہماری روایات کے متعلق ظاہر کی جاتی ہے ہمارے موجودہ سیاسی حالات کا نتیجہ ہے اور ان مذاہب کا ہتھیار ہے جو اسلام کی وسیع دنیا کو اپنی مادی و روحانی وراثت بنانے کی امید رکھتے ہیں۔ اظہارِ حقارت کو دوستانہ مشورہ خیال کرنا قومی خودکشی کے مترادف ہوتا ہے اسلام کے متعلق صریح غلط بیانیوں سے لبریز پروپاغندہ یورپ کے ہر گوشے میں پھیلا ہوا ہے ہمارے رسول مقبول ہماری شریعت ہمارے لباس و رسوم تک کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہی ہم یورپ کی حقارت کو دلیل بنا کر آخر کس کس روایت کو ترک کردیں گے؟ یہ فاتحین کا دستور ہے کہ وہ محکوم اقوام کی معاشرت تہذیب و تمدن کا مذاق اڑائیں۔ لیکن مفتوحین کا فرض ہے کہ وہ اپنے دماغی توازن کو سنبھالے رکھیں۔ اگر اپنے مذہب و معاشرت کے خلاف اظہارِ حقارت کرنے میں ہم بھی حریفوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے تو کسی دن ہماری قوم کا نام دنیا سے محو ہو جائے گا۔

غالباً اس جگہ یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ نکاح جائداد اور زندگی کے دیگر معاملات میں اسلام نے عورت کو اسوقت سے حقوق عطا کئے ہوئے ہیں جبکہ دوسرے مذاہب میں عورت کا درجہ غلام سے بدتر تھا۔ اسلام میں عورت مرد کی ملکیت نہیں ہے۔ مسلمان عورت اپنے خاوند کی طرح خدائے واحد کی عبادت کرتی ہے اس کو خاوند کو خدا سمجھ کر پوجنے کا حکم نہیں ہے جیسا کہ دوسرے مذاہب میں ہے نہ اسکو خاوند کی موت پر زندہ آگ میں جلا کر ستی کرنا اسلام میں جائز ہے۔ اس کو مرد کی طرح اقتصادی و معاشرتی و مذہبی و روحانی حقوق حاصل ہیں انگلستان میں عورت کو جائداد رکھنے کا حق صرف پچھلی صدی میں حاصل ہوا ہے۔

یونان، شام، ایران و عرب میں اسلام سے قبل بھی پردے کا رواج تھا۔ ایرانی حرم میں تو "پردہ اس قدر شدت سے تھا کہ نرگس کے پھول بھی محل کے اندر نہیں جا سکتے تھے کیونکہ نرگس کی آنکھ مشہور ہے۔"

اسلام سے پہلے بھی جہاں جہاں عورت کی عصمت و پاکیزگی کی حفاظت کی ضرورت محسوس ہوئی پردہ کے اصولوں کو عمل میں لایا گیا۔ لیکن اسلام سے پہلے عورت کی پاکیزگی کچھ ایسی عام معاشرتی خصوصیت نہ تھی۔ یہ پردہ محض اس لئے رائج نہیں کیا گیا تھا کہ حوا کی بیٹی کو اس کی ماں کے گناہ کی سزا دی جائے۔ اسلام اجازت دیتا ہے کہ عورت اپنی عصمت کی حفاظت کے لئے اپنے چہرے کو چھپالے۔ پردہ محض ذریعہ ہے مقصد عصمت کی حفاظت ہے۔ اگر کوئی عورت اپنا منہ ڈھانپنا چاہے تو اس کو پوری آزادی ہونی چاہئے کہ وہ ڈھانپ لے۔ اس پر دوسری اقوام یا مسلمانوں کو مضطرب ہونے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

اگر عصمت کوئی قابلِ قدر صفت نہیں ہے تو اس کی حفاظت بے معنی ہے لیکن اگر عصمت واقعی ایسی صفت ہے کہ اس کی قدر کی جائے تو مناسب ہوگا کہ ہم ایسی اقوام کے جنسی حالات کا مطالعہ کریں جو پردہ نہیں کرتیں اور دیکھیں کہ بے پردگی میں عصمت کہاں تک محفوظ ہے علمی تشریح کو محض جذباتی بیان پر ہمیشہ ترجیح دینی چاہئے۔

صرف انگلستان میں ناجائز اولاد کی پیدائش تیس ہزار فی سال ہے۔ اگر ویلز سکاٹ لینڈ شمالی آئرلینڈ و جزائر کو بھی شامل کر دیا جائے تو تعداد قریباً ساٹھ ہزار ہوگی۔ اس ضمن میں حسب ذیل امور قابلِ غور ہیں :-

(۱) ہر جنسی تعلق بچہ کی ولادت پر منتج نہیں ہوتا۔ کئی دفعہ نصف صدی کی ازدواجی زندگی میں صرف چار پانچ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ امریکہ میں تیرہ فیصدی شادی شدہ جوڑے بے اولاد ہوتے ہیں۔ فطرت میں تضیع تخم بہت زیادہ ہے۔ لیکن باوجود اس کے جب ناجائز اولاد کی مندرجہ بالا تعداد سرکاری کتب میں درج ہوتی ہے تو آپ اس سے ناجائز تعلقات کی تعداد

کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

(۲) ناجائز اولاد کو روکنے کے لئے آلاتِ مانع الحمل لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ہر سال استعمال ہوتے ہیں۔

(۳) شادی شدہ عورت کی اولاد ہمیشہ خاوند کی اولاد سمجھی جاتی ہے اور ناجائز شمار نہیں ہوتی لہٰذا ناجائز اولاد کی مندرجہ بالا تعداد غیر شادی شدہ و کنواری عورتوں کی اولاد ہے۔

(۴) کئی بچے پیدائش سے پہلے ہی ہلاک کردئے جاتے ہیں اور بقول کارساندرس (دنیا کی آبادی مطبوعہ اوکسفورڈ) یہ عمل انگلستان اور جرمنی میں بہت عام ہے۔

جب مندرجہ بالا چار باتوں کے باوجود انگلستان کے محکمہ پبلک ہیلتھ کے سرکاری کاغذوں میں ساٹھ ہزار ناجائز بچے ہر سال درج ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یورپ کی معاشرت میں جنسی اخلاق کی کیا حالت ہے۔ ظاہر ہے کہ یورپ کے جنسی تعلقات میں وہ سادگی نہیں جو شادی کو پردہ کی امداد سے حاصل ہوتی ہے۔ یورپ میں جنسی تعلقات کی پیچیدگی جو مندرجہ بالا حالات سے ظاہر ہے کثیر الازدواجی اور پولی اینڈری دونوں ہی قسم کے جنسی تعلقات بیک وقت پیدا کردیتی ہے گو قانون اور مذہب کے خوف سے ظاہریت میں آبادی صرف شادی شدہ جوڑوں اور غیر شادی شدہ انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان حالات میں قریباً ہر مغربی عورت جھوٹ اور منافقت کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اور ان حالات میں مغربی مصنفین کا پردہ و اسلام کی محدود کثیر الازدواجی پر زہر اگلنا اور اپنے ممالک کی معاشرتی حالت کو عمداً نظر انداز کرنا مسلمانوں کو جان بوجھکر بے وقوف بنانے کے مترادف ہے۔

یہ بھی غلط ہے کہ ان معاملات میں مشرق و مغرب کے عقیدے میں فرق ہے عیسائیت مرد اور عورت کی عصمت پر قریباً اتنا ہی زور دیتی ہے جتنا کہ اسلام۔ مغرب کے لاکھوں کلیساؤں میں عیسائیت کی لاکھوں مجلسوں میں جنسی پاکیزگی کی تلقین ہوتی ہے۔ خدمتِ خلق کی انجمنیں، سکول، یونیورسٹیاں، حکومتیں سب اس امر کی ضرورت پبلک کو یاد دلاتی رہتی ہیں کیونکہ ایک قوم کی

دنیوی وروحانی فلاح وبہبودی کے لئے ایماندارانہ شادی۔ ازدواجی وفاداری اور جنسی ضبط نہایت ضروری امور ہیں اور مغربی لوگ ان اصولوں کی قدروقیمت سے آشنا ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو پردہ پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ یہ ان کے پرانے فاتحین مسلمانوں کی روایت ہے لہٰذا قابلِ نفرین وحقارت ہے۔

ڈاکٹر برگ ڈورفر کی تحقیقات کے مطابق برلن میں دانستہ اسقاط الحمل کی تعداد اور جائز وناجائز پیدائش میں ایکسوتین اور سو کی نسبت ہے۔ ڈاکٹر لاوری اپنی کتاب ھر سیلف (مطبوعہ فاربس اینڈ کمپنی) میں قبل از پیدائش بچوں کے قتل کی تعداد ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پندرہ لاکھ فی سال بتاتی ہیں باوجود اسکے کہ ڈاکٹر ریمنڈ پرل کے اعداد شمار کے مطابق آلات مانع الحمل کا استعمال اسی ملک کی سفید عورتوں کے غریب طبقوں کے ۳۲٫۷ فیصدی سے بڑھکر متمول طبقوں میں ۸۳٫۷ تک پہنچ جاتا ہے۔ پیرس کی سوربون یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر لاکاسائن کے حساب سے فرانس میں ہر سال ساڑھے آٹھ لاکھ (۸۵۰۰۰۰) جائز وناجائز پیدائشوں کے مقابلے میں پانچ لاکھ بچے مجرمانہ اسقاط الحمل (Criminal abortion.) سے ضائع کئے جاتے ہیں۔ برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن کی اس کمیٹی نے جو ان معاملات کی تفتیش کے لئے قائم کی گئی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں اپنی رپورٹ مرتب کی ہے جس میں یہ تسلیم کیا ہے کہ تمام جائز وناجائز پیدائشوں کی تعداد کے قریباً بیس فیصدی کے برابر تعداد کو مجرمانہ اسقاط الحمل سے برباد کر دیا جاتا ہے۔ ناروے وسویڈن کے صحت کے محکموں کی کمیٹیاں قریباً انہی نتائج پر پہنچی ہیں۔ ڈاکٹر اڈن نے سویڈن میں اس قسم کے معاملات پر تفتیش کر کے دریافت کیا کہ ۱۹۳۰ء میں سویڈن میں جائز وناجائز پیدائشیں ۹۲۲۰ تھیں اور اسقاط الحمل کی تعداد جو اکثر مجرمانہ تھا ۱۰۴۴۵ تھی۔ سویڈن کے ڈاکٹر ڈالبرگ کا خیال ہے کہ لوگ عام طور پر ناجائز اولاد کی ایک تہائی کو اسقاط الحمل کے ذریعے ضائع کر دیتے ہیں۔

غرض یورپ میں شادی ایک کامیاب ادارہ نہیں ہے اور اپنے مقاصد یعنی عورت اور

Carr Saunders: The world Population. ۵۱

مرد کو تمام عمر آپس میں وفادار رکھنے اور غیر شادی شدہ عورت کی عصمت کو محفوظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ بلکہ شادی کی تقدیس اور عصمت کی منافقت کو قائم رکھنے کے لئے لاکھوں بے گناہ بچے مجرمانہ اسقاط الحمل کے ذریعے ہر سال ضائع کر دیئے جاتے ہیں باوجود اس کے کہ آلات مانع الحمل بھی بکثرت مستعمل ہوتے ہیں۔ یورپ کی آبادی کے بتدریج تنزل کی ایک وجہ یہ جنسی حالات بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قومی آبادی کو گھٹتا ہوا دیکھ کر کئی یورپی سیاستدان شادی اور عصمت کے متعلق قومی رویہ کو روس کی طرح بالکل تبدیل کر دینے کے حق میں ہیں۔ باوجود مذہبی ہدایت اور سیاسی و قومی ضرورت کے یورپ میں پردے کے بغیر شادی کی تقدیس اور عصمت محفوظ نہیں جو حضرات پردہ کے مخالف ہیں ان کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ یورپ کے جنسی حالات کی علمی تفتیش کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ روایات کی یاد شاید ایک نسل کو نیک اور شریف رکھے۔ لیکن دوسری تیسری نسل میں یہی یورپی حالات ہماری معاشرت کا دائمی حصہ بن جائیں گے۔ اسلام کوئی جادو منتر نہیں ہے کہ بلا محکم یقین اور مناسب عمل کے اخلاقی بلندی کا ضامن رہے۔ جن ممالک نے موجودہ زمانے میں پردہ ترک کیا ہے ان کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ایران میں عورت سے پردہ کر سکنے کی آزادی قانوناً چھن چکی ہے۔ نتیجہ یہ کہ جو خرابیاں پہلے آبادی کے ایک حصے تک مخصوص تھیں اب عام اور قومی بن چکی ہیں۔

پردے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پردے کی صورت میں آزاد محبت کی اجازت نہیں ہوتی۔ مندرجہ بالا ناجائز اولاد اور مجرمانہ اسقاط الحمل کے اعداد و شمار اسی آزاد محبت کا نتیجہ ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ حالات پہلے سے زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ لیکن ناجائز اولاد کے ان اعداد و شمار سے جو سیرلڈ کاکس نے اپنی کتاب "پرابلم آف پاپولیشن" یعنی "مسئلہ آبادی" میں درج کئے ہیں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تعداد صرف انگلستان میں پچھلی صدی کے آخری نصف حصے میں تقریباً چھیالیس ہزار فی سال تھی یعنی تمام برطانیہ میں کوئی نوے ہزار ہوگی۔ اس بڑی تعداد کی کچھ وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس وقت عیسائی مذہب کی زبردست مخالفت کی وجہ سے طلاق کا اسلامی قانون انگلستان میں

ابھی نافذ نہیں ہوا تھا۔

مندرجہ بالا حالات سے ظاہر ہے کہ مغرب میں عورت پردہ کی پابندیوں سے آزاد ضرور ہے مگر خوش نہیں ہے۔ اس کو جنسی تعلقات میں وہ استقلال نصیب نہیں ہے جو مسلمان پردہ دار بیوی خاوند کے دل پر اعتبار جما کر حاصل کر لیتی ہے۔ مغربی معاشرت میں پردہ نہ رائج ہونے کی وجہ سے عورت سوسائٹی میں نمائش کی غرض سے انتخاب کی جاتی ہے۔ حسنِ اخلاق و سیرت ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز شادی کے بعد بھی بے پردہ سوسائٹی میں عورت کا مقابلہ عورت سے اور مرد کا مقابلہ مرد سے قائم رہتا ہے۔ ہر شکل و صورت کے مرد و عورت کو جو اطمینان اور خوشی کی زندگی بسر کرنے کے امکانات اسلامی معاشرت میں پردہ کی وجہ سے حاصل ہیں شاید کسی اور معاشرت میں میسر نہیں۔

یہ چنداں حیرت کی بات نہیں ہے کہ دنیا میں کسی قوم میں اتنی کامیاب شادیاں نہیں ہوتیں جتنی کہ مسلمانوں میں کیونکہ مسلمانوں کی پردہ دار معاشرت میں جنسی محبت اسلامی نکاح کے مقدس ماحول میں شروع ہوتی ہے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ بات محض جذباتی تعصب نہیں غالباً یہ بیان کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اخباری بیانات کے مطابق انگلستان میں ہر وقت پندرہ ہزار سے پچیس ہزار تک طلاق کے مقدمات عدالتوں میں معلق رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر مقدمات خاوند اور بیوی کی جنسی بے وفائی پر دائر کئے جاتے ہیں۔

جج لنڈسے کی کتاب "ریوولٹ آف ماڈرن یوتھ" یعنی "بغاوتِ شباب" کے مطابق ہر سال امریکہ میں اتنی ہی طلاقیں ہوتی ہیں جتنی شادیاں۔ اور یہ ان لاکھوں "علیحدگیوں" کے علاوہ ہیں جو قانونی صورت اختیار نہیں کرتیں۔ ظاہر ہے کہ آزاد عشقیہ شادیاں ازدواجی وفاداری، محبت اور استقلال کی ضامن نہیں بن سکتیں۔ جب حُسن یا جذبۂ عشق وفاداری کی بنیاد بن جائے تو حُسن کے تغیر یا جذبۂ عشق کے بدل جانے کے بعد وفاداری کی کوئی اور وجہ باقی نہیں رہتی۔ ہر انسان کا عشق کے قابل ہونا محض جذباتی گفتگو ہے اور دائمی عشق بہت نادر واقعہ ہے۔ خود ان شعراء

کی زندگیاں جنہوں نے مغربی ادب میں دائمی محبت کے گیتوں اور افسانوں کا اضافہ کیا ہے مختلف عورتوں سے بدعہدی اور دیگر جنسی جرائم کی تاریخیں ہیں۔

نیز بے پردہ معاشرت میں جہاں ایک سوسائٹی کے اندر ہر انسان ایک دوسرے کو دیکھ اور مل سکتا ہے یہ بالکل ناممکن کہ جس کے لئے ایک انسان کے دل میں جذبۂ محبت پیدا ہو وہ کسی دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو۔ ان حالات میں عشق محض جنسی بدنظمی کا جواز بن سکتا ہے۔ لہذا شادی کی بقا کے لئے احساسِ فرض اور عورت کی عفت لازم ترین شرائط ہیں اور یہ اسلامی نکاح اور پردے سے مقابلۃً کسی اور ذریعے کے بطرزِ احسن پوری ہو سکتی ہیں۔

حریفوں کا اعتراض ہے کہ مسلمان ضمیر پر اعتماد نہیں کرتے محض جبر پر اعتماد کرتے ہیں لیکن دنیا میں کوئی ملک نہیں جس میں قوانینِ تعزیرات اور دوسرے قوانین رائج نہ ہوں۔ مہذب ممالک میں ادنیٰ اشیا کی چوری کے معاملے میں قوانین، پارلیمنٹوں، عدالتوں، سپاہیوں، ہتھکڑیوں، قیدخانوں کی ضرورت محسوس کئے جانے سے صاف عیاں ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی محض ضمیر پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور انسانی ضمیر قانون و تعزیر کی امداد کا محتاج ہے۔ پردہ ضمیر کی امداد ہے۔ ضمیر کا بدل نہیں۔ جس طرح قتل کے خلاف قوانین کی موجودگی میں تمام قتل بالکل بند نہیں ہو جاتے۔ لیکن اس بہانے سے قتل کے خلاف تمام قوانین کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح پردہ کا مکمل سو فیصدی کامیاب نہ ہو سکنا اس کے منسوخ کر دینے کے حق میں دلیل نہیں ہے۔

بے پردہ معاشرت میں مخلوط جنسی تعلقات نہ صرف اخلاقی پہلو رکھتے ہیں بلکہ نسلِ انسانی کے لئے دیگر قبیح اثرات بھی پیدا کرتے ہیں۔ امریکہ کے ڈاکٹر بیکر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں آتشک زدہ لوگوں کی تعداد تین کروڑ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر ٹامس پاران کے مطابق اس میں سے صرف پچیس فیصدی مرض پیشہ ور عورتوں کی وجہ سے پھیلا ہوا ہے باقی پچھتر فیصدی مرض کی ذمہ وار نام نہاد شریف خواتین ہیں۔

"مین ہڈ اینڈ میرج" یعنی "شباب و شادی" (مصنفہ میک فیڈن امریکہ) میں تیس سال کی

عمر کے مردوں میں سے پچھتر اور نوے فیصدی کے درمیان تعداد اس مرض کا شکار بتائی گئی ہے
اسی مستند کتاب میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تمام امراض پوشیدہ کے مریضوں کی تعداد کل آبادی
کا نوے فیصدی درج ہے۔

ڈاکٹر ولیم سن کے مطابق انگلستان کی نصف آبادی اسی قسم کے امراضِ قبیحہ کا شکار
ہے۔ فرانس میں پانچ لاکھ بچے ایک سال کی عمر کے اندر اندر اس لئے ضائع ہو جاتے ہیں۔
کیونکہ ان کے والدین جنسی امراضِ قبیحہ کے مریض تھے" مائن کامف" میں ہر ہٹلر جرمن نسل
کی اس غارتگری کی طرف دردناک اشارات کرتا ہے جو بد اخلاقی اور امراضِ جنسی کے ہاتھوں
ہو رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ امریکہ اور یورپ کے مصنفین و مبلغین عام طور پر اپنے ممالک کے حالات
سے بخوبی واقف ہوتے ہیں جب مسلمانوں کو پردہ کے متعلق شرمسار کرنے کی کوشش کرتے ہیں
تو ان کا مقصد محض خدمت و دوستی نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمان اپنی روایتی اخلاقی پاکیزگی اور
جنسی صحت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے پردہ سے شرمانے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ
بے پردہ سوسائٹی کو پردہ کے محاسن سے آگاہ کرنا بہترین خدمتِ خلق ہے۔ فضول غیر علمی بحثوں
کی بجائے اصل حالات کے صحیح مطالعہ سے ہی ہم درست نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔ محض جذبات
تمام بحث میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کو اپنی حدّت سے
منور کر سکتے ہیں۔

چند حضرات نے ایک نئی اصطلاح "اسلامی پردہ" ایجاد کی ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ
اگر عورتیں ہاتھ اور منہ ننگا رکھیں تو اسے بھی "پردہ" تصور کر لینا چاہئے۔ جس آیت سے یہ جواز حاصل
کیا جاتا ہے اس میں محرم و نامحرم کی تخصیص نہیں ہے۔ یعنی محرموں کے سامنے بھی اس سے زیادہ
حصۂ جسم ننگا کرنا مناسب نہیں۔ یہ اشارہ اس پردہ پر نہیں ہے جو صرف نامحرموں سے واجب ہے
اور آنکھیں نیچے رکھنے کی تعمیل عورت پر پردہ کے اندر بھی واجب ہے۔ مناسب یہی ہے کہ

عورت جب نامحرم مرد سے دوچار ہو تو برقعہ کے اندر بھی آنکھیں نیچی کرلے۔ مگر کیونکہ اس مضمون میں اسلامی روایات کو صرف دلائلِ عقلی وعلمی پر ہی مبنی کیا ہے۔ اسلئے[1] اس جگہ یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ یہ نام نہاد "اسلامی پردہ" چنداں کارگر ثابت نہیں ہوا۔ یورپ کے اکثر ممالک میں سردی اسقدر رہے کہ تمام عورتیں سوائے چہرے کے باقی جسم کو ڈھانپے رہتی ہیں۔ لیکن متذکرہ بالا اخلاقی گلکاریاں اس قسم کے "اسلامی پردے" کے باوجود ظہور میں آتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ لفظ "پردہ" جب تک اپنی تعریف میں چہرہ اور تمام زینتوں کو چھپانا شامل نہ کرے اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور جہانتک مجھے علم ہے گو یہ امر بحث سے قریبی تعلق نہیں رکھتا۔ تمام اسلامی تاریخ میں حکماء وشرفاء وعوام پردہ میں چہرہ چھپانے کو شامل سمجھتے رہے ہیں۔ اگر جنگِ حدیبیہ میں مسلمان عورتوں نے بے پردہ ہوکر کفار کا مقابلہ کیا اور ان کو شکست دی تو یہ پردہ ترک کرنے کا جواز نہیں کیونکہ جنگ میں تو قتل کرنا بھی جائز ہوتا ہے۔

پردہ کے متعلق جو بحث اوپر گذر چکی ہے اس سے ظاہر ہے کہ سوال پردہ یا بے پردگی کا نہیں بلکہ پردہ یا زنا کا ہے۔ اور زنا قرآنِ کریم کے ممنوعات میں سے ہونے کے علاوہ انسانوں کو اخلاقی وجسمانی لعنتوں کا شکار بناتا ہے۔ اور نسلِ انسانی کا قاطع ہے۔ آبادی کے بڑھنے کے جو اعداد وشمار اکٹھے کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے پردہ نسلوں کی آبادی دن بدن کم ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کو اقتصادی تغیرات پیچیدہ بنادیتے ہیں پھر بھی عام طور پر یہ امر قابلِ ثبوت ہے۔

جو اعداد وشمار میں ذیل میں بیان کر رہا ہوں یہ کارسانڈرس کی کتاب "ولڈ پاپولیشن" یعنی "آبادیٔ دنیا" (مطبوعہ اوکسفورڈ) سے ماخوذ ہیں:-

[1] اس مسئلہ پر قرآن کریم وحدیثِ نبوی کے احکام کیلئے حضرت الحاج مولانا کریم بخش صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کی کتاب "کشف النقاب عن مسئلۃ الحجاب" جو اردو میں ہے مطالعہ فرمائیں فاضل مصنف سے مل سکتی ہے۔

ملک	۱۹۳۵ء میں موجودہ آبادی	آئندہ آبادی	کل فاضل کا اندازہ کر
برطانیہ	۴۰ ملین	۲۰۲۵ء میں صرف ۱۹ ملین رہ جائے گی	چارلس
سکاٹ لینڈ	۴ ملین	۲۰۳۵ء میں قریباً ایک ملین رہ جائے گی	چارلس
فرانس	۴۱ ملین	۱۹۷۵ء میں صرف ۳۰ ملین رہ جائے گی	سووے
جرمنی	۶۵ ملین	۲۰۰۰ء میں صرف ۴۶ ملین رہ جائے گی	کاہن امسبلورگ ڈارفر

اسی طرح دوسرے یورپی ممالک میں بھی جنسی آزادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آبادی کی ترقی میں کمی واقع ہورہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی ممالک کی آبادی ترقی پر ہے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد میں ایک کروڑ کا اضافہ ہوا ہے الجیریا میں مسلمان اس صدی کے شروع میں صرف تیس لاکھ تھے اب ساٹھ لاکھ ہیں۔ یہی حال دیگر اسلامی ممالک کا ہے۔ ترکی اور ایران میں بے پردگی ابھی بہت نیا واقعہ ہے۔ بے پردگی کے یورپی اثرات کے واضح ہونے کے لئے ایک صدی یا کم از کم تین نسلوں کا گذرنا ضروری ہے یہ سب ترقی باوجود اس امر کے ہے کہ مسلمان صنعتی ترقی میں بہت کم حصہ لے رہے ہیں۔ نیز اسلامی آبادی میں جو ترقی ہوئی ہے وہ ایسے انسانوں پر مشتمل ہے جو پردہ کی پابندیوں کو قبول کرنے کی وجہ سے جنسی صحت و اخلاق کے لحاظ سے باقی تمام اقوام عالم سے بہتر ہیں۔ اور یہی امر اسلامی آبادی کی آئندہ ترقی کا ضامن ہے۔ اگر مسلمان پردہ کے پابند رہے اور جنسی اخلاق میں سخت مضبوط رہے اور اس کے ساتھ صنعتی ترقی کی جانب متوجہ ہوگئے تو ممکن ہے کہ محض آبادی کی ترقی ہی ان کو دنیا کی قیصریتوں کا وارث بنادے۔

ایک اور غلط فہمی جو پردہ کے متعلق ظاہر کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ پردہ عورت کو مجلسی زندگی سے محروم کردیتا ہے۔ اس جگہ غالباً یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پردہ عورت کو مردوں سے ہوتا ہے نہ کہ عورتوں سے۔ دنیا کی نصف آبادی عورتوں کی ہے جس سے عورت کو پردہ نہیں ہوتا عورت اس نصف دنیا سے مجلسی و معاشرتی تعلقات بلا کسی رکاوٹ کے رکھ سکتی ہے۔ عورت کو

عورتوں سے تعلقات میں حسنِ اخلاق وسلیقہ کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی مردوں کو آپس کی ملاقات میں۔ رفاقتِ محبت اور خدمت کی خواہشات بھی عورتوں کی نصف دنیا میں پوری ہو سکتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی عورت نصف دنیا سے ملنے کی آزادی کو غلامی تصور کرے اور اس کی زندگی کا مجلسی پروگرام خاوند کے دوستوں اور ملاقاتیوں کے ساتھ اختلاط کے بغیر پورا نہ ہو سکے اور اگر کوئی عورت عورتوں کی نصف دنیا میں دوستی اور محبت پیدا کر سکنے پر قانع نہ ہو اور اپنی نسوانیت کو چند مردوں کی ملاقات و خوشنودی حاصل کئے بغیر ضائع ہوتا ہوا خیال کرے تو اس عورت کے مقاصد کو محض مجلسی سمجھنا اسکو اور اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔

پردہ کے مخالف حضرات پردہ کو چند غیر فطری عیوب کا باعث گردانتے ہیں ان حضرات سے غالباً یہ درخواست بیجا نہ ہوگی کہ محض قالینی منطق آرائی کی بجائے وہ یورپ کی معاشرت میں بھی ان عیوب کا مطالعہ کریں۔ پولیس کے کاغذات انھیں حیرت میں ڈال دینگے اور مناسب علمی تفتیش کے بعد بے پردہ معاشرت کے متعلق ان کا غلط حسنِ ظن باقی نہ رہیگا۔

بعض مخالفین کا خیال ہے کہ موجودہ پردہ اس لئے ناجائز ہے کیونکہ عرب میں اس قسم کے پردہ کا رواج نہ تھا۔ آج کل بھی ہمارے ان دیہات میں جہاں کی معاشرت اب تک قدیم عربی معاشرت کے مشابہ ہے پردہ عربی پردہ کی طرح ہے۔ لیکن شہروں میں آبادی۔ دولت۔ منظم بداخلاقی اور معاشرتی منافقت کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ ان حالات میں پردہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جس صورت میں کہ اس وقت شہروں میں موجود ہے یہ شہری پردہ عربی دیہاتی پردہ کی ہی ترقی یافتہ صورت ہے جسے شہروں کے اخلاقی حالات کے مطابق کسی قدر بدل گیا ہے اور یہ پردہ عربی اسلامی مدنی پردہ کی روایت ہے جس میں چنداں تغیر نہیں ہوا۔

تمام دنیا کے مسلمان یورپی اقوام کی سیاسی کامیابی سے اتنے مرعوب ہو چکے ہیں کہ وہ یہ سمجھے بغیر کہ ان کے لئے یورپ کی مسلمہ حقارت کی وجوہات علاوہ مذہبی اختلاف کے

سیاسی و تاریخی ہیں جن کا علاج صرف دنیوی[1] قوت کے عناصر کا حصول ہے۔ پردہ کو چھوڑنے اور یورپی تہذیب کے عناصرِ ظاہری کی تقلید سے یورپ کی نظروں میں یورپ سے برابری حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ہر تغیر ترقی نہیں ہوتا نہ ہر فرق نقص ہوتا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ ہم اپنی کامیاب طرزِ معاشرت کو اس لئے بدل دیں کہ یہ یورپی حکمرانوں کی ناکام طرزِ معاشرت کے مشابہ نہیں ہے۔ یہ زیادہ مناسب ہے کہ ہم یورپ کی بے پردہ معاشرت کے افسوسناک نتائج پر غور کریں اور ان کی درست جنسی حالت کو مسلمان عورتوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ ان پر چھوڑ دیں کہ وہ مسئلہ کے کون سے پہلو کو پسند کرتی ہیں۔

کئی حضرات جنسی پابندیوں کے خلاف یہ دلیل دیا کرتے ہیں کہ مغربی ماہرینِ نفسیات کے مطابق جنسی تسکین میں رکاوٹ "نیوروسس" یعنی امراضِ اعصابی پیدا کرتی ہے۔ اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ شادی اسی وجہ سے جائز کی گئی ہے بلکہ نصف الایمان ہے۔ اور پردہ اور شادی کا باہم ہونا ناممکن نہیں بلکہ پردہ شادی کو استقلال دینے کے علاوہ دوسری معاشرتی جسمانی و روحانی خوبیوں کو بھی ممکن بنا دیتا ہے۔ اس میں انکار نہیں ہو سکتا کہ پردہ شادی سے پہلے جنسی تسکین اور شادی کے بعد جنسی بدنظمی کے راستہ میں حائل ہے اور پردہ دار سوسائٹی میں ہر جگہ اور ہر موقع پر جنسی تسکین ناممکن ہے اور بے پردہ سوسائٹی میں جنسی تعلقات کے مواقع زیادہ آسانی سے اور زیادہ حاصل ہوتے ہیں اور ایسی سوسائٹی ان مغربی ماہرینِ نفسیات کے مطابق زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے لیکن وہ جسمانی لعنتیں معاشرتی الم اور قباحتیں جو اس قسم کی جنسی بدنظمی سے رونپذیر ہوتی ہیں پردہ کے حق میں کافی دلیل ہیں۔ تمام یورپی ادب کے اکثر المیہ رومانک اور افسانے صرف ایک بے پردہ سوسائٹی میں واقع ہو سکتے ہیں۔ اگر ادب آئینۂ حیات ہے تو یورپ کی جنسی زندگی ایک دردناک المیہ (ٹریجیڈی) ہے جس میں خوشگوار تبدیلی صرف پردہ کے قبول کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔

---

[1] مقالہ اول۔

علاوہ ازیں جنسی تعلقات میں رکاوٹ پیدا ہونے سے جذباتی اضطراب زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں ظاہر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تمام ادبی و فنی و علمی کشمکش و ترقی کے پیچھے وہ جذباتی اضطراب ہے جو جنسی ضبط نے زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف منعطف کردیا۔ مکمل جنسی تسکین کی صورت انسان کی تمدنی قوتیں امکانی حالت میں رہتی ہیں۔ جنسی خواہشات کی قربانیاں تمدن کی تعمیر کی بنیاد ہیں۔ اگر کوئی تہذیب جنسی خواہشات کو پورا کرنے کی طرف مائل ہوجاتی ہے تو وہ تہذیب ان قوتوں کو آہستہ آہستہ ضائع کردیتی ہے جو تمدن کی بنیاد ہیں اور وہ تہذیب تنزل کی جانب مائل ہوجاتی ہے۔ لیکن مکمل جنسی رکاوٹ اگر انسانی تہذیب کے لئے اعلیٰ ترین حالات پیدا کرسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ناممکن العمل ہوگی اور قاطع نسلِ انسانی بھی ہوگی اور انسانوں کے بغیر تمدن کوئی معنی نہیں رکھتا۔

تاریخِ انسانی میں جہاں کہیں کوئی قوم ترقی کی راہ پر گامزن نظر آتی ہے وہ قوم اسوقت جنسی پابندیاں وضع کررہی ہوتی ہے۔ سمیری، بابلی، یونانی، رومی اقوام نے اپنی تاریخ کے آغاز میں ایک مرد اور ایک عورت کی مستقل شادی کے قوانین جاری کئے۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ جہاں کبھی شادی اور وفاداری کا خیال غالب ہوا ہے عورت اور مرد کی برابری کے نظریے کو صدمہ پہنچا ہے اور عورتوں کے عصمت میں فخر کرنے سے انھیں وہ معاشرتی پابندیاں قبول کرنی پڑی ہیں جو ان کے عصمت پسند خاوندوں نے ان پر عائد کی ہیں۔ ان حالات میں قوموں کی ترقی شروع ہوتی ہے۔ لیکن بڑھتی ہوئی سلطنت اور امارت ہر قوم کے لئے پہلی جنسی پابندیاں ناقابلِ برداشت بنادیتی ہیں۔ اور ان پابندیوں کو چھوڑنے کا دور ہمیشہ قومی وقار کے انحطاط کے دور کا ہمعصر ہوتا ہے اگرچہ علمی تفتیش سیاسی حالات و عناصرِ قوت کے حصول کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتی۔

جنسی وفاداری اور تنظیم کی تعلیم جو آنحضرتؐ نے عربوں کو دی ان فتوحات سے غیر متعلق نہ تھی جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں اسلام کو ہوئیں۔ اسلامی نکاح اور جنسی پابندیوں

میں جو نسلیں پیدا ہوئیں اور تربیت پاتی رہیں وہ اطرافِ عالم میں فاتحانہ پھیل گئیں۔ انھوں نے عظیم الشان سلطنتیں اور دنیا کی متمول ترین تہذیب کو پیدا کیا۔ شجاعت و جرارت میں اسلامی عساکر اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔

ایک ہزار سال تک مسلمان دنیا کی تاریخ کے مالک رہے ہیں۔ باوجود محکومی و ادبا کے یورپ کے مصنفین آجکل بھی مسلمانوں کے بہادر ہونے اور موت سے خائف نہ ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ شہدا کے یقینی موت کے متبسم مقابلہ کے پیچھے وہ جنسی پابندیاں ہوتی ہیں جو نکاح کی تقدیس اور پردہ کی وجہ سے اسلامی معاشرت میں رائج ہیں۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر ایک قوم پردہ کو قائم رکھے اور "عناصرِ قوت" پر قابو رکھے تو وہ دائمی طور پر اپنی تہذیب و سیاست کے وقار کو قائم رکھ سکے گی۔ یہ درست ہے کہ آج عناصرِ قوت پر ہمارا قابو نہیں ہے لیکن موجودہ حالات کی درست تشریح کے بعد جب ہم اصلی عناصرِ قوت کے حصول کی جانب توجہ مبذول کریں گے تو مستقبل اتنا تاریک معلوم نہ ہوگا جتنا کہ آج نظر آرہا ہے۔ بشرطیکہ درمیانی وقفہ میں ہم جنسی پابندیوں کو کمزور نہ کردیں۔ اور ان توائے تہذیب و حیات کو زندہ رکھیں جو صرف منظم جنسی رکاوٹ کی حالت میں ظاہر ہوسکتے ہیں۔ ان حالات میں نکاح کی تقدیس کو قائم رکھنا اشد ضروری ہے اور جیسا کہ اوپر کے اعداد و شمار دلائل و براہین سے واضح ہے پردہ کی ترویج ایسی معاشرت پیدا کردیتی ہے جس میں جنسی وفاداری نسلِ انسانی کا بقا اور جنسی رکاوٹ سب خوبیاں حاصل ہوسکتی ہیں اور ہم افراط و تفریط کے نقائص سے مصئون رہتے ہیں۔

پردہ کی حمایت سے یہ مراد نہیں کہ ہم عورتوں کی فلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ پردہ میں عورتوں کی فلاح سہی لیکن ہمارے فرائض عورتوں کی جانب محض پردہ سے زیادہ وسیع ہیں سب عورتوں کے لئے بہتر تعلیم اور تحفظِ صحت کے سامان اور ضرورتمند خواتین کے لئے پردہ کے ساتھ ساتھ کام کاج کے مواقع بہم پہنچانا قومی فرض سمجھنا چاہئے۔

بعض حضرات نے دماغی عدم توازن کی وجہ سے پردے کو جہالت کا دوسرا نام سمجھ لیا ہے۔ پردہ چھوڑنا کوئی طلسم نہیں ہے جسے عمل میں لانے سے عورت فوراً عالم فاضل بن جاتی ہے۔ ہماری عورتیں اس لئے تعلیم یافتہ نہیں ہیں کیونکہ ہم نے پردے کے اندر ان کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کیا۔

یورپ اور روس میں بھی چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کے سکول علیحدہ بننا شروع ہو گئے ہیں کیونکہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ نہایت چھوٹی عمر میں لڑکے اور لڑکیاں جنسی تعلقات پیدا کر سکتے ہیں۔

میری سٹوپس ("سیکس اینڈ دی ینگ" یعنی "جنس وطفولیت") اور دیگر مصنفین کے مشاہدوں سے واضح ہے کہ چھ اور دس سال کے درمیان کی عمر میں بھی لڑکیاں جنسی تجربہ رکھتی ہیں اور جنسی امراضِ قبیحہ میں مبتلا پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر ایڈتھ ہکر ("لاز آف سیکس" یعنی "قوانینِ جنسیت") بیان کرتی ہیں کہ "مہذب اور امیر گھرانوں کے سات آٹھ سال کے بچوں کے لئے بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ وہ اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ ہمجولیوں کے سامنے جنسی تعلقات قائم کریں۔" وہ آگے بیان کرتی ہیں کہ امریکہ کے شہر بالٹیمورٹی میں صرف ایک سال کے اندر بارہ سال سے کم عمر کی ایک ہزار سے زیادہ لڑکیاں عدالتوں میں جنسی مظلومیت کے مقدمات کے متعلق پیش ہوئیں۔

ظاہر ہے کہ مخلوط سوسائٹی مجبور سوسائٹی ہے۔ بچوں کی حفاظت چھوٹی عمر سے ہی کرنی چاہئے تاکہ ہماری نسلیں ہمیشہ ہمیشہ تک روحانی ودماغی ہیجان سے مضطرب رہیں اور ہماری تہذیب ووقار کو قائم رکھیں اور ہم ان قبائح سے محفوظ رہیں جن سے نسلی کمزوری جسمانی بیماری خاندانی غم اور معاشرتی ذلت ومنافقت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ پردہ کی تکالیف کو بے پردہ سوسائٹی کی المناک حالت کے مقابلہ میں رکھکر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے کہ اس غیر تسلی بخش دنیا میں کونسی تکلیف زیادہ قابلِ قبول ہے۔

ہمیں چاہئے کہ لڑکیوں کے لئے علیحدہ مدرسوں طبی و صنعتی کالجوں کی توسیع میں پوری کوشش کریں اور پردہ کے اندر اعلیٰ اور پاکیزہ تعلیم کا بندوبست کریں۔ مشین کے استعمال سے مزدوروں کی بچت ہوتی ہے اس لئے تمام صنعتی ممالک میں لاکھوں مزدور بیکار رہتے ہیں۔ لہٰذا مناسب ہے کہ عورتوں کو مردوں کے برابر مزدور سمجھکر ہم بیکار اور غریب مزدوروں کی تعداد میں اضافہ نہ کریں بلکہ خاندانی زندگی کے قیام کی کوشش کریں۔

جو قوم اپنی عورتوں کو اعلیٰ مائیں اور بیویاں بنانے کی بجائے آزادی اور برابری کے الفاظ سے دھوکا کھا کر انھیں دوسرے درجہ کی نوکر یا کلرک بنا دیتی ہے وہ قوم بہت دیر تک اپنی تہذیب و سیاست کے وقار اور اپنی آبادی کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ جرمنی اور جاپان کے سیاستدانوں نے انہی حالات سے آگاہ ہو کر عورتوں کے لئے کارخانوں اور دیگر قسم کے کاموں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ہمارے لئے بھی مناسب یہی ہے کہ برابری و آزادی کے الفاظ کی سطحی جھلک سے خیرہ ہو کر اپنی قوم کو مصیبت اور گمراہی کی جانب نہ لے جائیں۔

شہروں میں پردہ دار عورتوں کے لئے معمولی صنعتوں مثلاً جراب سازی، بنیان سازی، صابون سازی وغیرہ کے کارخانے ہونے چاہئیں۔ اور عورتوں کے لئے خانہ داری اور صنعتی تعلیم کے لئے پردہ دار مدرسے ہونے چاہئیں۔ عورتوں کی صحت کے لئے مناسب کھلے مکان اور پردہ دار باغ نہایت ضروری ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ میونسپل کمیٹیاں اپنی آبادی کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے پردہ دار باغ نہ بنا سکیں یا موجودہ باغوں کو پردہ دار بنا کر ہفتہ میں چند دن عورتوں کے لئے مخصوص نہ کر سکیں۔ ہر محلہ میں جہاں مسجدیں دو یا دو سے زیادہ ہوں ایک مسجد کو عورتوں کے لئے مخصوص کر دینا چاہئے تاکہ محلے کی عورتیں وہاں جمع ہو سکیں وہاں نماز بھی ادا کریں اور آپس میں جان پہچان میل جول سے معاشرتی تعلقات بھی بڑھائیں۔

نیز ہمیں اپنے دیہات اور شہروں میں پردہ کو زیادہ مانوس بنانے کی کوشش کرنی

چاہیے۔ فرضی حقارت یا انگشت نمائی کے خیال سے پردہ دار عورتوں کے ہمراہ بازاروں میں نکلنے سے شرمانا نہیں چاہیے، تاکہ ہمیشہ گاڑی یکے کی ضرورت کی وجہ سے پردہ ایک گراں تکلف نہ بن جائے۔ پردہ دار جلسے جہاں عورتیں مل کر اظہارِ رائے کر سکیں ضرور منعقد ہونے چاہئیں تاکہ عورتوں کی رائے بھی ہمارے مشوروں میں شامل ہوسکے۔

غرض اس طرح ناممکن نہیں کہ ہم اپنی موجودہ زندگی کی اخلاقی بلندی کو قائم رکھتے ہوئے عورتوں کو دوسری اقوام کی عورتوں سے کسی لحاظ سے پیچھے نہ پائیں اور ہماری عورتیں باقی دنیا کی عورتوں کے سامنے بہترین شہریت اور اخلاقی بلندی کے نمونے مہیا کرسکیں۔

ادبیات

اشارات

از جناب احسان دانش

جو فطرتاً مآلِ آرزو سے رو کشی نہیں
مآل پر بھی اک نگاہِ سرسری بری نہیں

قدم قدم پہ جو صعوبتوں سے کانپتی رہے
جلالِ مرگ کی قسم وہ غم ہے زندگی نہیں

زمیں پہ تا بکے، فلک کی سمت باگ موڑ دے!
وہاں کا عزم چاہیے جہاں سے آگہی نہیں!

تو اپنے راستے میں خود ہی سنگِ راہ بن گیا
دگرنہ تیری ذات سے کسی کو دشمنی نہیں!

ہجومِ جرم و زرے اور سکونِ دل کا واسطہ
ہزار تو کہے کہ ہے! نہیں نہیں، کبھی نہیں!

تغیراتِ نو بنو کے ساتھ اہلِ ہند میں
زباں کی زندگی تو ہے عمل کی زندگی نہیں

اثر یہ درسِ مکتبی کا ہے کہ اب کے دور میں
نظر میں وسعتیں نہیں، دلوں میں روشنی نہیں

جنونِ تیز گام کو نہ فرصتِ نگاہ دے!
رہِ حیات کا سفر، سفر ہے دل لگی نہیں!

بھلا ہوا کہ اٹھ گئے جگہ جگہ سے میکدے
کہ مے کشوں میں آجکل شعورِ مے کشی نہیں،

حیات میں نہ دخل دے نشاطِ بے ثبات کو
حیاتِ جاوداں سہی، نشاطِ دائمی نہیں!

وفورِ درد و رنج میں، بجز خدائے ذوالمنن
مری غیور مفلسی کسی سے ملتجی نہیں

بازگشت

جناب منیر چغتائی

ریڈیو پر ایک الحاد پرور نظم سے متاثر ہو کر

آستانِ راستی پر کل جھکے گا تیرا سر
آج اگر تو دشمنِ اخلاق و ایماں ہے تو کیا

جادۂ عرفاں پہ کل ہونا ہے تجھکو گامزن
آج اگر راہِ حقایق سے گریزاں ہے تو کیا

کل زمانہ تیری آنکھوں سے اٹھادیگا حجاب
بے خودی میں آج اگر تو نامسلماں ہے تو کیا

صبحِ نَو کے ہاتھ میں ہے کارواں تاج و تخت
آج یوسف مصر میں پابندِ زنداں ہے تو کیا

خون رلواتا ہے آخر ہر تعیش کا مآل
میکدہ میں آج اگر جشنِ چراغاں ہے تو کیا

طوطی و قمری کا مسکن ہے حقیقت میں چمن
آج صحنِ باغ میں کرگس پرافشاں ہے تو کیا

گوشہ گوشہ بننے والا ہے یہاں دارالسجود
نغمۂ انکار عالم میں پرافشاں ہے تو کیا

پھولنے پھلنے کو ہے کل نخلِ ایثار و وفا
اب سرِ پرشوق خاک و خوں میں غلطاں ہے تو کیا

آئیگا حق و صداقت کا زمانہ آئے گا
آج تاراجِ خزاں دورِ بہاراں ہے تو کیا

کل چمکنے کو ہے اِک خورشیدِ عالمتاب تو
آج دنیا کی فضا ظلمت بداماں ہے تو کیا

مہدیٔ موعود کا نزدیک ہے وقتِ ورود
خندہ زن ابلیس عالم میں خراماں ہے تو کیا

تبصرہ

ہمارا زوال اور اس کے اسباب (انگریزی) (Our Decline and its Causes)

ازامیر شکیب ارسلان۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۲۵ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت مجلد عہر

پتہ:۔ شیخ محمد اشرف صاحب تاجر کتب کشمیری بازار لاہور۔

امیر شکیب ارسلان عالم اسلام کے مشہور مجاہد اور صاحب قلم بھی ہیں۔ چند سال ہوئے شیخ محمد بسیونی ایک عالم نے موصوف سے مصر کے مشہور علمی و دینی رسالہ "المنار" کے ذریعہ ایک خط میں مسلمانوں کے موجودہ انحطاط اور ان کے بالمقابل اقوام یورپ کی ترقی اور ان کے اسباب سے متعلق دو سوال کئے تھے۔ جن کا جواب فاضل امیر نے "مسلمان کیوں پیچھے ہیں" (لماذا تأخر المسلمون) کے زیر عنوان المنار میں ہی لکھا تھا۔ اصل مضمون عربی میں تھا مگر بعد میں اس کے متعدد زبانوں میں تراجم ہوئے زیر تبصرہ کتاب اسی مضمون کا انگریزی مگر نہایت کامیاب اور آزاد ترجمہ ہے جو ایم اے شکور صاحب ایم، اے (علیگ) رکن ادارہ ڈان نے کیا ہے۔

امیر البیان والقلم نے مسلمانوں کی عام حالت امروز کا خاکہ کھینچنے کے بعد پہلے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی ترقی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور پھر موجودہ اقوام یورپ کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے موجودہ انحطاط کے اسباب بتائے ہیں۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ لکیر کے فقیر ہیں اور اپنے مزعومات سے ایک انچ ادھر ادھر ہونا پسند نہیں کرتے ان میں خالص اسلامی نقطۂ نظر سے کیا خامیاں ہیں اور وہ کس طرح اپنے جمود و خمود سے دشمنان اسلام کے ہاتھوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ آخر میں ان ناقدین کو جواب دیا ہے جو اسلام کو بذات خود ایک مکمل دستور تسلیم نہیں کرتے۔ امیر شکیب ارسلان کا طرز بیان اگرچہ خطیبانہ ہے چنانچہ بعض علمی حقائق اس میں تشنہ بھی رہ گئے ہیں۔ تاہم مجموعی اعتبار سے یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان اس کو پڑھے اور اس سے عبرت پذیر ہو۔